Yaqoob Yawar Hayat aur Fann

A thesis submitted to the University of Hyderabad in partial fulfillment of the requirement for the award of the degree of

DOCTOR OF PHILOSOPHY

in

Urdu

Submitted by

ATIULLAH

Reg. No. 15HUPH06

Supervisor

Dr. A. R. Manzar

Associate Professor

Department of Urdu
School of Humanities
University of Hyderabad
Hyderabad-500046
Telangana, India

June-2022

प्रतिष्ठित संस्थान
INSTITUTION OF EMINENCE

یعقوب یاور حیات اور فن

مقالہ برائے پی ایچ ۔ڈی

جون، 2022

مقالہ نگار

اطیع اللہ

Reg No. 15HUPH06

نگراں

ڈاکٹر اے۔آر منظر

اسوسی ایٹ پروفیسر

شعبۂ اُردو
اسکول آف ہیومانیٹیز
یونیورسٹی آف حیدرآباد
حیدرآباد 500046
تلنگانہ، انڈیا

University of Hyderabad
(A Central University by an Act of the Parliament)
Department of Urdu School of Humanities

DECLARATION

I, **ATIULLAH,** hereby declare that the research embodied in the present thesis entitled **"Yaqoob Yawar Hayat aur Fann"** submitted by me under the supervision of **Dr. A.R. Manzar** is a bonafide research work for the award of **Doctor of Philosophy** in **Urdu** from the **University of Hyderabad**. I also declare to the best of my knowledge that it has not been submitted in part or full to this or any other university or institution for the award of any degree or diploma. I hereby declare that my thesis can be deposited in Shodganga/ INFLIBNET.

Date: ....

Name: **ATIULLAH**

Signature of the Student

Reg. No.15HUPH06

University of Hyderabad

(A Central University by an Act of the Parliament)

Department of Urdu School of Humanities

प्रतिष्ठित संस्थान
INSTITUTION OF EMINENCE

CERTIFICATE

This is to certify that the thesis entitled **"Yaqoob Yawar Hayat aur Fann "** submitted by **ATIULLAH** bearing Enrolment Number **15HUPH06** in partial fulfillment of the requirements for award of **Doctor of Philosophy** in the School of Humanities, Department of Urdu is bonafide work carried out by him under my supervision and guidance. The thesis is free from plagiarism and has not been submitted previously in part or full to this or any other university or institution for award of any degree or diploma.

Papers related to this thesis have been:

A. Published in the following publications.

1. "Prof. Yaqoob Yawar Ki Ilmi-O-Adabi Khidmat", Irteqa, Volume: 06, Issue: 03, Pages:49-54, July to September -2021, (ISSN: 2456-0340)
2. "Yaqoob Yawar ki Shayri ka Tajziya-o-Tafheem", Aks-e-Adab, Volume: 10, Issue: 34, Pages:40-41, Quarterly, January to March-2021, (ISSN: 2320-6519)

B.Presented at the following Conferences.

1. Three- day International Seminar on, "Novel Dilmun Men Tanisi Pahlu" 27-29 March 2018, at Dept. Of Urdu, Banaras Hindu University Varanasi, U.P.India.
2. Two- day National Seminar on "Yaqoob Yawar Ke Novelon Ka Usloobiyati Mutaala" on 14^{th}, 15^{th}, March 2022, at University of Madras, Department of Arabic Persian and Urdu.

Further, the student was exempted from doing coursework (recommended by Doctoral Committee) on the basis of the following courses passed during his M.Phil. Programme and the M.Phil. Degree was awarded.

S.No.	Course Code	Course Title	Credits	Result
01	HU701	Research Methodology	5.00	Pass (B+)
02	HU702	Practical Criticism	5.00	Pass (A+)
03	HU721	Textual Criticism	5.00	Pass (A+)
04	UR780	Dissertation	15.00	Pass (A)

Supervisor **Head of the Department** **Dean School of Humanities**

Book Series No. : 23

UGC سے منظور شدہ موقر جریدہ

سہ ماہی

ارتقا

بنارس

جولائی تا ستمبر

۲۰۲۱ء

به یادگار: ڈاکٹر سلمان راغب

UGC سے منظور شدہ موقر جریدہ

سہ ماہی ارتقا بنارس

ادبی وتہذیبی جریدہ

مدیر : شاد عباسی
طابع وناشر : شاہ نواز

مجلس ادارت :

پروفیسر ظفر احمد صدیقی، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی، صدر شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی
شمیم طارق، ممبئی، منفرد شاعر معزز صحافی
ڈاکٹر شہریار، مدیر (اردو)، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی
ڈاکٹر ثوبان سعید، شعبۂ اردو، خواجہ معین الدین چشتی اردو فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ

مجلس مشاورت :

تاج الدین اشعر رام نگری، سابق مدیر روزنامہ قومی مورچہ، بنارس
پروفیسر نسیم احمد، سابق صدر شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی
ڈاکٹر حسن عباس، ڈائریکٹر رضا لائبریری، رام پور
ڈاکٹر اے آر منظر، پروفیسر حیدر آباد، سینٹرل یونیورسٹی

سرپرست :

الحاج سعید الرحمٰن صاحب، تاج اسٹیٹ، وارانسی
الحاج رشید احمد صاحب، ڈائریکٹر روز وُڈ اکیڈمی، وارانسی
الحاج ابوسعید صاحب سرپرست مدرسہ تعلیم القرآن، گوہاٹی، آسام
الحاج احمد بابو صاحب، ڈائریکٹر احد انٹر نیشنل اکیڈمی، وارانسی

● جلد : ۶ شمارہ : ۳
● جولائی تا ستمبر ۲۰۲۱ء

ISSN : 2456-0340
Title No. 1285609

سالانہ : 180.00
لائبریری کے لئے سالانہ چندہ 300.00
ڈاک خرچ اس کے علاوہ

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ :

ایڈیٹر سہ ماہی ارتقا مالتی باغ، پانڈے حویلی، وارانسی
0542-2455161, 9336928764, 9264929530
E-mail: irteqa16@gmail.com

منی آرڈر فارم پر اپنا نام، خریداری نمبر اور پتہ انگریزی میں صاف صاف اور پن کوڈ کے ساتھ لکھیں۔

مضمون نگار کی رائے سے ادارے کا اتفاق ضروری نہیں۔
کسی بھی قسم کی چارہ جوئی صرف بنارس کی عدالت میں کی جاسکتی ہے۔

فہرست

اپنی بات — شاد عباسی 3

اکیسویں صدی میں بنگال میں اردو افسانہ — عبدالحلیم انصاری (محمد حلیم) 5

ڈاکٹر منصور خوشتر کی تخلیق ''ادب کے ستارہ گر''، ایک مطالعہ — ڈاکٹر احسان عالم 21

یادوں کے نقوش — نذیر بنارسی 31

غزل — مجروح سلطان پوری 43

مغرب کا بے مثال افسانہ نگار، شاعر ایڈگر ایلن پو: ایک تعارف — فیضان سعید 44

پروفیسر یعقوب یاور کی علمی و ادبی خدمات — اطیع اللہ 49

اتر پردیش اردو اکادمی کی پچاس سالہ خدمات — مریم جمیلہ 55

غزل — شازیہ نیازی 73

پیچ و تاب، انشائیہ — ابو طالب 74

خبریں 79

پروفیسر یعقوب یاور کی علمی وادبی خدمات

اطیع اللہ

یعقوب یاور اردو ادب میں ایک قابل قدر نام ہے انھوں نے اردو کے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اوران میں یہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت میں یاور صاحب کی بیش بہا خدمات ہیں۔اردو کے فروغ میں درس وتدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف میں لگے ہیں۔یہ اردو کے دانشور بہترین ناول نگار،اچھے شاعر ،محقق،مترجم،صحافی،مرتب،اور ایک اچھے استاد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

یعقوب یاور متنوع شخصیت کے مالک ہیں ترجمہ نگاری کے فن پر آپ کو مکمل عبور حاصل ہے۔تخلیقی نثر لکھنے اور شعر موزوں کرنے پر کامل دسترس رکھتے ہیں۔انھوں نے مختلف موضوعات پر لکھا ہے اور اچھا لکھا ہے۔نظم ونثر دونوں اصناف میں ان کی تخلیقات وتصانیف سے ان کی علمی وادبی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔یہ اردو کے ان چند فنکاروں میں سے ایک ہیں جن کے یہاں متنوع موضوعات ملتے ہیں۔وہ ملک اور بیرون ملک میں اردو ادب کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔

یعقوب یاور کا تعلق اتر پردیش کے ضلع فتح پور کے قصبہ کوٹ سے ہے۔ان کے والد کا نام مطلوب علی خان تھا۔والدہ کا نام غوثیہ خانم تھا۔یعقوب یاور کی ولادت ۲۲ نومبر ۱۹۵۲ء میں ہوئی۔سرکاری رکارڈ کے مطابق ۱۶/اکتوبر ۱۹۵۲ء ہے۔

یعقوب یاور کی ابتدائی تعلیم وتربیت والدین کی نگرانی میں گھر ہی پر ہوئی۔انھوں نے کم عمری ہی میں عربی اور اردو کی چھوٹی چھوٹی کتابوں کو پڑھ لیا تھا۔ان کے گھر کا ماحول دینی تھا اس وجہ سے ان کی رغبت بھی دینی کتابوں کی طرف ہوگئی۔مکتب کی تعلیم انھوں نے اپنے گاؤں ہی سے

حاصل کی۔ہائی اسکول چھودھری شیوسہائے انٹر کالج فتح پور یوپی بورڈ سے کیا۔انٹر کی تعلیم مدھیہ پردیش بھوپال کے مراسلاتی کورس سے کیا۔بی اے،ایم اے،اور پی ایچ ڈی سیفیہ کالج بھوپال سے کیا۔جوآج برکت اللہ یونی ورسٹی کہلاتی ہے۔آپ کے اساتذہ میں پروفیسرعبدالقوی دسنوی ،عباس رضوی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔سن ۱۹۷۴ء میں بی اے کیا اور ۱۹۷۶ میں ایم اے کرنے کے بعد ۱۹۹۰ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

یعقوب یاؔور کی ابتدائی زندگی میں بہت ہی پیچ وخم تھے۔ہائی اسکول کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد گھر کی معاشی اور تنگ دستی کو دیکھتے ہوئے تعلیم کو ترک کر کے کمانے کے لیے گاؤں سے شہر کی طرف نکل پڑے۔اور مختلف شہروں میں ذریعۂ معاش کے لیے گھومتے پھرتے رہے۔پھر آندھرا پردیش حیدرآباد میں دوسال تک آنولا کے تیل کے کمپنی میں رہے۔جس میں وہ بوتل پر لیبل لگانے کا کام کرتے تھے۔ماہانہ اسی (۸۰) روپئے تنخواہ تھی جوانھیں بہت کم لگی اس لیے چھوڑ کر بھوپال کی طرف روانہ ہوگئے۔بھوپال میں انھوں نے کئی ملازمتیں کیں۔ بسنت کالج برائے خواتین (BHU) راج گھاٹ فورٹ میں ۱۹۹۰ سے ۲۰۰۸ تک تدریسی فرائض انجام دئے۔پھر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونی ورسٹی میں ایسوسیٹ پروفیسر کی حیثیت سے منسلک ہوئے۔اور پھر پروفیسر ہوئے۔صدر شعبہ بھی رہے۔۲۰۱۷ میں سبک دوش ہوئے۔

ان کے ادبی سفر کا آغاز دوران طالب علمی میں ہی ہوگیا تھا۔آپ کی پہلی غزل ماہنامہ تعمیر ہریانہ میں شائع ہوئی تھی۔آپ کا پہلا ترجمہ ''سدھارتھ'' ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔پہلا شعری مجموعہ الف ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا اور پہلا ناول ''دل من'' ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا۔ابھی تک یعقوب یاؔور کے تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری ہے۔ان کے ناول فکشن کی دنیا میں کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ناول ''دل من'' اور ''دھول دیپ'' سندھو گھاٹی کی تہذیب وثقافت پر منحصر ہے۔''عزازیل'' ابلیس کی سوانح پر ہے۔جوایک دلچسپ ناول ہے۔''جہاد'' اور ''سنگ گراں ہے زندگی'' گجرات کے فساد پر لکھے گئے ہیں۔یہ چاروں ناول اردو ناول نگاری میں انفرادیت کے متحمل ہیں۔ناول ''دل من'' کے بارے میں یوسف ناظم لکھتے ہیں۔

''باوجوداس کے کہ دل من کی زبان ہندی اور سنسکرت آمیز ہے،اس کے پڑھنے میں مجھے وہی مزا آیا جو راہی معصوم رضا کے مشہور و معروف سیریل'مہابھارت' دیکھنے میں آیا تھا۔اس سیریل کا شاید ہی کوئی اپی سوڈ مجھ سے چھوٹا ہو۔اس کتاب کا بھی کوئی صفحہ میری زد سے بچا نہیں ہے۔دل من تمدن سندھ کے پس منظر کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔یہ گرے کی 'ایلیجی' نہیں ہے نہ داستان امیر حمزہ ہے،لیکن اس میں رزم و بزم کی ہر وہ حکایت ہے جو قاری سے اصرار کرتی ہے،آگے پڑھو اور آگے پڑھو۔''

شاعری میں بھی یعقوب یاور نے ایک مقام بنایا ہے۔ان کی شاعری جدید دور کی مشینی ٹکنالوجی اور دیگر آلات ہونے کی وجہ سے جو آدمی آدمی میں دوری ہوئی ہے اس پر طنز ہے۔اور آج کی کسب مال میں رفتاری کی تیزی کی وجہ سے جو واقعات و حادثات رہے ہیں ان کی روداد بھی ہے۔یعقوب یاور اپنی ذاتی زندگی میں ایک سلیقہ شعار اور معیار پسند انسان ہیں اور یہی سلیقہ شعاری اور معیار پسندی ان کی تخلیقات میں پیوست ہے۔اور یہ چیز ان کی شاعری میں بھی موجود ہے۔پروفیسر عنوان چشتی لکھتے ہیں۔

''یعقوب یاور ان محتاط اور مخلص شاعروں میں شامل ہیں جنھوں نے غزل کی فنی اور جمالیاتی قدروں کا احترام کرتے ہوئے اپنی تخلیقی طاقت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ان کی شاعری میں ان کے سائے اور ہم سائے پوری طرح جلوہ گر ہیں۔میری مراد ان کی ذات اور کائنات سے ہے۔''

نئے زمانے کی ترقی سے جو نقصانات سماج میں آئے ہیں اور اس چمک دمک سے رشتوں کی جو پاسداری ختم ہوئی ہے اس کو یعقوب یاور نے شاعرانہ انداز میں رمز و ایما کے ساتھ اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔

قدم خلد پہ رکھ کے کامیابیوں میں کھو گیا
یہ ارتقاء نہ جانے کتنی دستیاں بھگو گیا

اس طرح سے یعقوب یاور نظم ونثر میں اپنی پہچان بنائے ہیں۔انھوں نے تقریباً چار درجن کتابیں لکھی ہیں۔جو اردو ادب کی بہترین سرمایہ ہے۔مندرجہ ذیل سطور میں یعقوب یاور کی ادبی سرمائے کو رقم کیا جارہا ہے۔

تحقیق وتنقید

۱۔امروز۔۱۹۹۰

۲۔ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری۔ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ۔1997

۳۔تحریک وتعبیر۔۱۹۹۹

۴۔تفکیر وتفہیم۔۲۰۰۳

۵۔مرغزار افکار جلد اول۔عرشیہ پبلیکیشنز نئی دہلی۔۲۰۱۱

۶۔افہام۔عرشیہ پبلیکیشنز نئی دہلی۔۲۰۱۵

۷۔آغا حشر کاشمیری۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی۔۲۰۱۶

۸۔احتساب۔سٹی بک پوائنٹ کراچی پاکستان۔۲۰۱۸

۹۔مرغزار افکار جلد دوم۔عرشیہ پبلیکیشنز دہلی

ترتیب

۱۰۔کلیات آغا حشر کاشمیری جلد اول۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی۔۲۰۰۴

۱۱۔کلیات آغا حشر کاشمیری جلد دوم۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی۔۲۰۰۴

۱۲۔کلیات آغا حشر کاشمیری جلد سوم۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی۔۲۰۰۴

۱۳۔کلیات آغا حشر کاشمیری جلد چہارم۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی۔۲۰۰۵

۱۴۔کلیات آغا حشر کاشمیری جلد پنجم۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی۔۲۰۰۵

۱۵۔کلیات آغا حشر کاشمیری جلد ششم۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی۔۲۰۰۵

۱۶۔کلیات آغا حشر کاشمیری جلد ہفتم۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی۔۲۰۰۵

۱۷۔کلیات آغا حشر کاشمیری جلد ہشتم۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی۔۲۰۱۶

۱۸۔مکتوبات مسرور مسلم۔عرشیہ پبلیکیشنز نئی دہلی۔۲۰۲۰

تخلیق(شاعری)

۱۹۔الف۔۱۹۸۸

۲۰۔قلم گوید۔۲۰۰۰

۲۱۔بارِزیاں۔۲۰۲۰

ناول

۲۲۔دِل من۔۱۹۹۸

۲۳۔عزازیل۔۲۰۰۱

۲۴۔جہاد۔ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی۔۲۰۰۹

۲۵۔سنگِ گراں ہے زندگی۔سٹی بک پوائنٹ کراچی پاکستان۔۲۰۲۰

۲۶۔دھول دیپ۔عرشیہ پبلیکیشنز نئی دہلی۔۲۰۲۰

تراجم(ناول)

۲۷۔سدھارتھ۔نسیم بک پوائنٹ لکھنو۔۱۹۸۲

۲۸۔رقص اجل۔نسیم بک پوائنٹ لکھنو۔۱۹۸۵

۲۹۔سینٹ پیٹرس برگ۔سٹی بک پوائنٹ کراچی پاکستان۔۲۰۱۸

۳۰۔کمند ہوا۔نسیم بک پوائنٹ لکھنو۔۱۹۸۵

۳۱۔طاق نسیاں۔نسیم بک پوائنٹ لکھنو۔۱۹۸۶

۳۲۔شب گزیدہ۔نسیم بک پوائنٹ لکھنو۔۱۹۸۷

۳۳۔کرسمس۔سٹی بک پوائنٹ کراچی پاکستان۔۲۰۱۸

۳۴۔درہ خیبر کے اس پار۔نسیم بک پوائنٹ لکھنو۔۱۹۸۸

۳۵۔وادی پنج شیر۔سٹی بک پوائنٹ کراچی پاکستان۔۲۰۱۸

۳۶۔زہراب نیل۔نسیم بک پوائنٹ لکھنو۔۱۹۸۹

۳۷۔گاڈ فادر۔سٹی بک پوائنٹ کراچی پاکستان۔۲۰۱۸

۳۸۔ڈاکٹر ژواگو۔سٹی بک پوائنٹ کراچی پاکستان۔۲۰۰۰

۳۹۔تتلی گھر۔۲۰۰۰

۴۰۔پاپیلاں۔۲۰۰۷

۴۱۔میلو ہائی باد تجارت۔۲۰۱۶

۴۲۔اورینٹ ایکسپریس۔سٹی بک پوائنٹ کراچی پاکستان۔۲۰۱۹

دیگر تراجم

۴۳۔سردار ولبھ بھائی پٹیل۔پبلیکیشن ڈیویژن نئی دہلی۔۱۹۹۸

۴۴۔سیکھنے کا فن۔کرشن مورتی فاونڈیشن وارانسی۔۱۹۹۹

۴۵۔کتاب حیات۔کرشن مورتی فاونڈیشن وارانسی۔۱۹۹۹

۴۶۔تاریخ ساز ایجادات۔پبلیکیشنز ڈیویژن نئی دہلی۔۲۰۰۲

۴۷۔مکالمات جے کرشن مورتی۔سٹی بک پوائنٹ کراچی پاکستان۔۲۰۲۰

۴۸۔تہذیب کا سوال کرشن مورتی فاونڈیشن وارانسی۔۲۰۲۱

ریسرچ اسکالر یونی ورسٹی آف حیدر آباد

موبائل نمبر 9493033871,9336632661

ISSN 2320-6519
U.G.C. Approved No.42266

[گوشۂ بشیر احمد بشیر (ابن نشاط) کشتواڑی]

سرزمین ولی اورنگ آبادی (دکن) سے جاری ہونے والا معیاری رسالہ

Quarterly (Urdu)
AKS-E-ADAB
Aurangabad

(اردو)

عکسِ ادب

(سہ ماہی)

اورنگ آباد

قارئین کی نیک تمناؤں کے ساتھ
چونتیسواں شمارہ، جلد (۱۰)
جنوری تا مارچ ۲۰۲۱ء

کٹے گی رات آئے گی سحر آہستہ آہستہ
شفا پائے گا اب دردِ جگر آہستہ آہستہ

بشیر احمد بشیر (ابن نشاط) کشتواڑی

سہ ماہی

عکسِ ادب

اورنگ آباد

جلد (۱۰)　　شمارہ (۳۳)　　جنوری تا مارچ ۲۰۲۱ء

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر یوسف صابر (یوسف خان جبار خان) 09326772575

معاون مدیر : شرجیل احمد خان موبائل : 09595686784

اعزازی مدیر : ڈاکٹر ثاقب مسعود موبائل : 09372012930

مینیجنگ ڈائریکٹر : سید فرزانہ نسیم موبائل : 09423877584

سرپرست

☆ ڈاکٹر عبدالکریم سالار (جلگاؤں)

☆ نور خاں (چالیسگاؤں)

مجلس مشاورت

- علامہ ناوک حمزہ پوری (حمزہ پور)
- علیم صبا نویدی (چنئی)
- مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگلپور)
- معصوم شرقی (کولکاتہ)
- فصیح احمد فصیح (پربھنی)
- ڈاکٹر درانی ایس۔ ایم (ناندیڑ)
- متین نذیر (مالیگاؤں)

مجلس ادارت

☆ ڈاکٹر عقیلہ سید غوث

☆ سید مسعود احمد قیصر

☆ ڈاکٹر عابد حسین محمد صادق

☆ وجاہت قریشی

☆ طاہر حسین طاہر

☆ ڈاکٹر شاہ ایاز

☆ حبیب النساء

☆ ڈاکٹر سلیم نواز حشر

☆ ڈاکٹر ارشاد احمد خان

☆ ابراہیم خان

جو کسی خواب نے دیکھا نہ تصور نے کہیں
بات تو جب ہے کہ انسان وہاں تک پہنچے

(ڈاکٹر یوسف صابر)

شمارہ کی قیمت	:	۵۰ روپے
زرسالانہ (بدست)	:	۲۰۰ روپے
زرسالانہ (بذریعہ پوسٹ)	:	۲۵۰ روپے
لائبریری کے لئے	:	۲۵۰ روپے
رجسٹرڈ پوسٹ	:	۳۰۰ روپے
تاحیات خریداری بھارت	:	۳۰۰۰ روپے
بیرونی ممالک	:	۱۰۰۰۰ تا ۱۵۰۰۰ روپے

سرکولیشن منیجر : تنزیل احمد خان (Mob 09284747707)

خریداری اور اشتہار کے لئے منی آرڈر، چیک اس نام سے بھیجیں :

Yousuf Khan Jabbar Khan
Bank of Maharashtra
S/Ac/ No. 60021185230
IFSC code MAHB 0000278

SBI
S/Ac/No.SB 52068629025
IFSC code SBIN 0020786

مقام اشاعت / ترسیل زر / مضامین / تخلیقات سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

Yousuf Khan Jabbar Khan
Editor Aks-e-Adab *(Quarterly)*
Green Valley, Near Kohinoor Lawns,
Ruby Building, No 4, B-Wing, Flat No.B-5
Rauza Baugh, Aurangabad
Dist. Post AURANGABAD (M.S.) 431001
Mobile 09326772575
email akseadab@gmail.com

Website : www.akseadaburdu.co.in

طباعت

نورانی آفسیٹ پریس

آگرہ روڈ نزد پٹرول پمپ، مالیگاؤں ضلع ناسک (مہاراشٹر)

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔
"عکسِ ادب" سے متعلق کوئی بھی قانونی چارہ جوئی اورنگ آباد عدالت میں ہوگی۔

☆ترتیب و تزئین☆

اداریہ	ڈاکٹر یوسف صاؔبر	۳
اسلامیات	ایم ایم شیخ، سیدہ فرزانہ نسیم	۴
عکس ایماں	حمد و مناجات، نعت	۵
مغز ادب	ڈاکٹر یوسف صاؔبر	٦
☆خصوصی گوشہ (اس شمارے کی شخصیت) بشیر احمد بشؔیر (ابن نشاط) کشتواڑی		صفحہ ۷ تا ۳۳

☆قلمی تعاون :

● ڈاکٹر یوسف صاؔبر ● انور سدید ● پروفیسر ظہور الدین ● افتخار امام صدیقی ● ادارہ اردو بک رویو دہلی

● ڈاکٹر سیفی سرونجی ● وحشی سعید ● محمد عمر فرحت راجوری ● ایاز رسول نازکی

☆مضامین (تحقیق و تنقید)

● خدیجہ مستور بحیثیت بچوں کی ادیبہ	ڈاکٹر محمد زکریا محمد اسمٰعیل	۳۴
● جیلانی بانو کے افسانوی مجموعے	فردوس انجم شیخ آصف	۳٦
● شہناز نبی کی نظم نگاری	زنیرہ	۳۸
● یعقوب یاور کی شاعری کا تجزیہ و تفہیم	الطیع اللہ	۴۰
● سجاد حیدر یلدرم اور ان کا افسانوی سفر	ڈاکٹر اے آر منظر	۴۲
● مسلمانوں کی تاریخ اور آزادی کے بعد......	ڈاکٹر شیخ ساجدہ عبدالواسع	۴۴
● علامہ اقبال کا پیغام ملت کے نام	ڈاکٹر محمد ناصر اللہ انصاری	۴٦
● علاقہ مراٹھواڑہ میں اردو کی نشو و نما کا جائزہ	شیخ روبینہ تبسم	۴۷
● وشاکھا پٹنم کا شعر و ادب ۱۹۴۷ء کے بعد	علیم صبا نویدی	۴۹
● اُترن	ڈاکٹر رفیع الدین ناصر	۴۹
● ڈاکٹر یوسف صابر۔ ہمہ جہت ادبی خدمات	محمد احمد دانش روانوی	۵۴
☆رپورتاژ ● جانے والے کبھی	ملک بزمی	۵۰
☆انشائیہ ● انڈا	محمد اسد اللہ	۵۲
☆تعارف و تبصرے	از قلم : ڈاکٹر یوسف صاؔبر	۵٦
☆افسانوی ادب افسانچے		۵۹

● معز ہاشمی ● سلیم سرفراز ● ڈاکٹر نخشب مسعود

☆شاعری

● ضرر وصفوی	۳۷
● سمیع الدین اطہر	۴۱
● چشتی سلیم بیدرد	۴۸
● طاہر حسین طاؔہر	۵۱
● شفیع احمد شفیع ● محمد فرید فطرت ● کلیم کسکؔ ● شہرت ادیبی	٦۰
● کوثر پروین کوثر ● تمیز احمد پرواؔز ● ذ صدیقی ● منان راہی چشتی	٦۱
☆اخبار عکس ادب و خلوص عکس ادب (خبریں و منتخب خطوط)	٦۲

لائف ممبران

(۱) عتیقہ اطہر موسیٰ (اورنگ آباد)
(۲) قاضی خسرو (اورنگ آباد)
(۳) ڈاکٹر مسرت فردوس (اورنگ آباد)
(۴) ڈاکٹر کیرتی جاؤلے (اورنگ آباد)
(۵) انصاری ابرار احمد (اورنگ آباد)
(٦) مہر سلطانہ جبار قریشی (اورنگ آباد)
(۷) ڈاکٹر عبدالرب (اورنگ آباد)
(۸) سید وہاب الحق (اورنگ آباد)
(۹) محمد سعید احمد محمد سردار (اورنگ آباد)
(۱۰) ڈاکٹر فرحت نسرین (اورنگ آباد)
(۱۱) ڈاکٹر شرف النہار (اورنگ آباد)
(۱۲) ڈاکٹر معین فاطمہ (اورنگ آباد)
(۱۳) ڈاکٹر مخدوم فاروقی (اورنگ آباد)
(۱۴) مولانا آزاد کالج (اورنگ آباد)
(۱۵) شیخ شہلا سلطانہ (اورنگ آباد)
(۱٦) برہانی نیشنل اردو پرائمری اسکول (اورنگ آباد)
(۱۷) ڈاکٹر قاضی رضوانہ شمیم (اورنگ آباد)
(۱۸) اسماء روحی قادری (اورنگ آباد)
(۱۹) شیخ ظہور احمد (اورنگ آباد)
(۲۰) مبین نذیر (مالیگاؤں)
(۲۱) مقصود اشرف (مالیگاؤں)
(۲۲) ڈاکٹر شاہ ایاز (مالیگاؤں)
(۲۳) ڈاکٹر شاداب روش (مالیگاؤں)
(۲۴) انصاری عتیق احمد محمد شعبان (مالیگاؤں)
(۲۵) سٹی کالج (مالیگاؤں)
(۲٦) خان عبدالغفار خان کالج (پاتھری)
(۲۷) عالیہ کوثر (اسسٹنٹ پروفیسر) (جالنہ)
(۲۸) ڈاکٹر سلیم نواز حشرؔ جعفر آبادی (جالنہ)
(۲۹) سید غازی علی غازی (جالنہ)
(۳۰) تحسین درانی (جالنہ)
(۳۱) عبدالوہاب (اسسٹنٹ پروفیسر) (جالنہ)
(۳۲) ڈاکٹر نسیم بیگم (پربھنی)
(۳۳) ڈاکٹر سلیم محی الدین (پربھنی)
(۳۴) خضر احمد خان شررؔ (پربھنی)
(۳۵) حبیب النساء (پربھنی)
(۳٦) ڈاکٹر قاضی کلیم (پربھنی)
(۳۷) ڈاکٹر شبانہ درانی (ناندیڑ)
(۳۸) ڈاکٹر ارشاد احمد خان (ناندیڑ)
(۳۹) شیخ ہما کوثر (اسسٹنٹ پروفیسر) (ناندیڑ)
(۴۰) اظہر احمد غلام یزدانی (ناندیڑ)
(۴۱) اختر صادق (ناندیڑ)
(۴۲) محمد اختر (ناندیڑ)
(۴۳) ڈاکٹر عظمیٰ تسنیم (پونہ)
(۴۴) ڈاکٹر عنبر خاتون (ہزاری باغ)
(۴۵) ڈاکٹر فرحت حسین خوشدل (ہزاری باغ)
(۴٦) رشید ضارب (حیدرآباد)
(۴۷) ڈاکٹر عقیلہ سید غوث (امبہ جوگائی)
(۴۸) ڈاکٹر قمر النساء (خلد آباد)
(۴۹) ڈاکٹر مقبول احمد مقبول (اودگیر)
(۵۰) ڈاکٹر خالد مبشر (دہلی)
(۵۱) سید سمیع الدین (بیدر)
(۵۲) J.J.T.University (راجستھان)
(۵۳) ڈاکٹر سیدہ اصفیہ مدنی سید زکریا (بیڑ)
(۵۴) محبوب پاشا اعظمی (چینّی)
(۵۵) ڈاکٹر نکہت آراء (شولاپور)
(۵٦) شیخ ارم فاطمہ (تلنگانہ)
(۵۷) ڈاکٹر محمد ناصر اللہ انصاری (لاتور)

ISSN 2320-6519 AKS-E-ADAB (Quarterly) Aurangabad.

یعقوب یاور کی شاعری کا تجزیہ و تفہیم

اطیع اللہ (ریسرچ اسکالر)

شعبۂ اردو، یونی ورسٹی آف حیدرآباد

موبائل نمبر۔ 9493033871

☆**خلاصہ (Abstract)** یعقوب یاور اردو ادب میں ایک قابل قدر نام ہے۔انھوں نے اردو کے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اوران میں یہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔اردو زبان وادب کی ترویج و اشاعت میں یعقوب صاحب کے بیش بہا خدمات ہیں۔اردو کے فروغ میں درس وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف میں لگے ہیں۔اس مضمون میں یعقوب یاور کی شاعری کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

☆**تعارف :** یعقوب یاور صاحب کی اب تک دو درجن سے زائد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔جن میں فکشن کی دنیا میں ان کا پہلا ناول ''دل من'' اردو ادب میں کافی مقبول ومشہور ہوا اس کے علاوہ تین اور ناول ہیں جو فکشن کی دنیا میں کافی اہمیت کے حامل ہیں وہ یہ ہیں۔''عزازیل'' جو ایک سوانحی ناول ہے اور ابلیس کی زندگی پر منحصر ہے۔یہ ناول اپنے اندر دلچسپ واقعات اور ادب کی چاشنی کو جذب کیے ہوئے ہے، تیسرا ناول ''جہاد'' جو گجرات فسادات سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے اور چوتھا ناول ''ڈھول دیپ'' ہے جو ''دل من'' کا دوسرا حصہ ہے۔یہ دونوں ناول سندھ کی تہذیب وثقافت پر روشنی ڈالتے ہیں اس میں موہنجوداڑو و ہڑپا کی کہانیاں موجود ہیں۔یہ چاروں ناول اردو ناول نگاری میں انفرادیت کے متحمل ہیں۔کیوں کہ اس موضوع پر اردو ناول نگاری میں ان کے چاروں ناول اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔اس کے علاوہ تنقید وتحقیق اردو تراجم میں

ایک درجن سے زائد کتابیں ہیں۔

شاعری میں یعقوب یاور صاحب کے اب تک تین مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں: پہلا مجموعہ ''الف'' ۱۹۸۸ء میں اور دوسرا مجموعہ ''قلم گوید'' ۲۰۰۰ء میں اور تیسرا بارزیاں ۲۰۲۰ء میں شائع ہوا۔

☆**یاور کی شاعری کا تجزیہ :** آپ کی پہلی غزل ہریانہ کے رسالہ ماہنامہ ''تعمیر'' میں شائع ہوئی۔یعقوب یاور کی شاعری میں جذبات وغم وغصہ اور عشق ومحبت اور سماج میں رونما ہونے والے واقعات کی عکاسی موجود ہے۔یعقوب صاحب کی شاعری سنجیدگی کے ساتھ جوش وولولہ کی طرف مائل کرتی ہے۔

یعقوب یاور اپنی ذاتی زندگی میں ایک سلیقہ شعار اور معیار پسند انسان ہیں اور یہی سلیقہ شعاری اور معیار پسندی ان تخلیقات میں پیوست ہے۔ پروفیسر عنوان چشتی لکھتے ہیں :

''یعقوب یاور ان محتاط اور مخلص شاعروں میں شامل ہیں جنھوں نے غزل کی فنی اور جمالیاتی قدروں کا احترام کرتے ہوئے اپنی تخلیقی طاقت کا ثبوت فراہم کیا ہے ان کی شاعری میں ان کے سائے اور ہم سائے پوری طرح جلوہ گر ہیں میری مراد ان کی ذات اور کائنات سے ہے مجھے یقین ہے کہ غزل کے مزاج داں اور ادا شناس ان کی شاعری کو محبت سے پڑھیں گے۔''

یعقوب یاور نے زمانے کے ان تغیرات کو اپنی شاعری میں پیش کیا جن کو انھوں نے خود محسوس کیا ہے اور ان کی شاعری سے لگتا ہے کہ وہ اس افراتفری کی زندگی سے کچھ پریشان نظر آتے ہیں اور کرب وبے چینی کے شکار ہیں۔جیسے ۔

مرا جسم مرا لہو پی گیا
گھڑی کی سوئی اپنے پل کھا گئی
نئی سوچ حیرت کدہ توڑ کر
ہمارے مسائل کے حل کھا گئی
اسے کھا گیا خوف قحط الرجال
مجھے اس کا نعم البدل کھا گئی
وہ تاریک شب ہے کہ جینا محال
وہ شب پھیل کر مرا کل کھا گئی
تصور میں اب دور تک تو نہیں
کشاکش دماغی خلل کھا گئی

یعقوب یاور نے اپنے اشعار میں سماج میں پھیلی وبا کو پوری شعریت کے ساتھ پیش کیا ہے۔زمانے کی ترقی سے جو نقصانات سماج میں ہوئے ہیں اور اس چک دمک سے جس طرح رشتوں کی پاس داری ختم ہوئی ہے۔اس کو یعقوب یاور نے شاعرانہ انداز میں رمز و ایما کے ساتھ میں پیش کیا ہے۔جیسے۔

قدم خلا پہ رکھ کے کامیابیوں میں کھو گیا
یہ ارتقاء نہ جانے کتنی دستیاں بھگو گیا
عطش کی تا حد نظر کھلے ہیں پھول دھوپ کے
ہماری بستیوں کو کوئی آفتاب بو گیا
حصار میرے جسم کی نمی کو چوستا رہا
خیال اڑتے بادلوں کا ذہن میں تھا سو گیا
میں جس کی کھوج میں پھرا گلی گلی نگر نگر
وہ گھل کے میرے خون میں دائمی گھٹن سمو گیا

مظفر حنفی نے یعقوب یاور کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے :

"یعقوب یاور کی شاعری بیک وقت روایت سے انحراف بھی کرتی ہے اور اس کی پاسداری بھی یہ دو سرکش گھوڑوں پر ایک ساتھ سواری کرنے جیسا خطرناک عمل ہے لیکن جب فنکار ایسے خطروں سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتا نظر آئے تو نہ چاہتے ہوئے بھی لوگوں کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو جاتی ہیں دوست تو خیر دوست ہوتے ہیں باضمیر دشمن بھی اسے داد سے نوازنے پر مجبور ہوتا ہے۔"

یاور کی شاعری میں متنوع موضوعات موجود ہیں۔ انھوں نے زندگی کو کئی زاویہ سے دیکھا ہے اور اسے شاعری میں اتارا ہے چاہے وہ زندگی کے پیچ وخم ہوں یا فضائی مناظر یا حسن وعشق یا محبوب وعاشق پر عشقیانہ عمل یا اونچ نیچ، ذات پات، مظلوم ومحکوم کی روداد سب یعقوب یاور کی شاعری میں موجود ہے۔

چیخوں میں بے بسی تھی حمایت نہ کر سکے
بستی کی سائیں سائیں میں ہمت نہ کر سکے
کہنے کو سُرخرو رہی سچائی کی صلیب
افسوس پھر بھی سچ کی حفاظت نہ کر سکے
تیرے کوچے کا چکر آج بھی بے کار جاتا ہے
بساط دل پر کوئی اور بازی مار جاتا ہے
جمال لب کشائی تیری ترغیبات کا حصہ
وہ چہروں کی بلاغت پر محبت ہار جاتا ہے
میں اپنا سچ کہیں محفوظ رکھ پاتا تیرے سچ سے
کہ میرا سچ ہمیشہ تیرے سچ سے ہار جاتا ہے

یعقوب یاور نے باوزن اور قافیہ بند شاعری کے علاوہ آزاد ومعریٰ اشعار بھی کہے ہیں اور وہ اس میں بھی اپنے ہنر کو منوانے میں کامیاب ہیں، انفرادیت کا سایہ ان پر بھی جلوہ فگن ہے۔ وہ محبت کو اس طرح پیش کرتے ہیں جو اور شاعروں میں کم ملتا ہے، وہ اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں۔

محبت وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو
یہ کوئی اور ہی شئے ہے
اسے قہر خدا سمجھو
کہ تم محروم ہو احساس الفت سے
محبت اک احساس ہے
(نظم "محبت")

یعقوب یاور نے مختلف موضوعات اور مسائل کو اپنی شاعری میں رکھا ہے اور شاعری کے مختلف فارم میں پیوست کیا ہے۔ پابند ہو یا آزاد ہو، غزل ونظم دونوں اصناف میں یعقوب یاور نے شاعری کی ہے۔ انھوں نے حمد، نعت، منقبت بھی لکھے ہیں اور انھیں کے ذریعہ اپنے مجموعوں کا آغاز بھی کیا ہے۔ اگر ان کی شاعری کے فن پر بات کی جائے تو ان کے اشعار میں تشبیہ، استعارہ، تجنیس، تلمیح وغیرہ موجود ہیں لیکن چیزوں کو سیدھے سادے انداز میں پیش کیا ہے۔ ہاں کہیں کہیں بھاری بھرکم الفاظ مستعمل ہیں لیکن لاحقہ وسابقہ الفاظ اس طرح ہیں کہ ان کے اشعار مفہوم سے پرے نہیں ہوتے۔ تاریخ سے یعقوب یاور صاحب کو دلچسپی ہے اور اس کو انھوں نے ناول کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہ چیز ان کی شاعری میں بھی جا بجا موجود ہے۔ موہنجوداڑو کے عنوان سے ان کی نظم ہے۔ اس طرح کئی تاریخی واقعات پر انھوں نے شاعری کی ہے ان کی شاعری میں اسلامی تلمیحات کے علاوہ دیو مالائی تلمیحات بھی موجود ہیں۔ جیسے دشینت اور شکنتلا وغیرہ کے واقعات جس کو انھوں نے شاعری میں بھی ڈھالا ہے۔ نظم کے کچھ سطر ملاحظہ ہوں۔

لباس کے تار گن رہی تھی
جو میں نے پوچھا کون ہو تم
تو آنسوؤں نے زبان کھولی
میں بھولی بسری شکنتلا
کالی داس کی پاٹ جو ہتی ہوں
نہ جانے کس نے مری کتاب حیات کے
ہر ورق کو تاریک کر دیا ہے
میں اک گلی ہوں اور ایک دشینت ابھی
ابھی اس گلی سے گزرا ہے
تم بھی آؤ........"
(نظم "آج کی شکنتلا")

اس تلمیح کے ذریعہ یعقوب یاور نے آج کے دور میں عورتوں پر ہو رہے جنسی استحصال کو بہت ہی چبھتے ہوئے انداز میں شاعرانہ صفت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

☆**اختتام** : کل ملا کر یعقوب یاور جہاں ایک معتبر اور اچھے ومقبول ناول نگار اور مترجم ہیں ان شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ یعقوب یاور شاعری کے میدان میں بھی اپنا اچھا مقام رکھتے ہیں۔ اردو شاعری کی کڑی میں ایک کڑی یعقوب یاور کی شاعری بھی ہے۔ انھوں نے شاعری کے تمام اصول و ضوابط کو اپنی شاعری میں برتا ہے۔

☆☆☆

سمیع الدین اطہر (اورنگ آباد)
موبائل : 9370370494

مختصر نثری نظم

اپنی مخروطی انگلیوں سے
مہندی کبھی جدا نہ کرنا
کیوں کہ............
اس میں............
محبت کی خوشبو ہوگی............

☆☆☆

काशी हिन्दू विश्वविद्यालय

BANARAS HINDU UNIVERSITY

DESIGN INNOVATION CENTRE

अन्तरराष्ट्रीय संगोष्ठी

"हिन्दी-उर्दू की साझी विरासत और स्त्री लेखन"

بین الاقوامی سیمینار

اردو ہندی کی ساجھی وراثت اور خواتین قلم کار

International Seminar on "Hindi - Urdu Ki Saajhi Virasat aur Stri Lekhan"

on 27th - 29th March 2018.

Certificate

This is certify that Prof./Dr./ Ms./Mr./Mrs/ Atiullah Research Scholar Department of Urdu University of Haidrabad has participated and presented his/ her paper *entitled* ناول،دل من، میں تانیثی پہلو

in the **3 day International Seminar on "Hindi - Urdu Ki Saajhi Virasat aur Stri Lekhan"** and contributed towards the success of the seminar.

Head, Department of Urdu
Dr. Aftab Ahmad Afaqui

Organizing Secretary
Dr. Mosharraf Ali

Convener
Prof. Champa Singh

UNIVERSITY OF MADRAS

DEPARTMENT OF ARABIC PERSIAN AND URDU

with the financial assistance of NATIONAL COUNCIL FOR PROMOTION OF URDU LANGUAGE - New Delhi - 110 025

شعبہ عربی فارسی واردو، مدراس یونی ورسٹی کے زیراہتمام بہ اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان وزارت انسانی وسائل و بہبود، حکومتِ ہند، نئی دہلی-110025

75 சுதந்திரத் திருநாள் அமுதப் பெருவிழா

Two Day National Urdu Seminar

The Art of Prose Writing in Urdu: Evolution, Conception and Prospects

دو روزہ قومی اردو سیمینار

اردو کے نثری اسالیب: تقدیم، تحدید اور ترغیب

Certificate

This is to Certify that Dr./Prof/Mr/Mrs/Ms ATIULLAH *of* University of Hyderabad

Participated in the National Urdu Seminar on 14 & 15-3-2022 **at Platinum Jubilee Auditoruim Marina Campus,** *University of Madras Chennai Organized by* **DEPARTMENT OF ARABIC PERSIAN AND URDU UNIVERSITY OF MADRAS Chennai - 600 005.**

and chaired a session/presented a paper on یعقوب یاور کے ناولوں کا اسلوبیاتی مطالعہ

Prof. K.HABEEB AHMED
Professor & Head

Dr. AMANULLA M B
Director of the Seminar

SL.NO. : 65798

UNIVERSITY OF HYDERABAD

(A Central University established by an Act of Parliament)

P.O. CENTRAL UNIVERSITY, HYDERABAD - 500 046 (INDIA)

SEMESTER GRADE TRANSCRIPT

EXAMINATION : M.Phil. Urdu

SEMESTER: 1

MONTH AND YEAR : NOV 2014

REG. NO. : 14HUHL17

NAME OF THE STUDENT : ATIULLAH

PARENT'S NAME : MASUD AHMAD / QUTBUNNISHA

COURSE NO.	TITLE OF THE COURSE	LETTER GRADE AWARDED	CREDITS	RESULTS
HU701	Research Methodology	B+	5.00	PASS
HU702	Practical Criticism	A+	5.00	PASS
HU721	Textual Criticism	A+	5.00	PASS
	*** END OF STATEMENT***			

SEMESTER GRADE POINT AVERAGE (SGPA) : 9.33

(in words) : NINE POINT THREE THREE

PREPARED BY

CHECKED BY

for CONTROLLER OF EXAMS

Asst. Registrar
Examination Branch

Date of Issue: 08-Feb-2015

SL. No. 12575

UNIVERSITY OF HYDERABAD

P.O. CENTRAL UNIVERSITY, HYDERABAD - 500 046 (INDIA)

University of Hyderabad EXAMS BRANCH Hyderabad

PROVISIONAL CERTIFICATE CUM CONSOLIDATED GRADE TRANSCRIPT

Student Registration Number : **14HUHL17**

This is to certify that **ATIULLAH** son/daughter of **MASUD AHMAD / QUTBUNNISHA** has been declared qualified for the award of the degree of **M.Phil. Urdu** after having passed the prescribed courses as follows:

Course No.	Title of the Course	Letter Grade Awarded	Credits	Month & Year of Passing
	Semester : I			
HU701	Research Methodology	B+	5.00	NOV 2014
HU702	Practical Criticism	A+	5.00	NOV 2014
HU721	Textual Criticism	A+	5.00	NOV 2014
	Semester : II			
UR780	Dissertation submitted on : 30 JUN 2015	A	15.00	OCT 2015

S. Supplementary I. Improvement R. Repeat

Cumulative Grade Point Average (CGPA): 9.17 (NINE POINT ONE SEVEN)
Division : First Division with Distinction
Final result declared on : 28/10/2015

Date: 06/11/2015
Hyderabad

Prepared By Checked By

CONTROLLER OF EXAMINATIONS

Controller of Examinations
University of Hyderabad

فہرست ابواب

پیش لفظ		2
باب اوّل:	یعقوب یاور سوانح، شخصیت اور ادبی خدمات	12
باب دوم:	یعقوب یاور کے ناولوں کا تجزیہ	44
باب سوم:	یعقوب یاور کی شاعری کا تجزیہ	148
باب چہارم:	تحقیق و تنقید	232
باب پنجم:	یعقوب یاور کے تراجم و ترتیب کا جائزہ	261
ماحصل		302
کتابیات		314

پیش لفظ

پیش لفظ

سب سے پہلے میں رب کریم ذوالجلال والاکرام کا شکر گزار ہوں جن کے رحم وکرم سے میرا یہ مقالہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

پی ایچ۔ڈی میں داخلہ کے بعد مقالے کے لیے موضوع کا انتخاب سب سے اہم مرحلہ ہوتا ہے۔ بہت دنوں تک میں اسی کشمکش میں رہا۔ بالآخر ''یعقوب یاور حیات اور فن'' کے عنوان سے اپنے مقالے کے موضوع کے لیے اپنے نگراں سے مشورہ کیا۔تو میرے لیے یہی موضوع منتخب کیا گیا۔

یعقوب یاور ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ان کا شمار عہد حاضر کے کامیاب ناول نگاروں اور مترجمین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی فکری وفنی بصیرت سے اردو ادب میں منفرد شناخت بنائی ہے۔ ساتھ ہی یہ ایک اچھے شاعر، محقق، مرتب، ناقد بھی ہیں۔ میں نے اپنے مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

باب اوّل: یعقوب یاور سوانح، شخصیت اور ادبی خدمات

اس باب میں یعقوب یاور کی ولادت، تعلیم وتربیت، ملازمت، علمی وادبی خدمات، تصانیف و تراجم، انعامات واعزازات سے متعلق معلومات کو درج کیا گیا ہے۔

یعقوب یاور کا تعلق اتر پردیش کے ضلع فتح پور کے گاؤں 'کوٹ' سے ہے۔ ان کی ولادت 22، نومبر 1952 میں ہوئی۔ یعقوب یاور کی ابتدائی تعلیم گھر پر والدین کی نگرانی میں ہوئی۔مکتب کی تعلیم انھوں نے گاؤں کوٹ سے حاصل کی۔ ہائی اسکول چودھری شیوسہائے انٹر کالج فتح پور یوپی بورڈ سے کیا۔ ہائی اسکول

کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد گھر کی معاشی تنگ دستی کو دیکھتے ہوئے تعلیم کو ترک کر کے کسب معاش کے لیے کئی شہروں کے چکر کاٹنے کے بعد بھوپال میں ذریعۂ معاش کے ساتھ انٹر کی تعلیم حاصل کی۔ بی۔اے، ایم۔اے اور پی ایچ ڈی، سیفیہ کالج بھوپال سے کیا۔ بھوپال میں انھوں نے کئی مقامات پر ملازمت بھی کی۔ 1990 میں بسنت کالج برائے خواتین B.H.U میں بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسران کی تقرری ہوئی پھر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی میں پروفیسر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے خدمات انجام دے کر 2017 میں سبک دوش ہوئے۔

انھوں نے اپنی ادبی سفر کا آغاز دوران طالب علمی میں ہی کیا تھا۔ ان کی اب تک 48 کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ جس میں تین شعری مجموعہ، پانچ ناول اور 22 تراجم، 9 تحقیقی و تنقیدی کتابیں اور ترتیب میں ڈرامہ 'کلیاتِ آغا حشر کاشمیری' جو سات جلدوں پر مشتمل ہے اور ایک خطوط کا مجموعہ 'مکتوبات مسرور مسلم' ہے۔

باب دوم: یعقوب یاور کے ناولوں کا جائزہ

اس باب میں یعقوب یاور کے ناولوں کا موضوعی اور فنی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ جس میں ان کا ناول ''دل من''، ''عزازیل''، ''جہاد'' شامل ہے۔ ناول 'دل من' 1998 میں لکھا گیا ہے۔ جس میں تانیثیت کے حوالے سے موہن جوداڑو و سندھو گھاٹی کی تہذیب وثقافت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ناول سندھو گھاٹی کی تہذیب پر لکھا گیا اردو کا پہلا ناول ہے۔ جس میں یعقوب یاور نے ہزار سال قبل مسیح سے پہلے کی تہذیب و تمدن کو پیش کیا ہے۔ یہ ناول موجودہ دور کی تہذیب وثقافت سے تو دور ہے لیکن دور حاضر کے لیے سبق آموز ہے۔ موہن جوداڑو جیسی پرانی تہذیب وثقافت کو اس ناول میں وحدت تاثر کے ساتھ ناول نگار نے بڑی ہی چابکدستی سے بیان کیا ہے۔ اس ناول کا اختتام اور آغاز ایک ایسی کہانی سے ہوتا ہے جس میں مرکزی کردار دیوائی کو دو قتل کے جرم میں دل من شہر سے باہر پھینکا جاتا ہے۔ پہلا قتل اس نے اپنے بدلے کے لیے کیا تھا حالانکہ دوسرے قتل کے جرم میں جب اسے دل من شہر سے باہر پھینکا جاتا ہے تو وہ اس بار سازش کا شکار ہوتی

ہے اور ایک نا کردہ جرم کی سزا پاتی ہے۔ دل من شہر میں عورتوں کے ساتھ لوگوں کا کیسا سلوک تھا دیوانئ اس کی ترجمانی کرتی ہے ساتھ ہی اس ناول میں دل من شہر کے سماجی و معاشرتی بے راہ روی اور ناانصافی کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول تانیثیت اور قدیم تہذیب وتمدن کے اردگرد گھومتا ہوا نظر آتا ہے۔ نظریاتی سطح پر یہ ایک مابعد جدید ناول ہے جس کے اندر ماضی کے اقدار کے ساتھ لامرکزیت اور مہا بیانیہ کی تردید ملتی ہے۔ اس ناول میں جو کردار ہیں ان کو مصنف نے کسی نظریہ کا علمبردار نہیں بنایا ہے۔ ناول کا کردار کشال ہو یا سرال ان کے اندر خودمختاری کی صفت پنہاں ہے جس کی بنا پر یہ کردار مختلف الجہات افعال واعمال سے رچے بسے ہیں۔ ناول کی مرکزی کردار دیوانئ جس کے تانیثی مسائل کو ناول میں پیش کیا گیا ہے یہ بھی خصوصیت کا حامل ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ ناول مابعد جدید کے زمرے میں آتا ہے کیوں کہ مابعد جدید رجحان میں تانیثی مسائل کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ جس کو سماج حاشیائی چیز سمجھتا تھا مابعد جدید رجحان نے اس کو فوقیت دی ہے۔ یہ ساری چیزیں اس ناول میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

ان کا دوسرا ناول ''عزازیل'' 2001 میں شائع ہوا جو ایک دلچسپ ناول ہے۔ اس ناول میں انسانی دنیا سے قبل کی ماورائی دنیا کی تصویرکشی کی گئی ہے۔ جو عزازیل کے سوانح پر مبنی ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو علم اخلاقیات کا دامن چھوڑ کر تکبر کا چولا پہن لے تو اس کا انجام تباہی ہی ہے۔ عزازیل سے ابلیس تک بننے کا سفر اس ناول میں موجود ہے۔ ناول میں اہرمن (ابلیس) نے الگ الگ زمانے میں سات بار جنم لیا۔ کبھی غراموت کے نام سے کبھی شرلات، کبھی تلویث کبھی رون کبھی شرموت اور آخر میں ساتویں بار عزازیل کی حیثیت سے۔ اس کے علاوہ اور دوسرے بھی مسائل و واقعات ہیں جو ناول کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں جیسے عزازیل کا اللہ کی کثرت سے عبادت کرنا، یا پھر رامن، شرلاموت، غراموت، تلویث، رون، شرموت کے وقت شر پھیلانے کے افعال وغیرہ اور اہرمن (ابلیس) کے ماں باپ کے حالات کا ذکر بھی ناول میں کیا گیا ہے۔ یہ ناول ابلیس کی سوانح کے پیچھے عہد حاضر کے سماجی واخلاقی منظر نامے کو پیش کرتا ہے۔ جس میں آج کا انسان خود کو خدا مان بیٹھا ہے۔ اسے اپنے سوا سب حقیر معلوم ہوتے

ہیں۔غرور وگھمنڈ رشتے کی پامالی،سماج کا حصہ بن چکا ہے۔اشارۃً اس ناول میں ان چیزوں کو بیان کیا گیا ہے۔

تیسرا ناول ''جہاد'' 2009 میں شائع ہوا۔ یہ ناول گجرات فساد سے متاثر ہوکر لکھا گیا ہے۔اس میں گجرات کے مسلمانوں کے قتل عام کے بعد دوسرے مقامات ودیگر شہروں کے مسلمانوں میں جو افراتفری مچی ہوئی تھی اور خوف وڈر کا سماں تھا،اس کی روداد اس ناول میں موجود ہے۔ناول جہاد ایک ایسا ناول ہے جس میں حقیقت پسندی ہے اور عصری مسائل کا بیان اس طرح سے کیا گیا ہے کہ اس میں کسی کی طرفداری اور جانبداریت نہیں ہے۔غیر جانبدار ہوکر ناول نگار نے عصرِ حاضر کے المیے کو ناول کے فن میں پرویا ہے۔جس میں مسلمانوں کے مسائل کے ساتھ ملک ہندوستان میں ان پر جو مظالم ڈھائے جاتے ہیں اس کا بیان بڑی ہنرمندی سے کیا گیا ہے۔اس ناول میں ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے بحث کیا گیا ہے۔اور ہندو اس ناول میں ضمناً موجود ہیں۔

یعقوب یاور کے ناولوں کی فنی خوبیاں بھی ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتیں ہیں ۔ان کے ناولوں کا پلاٹ مربوط اور منظّم ہے۔قصوں میں ربط وتسلسل برقرار ہے واقعات ایک دوسرے سے گتھے ہوئے ہیں۔ یعقوب یاور کے تینوں ناولوں میں اکثر بیانیہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔لیکن ناولوں میں کردار نگاری، مکالمہ نگاری،منظر نگاری، بدرجہ اتم موجود ہیں۔

باب سوم: یعقوب یاور کی شاعری کا تجزیہ

اس باب کے تحت تین ذیلی عنوان قائم کر کے یعقوب یاور کی شعروسخن کو سمجھنے کی سعی کی گئی ہے۔ دنیائے ادب اس بات کو جانتی ہے کہ یعقوب یاور ناول نگار مترجم اور ایک نقاد ہیں لیکن شاعری کی دنیا میں وہ اس طرح شہرت حاصل نہ کر پائے جس طرح سے ہونی چاہیے وجہ کچھ بھی ہوسکتی ہے لیکن راقم اس مقام پر پہنچا ہے کہ ان کے ناولوں کی وجہ سے ان کو شہرت حاصل ہوئی شاید اس لیے ان کی شاعری کہیں نہ کہیں دبتی ہوئی دکھائی دی ورنہ یعقوب یاور کی شاعری اچھی خاصی ہے اور ان کے کلام بھی بہتر اور معنی خیز ہیں۔اس کا تجزیہ

اس باب میں کیا گیا ہے۔ جس کو سمجھنے کے لیے یہ عناوین قائم کیے گئے ہیں:

(الف) عہد و ماحول

(ب) موضوع و مسائل

(ج) فنی لوازمات

عہد و ماحول میں یعقوب یاور کی شاعری کے زمانہ کی تغیرات اور ماحول کا ذکر ہے۔ ساتھ ہی ان کے کچھ ہم عصر شاعروں کا مختصراً تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔ موضوع و مسائل کے تحت یعقوب یاور کی شاعری کا موضوعی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ فنی لوازمات میں شاعری کے اصول وضوابط پر ان کی شاعری کو پرکھا گیا ہے۔ جس میں علم بیان، علم بدیع اور بحریں وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں جو قدیم اصناف اور نئے تجربات استعمال کیے ہیں اس کی نشاندہی کی گئی ہے جیسے شہر آشوب، مثنوی، قصیدہ، حمد، نعت، اور آزاد و معرا نظم اور نئے تجربات میں ترائیلے، ہائکو، دوہے وغیرہ ہیں۔ یعقوب یاور کی شاعری میں اکثر عصری مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جس میں معاشرتی مسائل کے ساتھ جذبات غم وغصہ، عشق و محبت، اور سماج میں رونما ہونے والے واقعات کی عکاسی موجود ہے۔ جدید دور کے مشینی ٹکنالوجی اور دیگر آلات کے منفی اثرات سے انسانوں میں جو دوری آئی ہے اس پر طنز ہے۔ اسی طرح کسب مال میں رفتار کی تیزی اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے پر اخلاص و مروت کو کچل دینے والی ہنگامہ آرائی وغیرہ یعقوب یاور کو چبھتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ساتھ ہی دور حاضر کے تہذیبی بحران وفقدان کو بھی انھوں نے اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ جس میں یہ بات منعکس ہے کہ آج اولاد اپنے والدین کو اپنے اوپر بوجھ سمجھتی ہے۔ ہر رشتے کی پامالی نئی تہذیب میں رچ بس گئی ہے۔ آج کی نئی نسل پوری طرح سے اپنے ماضی کی قدروں کو بھول چکی ہے۔ اس طرح سے یعقوب یاور کی شاعری میں سماجی، سیاسی، مذہبی، اصلاحی مسائل کے ساتھ فلسفہ حیات کو پیش کیا گیا ہے۔ جس سے یعقوب یاور کے فکر کی گہرائی و گیرائی کا پتا چلتا ہے۔ سماج اور دنیا و مافیہا کی تمام چیزوں پر ان کی باریک نظر ہے۔ انھوں نے اپنے تجربات اور مشاہدات کی بنا پر عصری مسائل کے ساتھ انسانی زندگی کے تمام رموز کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ یعقوب یاور نے شاعری کے فنی لوازمات کو اپنی شاعری میں بخوبی برتا ہے چاہے وہ

علم بیان ہو جس میں تشبیہ واستعارہ وغیرہ آتے ہیں اس کا استعمال انھوں نے اشعار میں سلیقے سے کیا ہے اس سے ان کی شاعری میں شگفتگی آئی ہے اشعار دلچسپ اور معنی خیز ہوئے ہیں ساتھ ہی علم بدیع کے صنعتوں کا استعمال بھی ان کی شاعری میں ہوا ہے۔اس میں تکرار، تضاد، مناسبت لفظی، تلمیح وغیرہ ہیں۔یعقوب یاور نے پورے ہوش مندی اور خوش اسلوبی سے ان اصطلاحات کا استعمال اپنی شاعری میں کیا ہے۔غرض کہ یعقوب یاور کی شاعری فن کے اعتبار سے بھی کامیاب نظر آتی ہے۔راقم مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ یعقوب یاور ایک گراں قدر شاعر ہیں ان کے کلام کی طرف اہل نقد کو نظر کرنی چاہیے۔

باب چہارم: تحقیق وتنقید

اس میں یعقوب یاور کی کل نو جملہ تحقیقی وتنقیدی کتابوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔جن میں ''ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری'' ایک موضوع پر مبسوط کتاب ہے۔اس میں ترقی پسند تحریک کے خدوخال اسباب و عوامل کے ساتھ اس تحریک سے وابسطہ شاعروں کے کلام کی روشنی میں ان اثرات کا اندازہ لگایا ہے جو اس تحریک کے بدولت اردو شاعری پر مرتب ہوئے ہیں۔اور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو شاعری کے مختلف اصناف کی مقبولیت اور مخالفت کے اسباب اور ادیبوں ونقادوں کے اقوال پر یعقوب یاور کا تجزیہ اس کتاب میں موجود ہے۔یہ کتاب یعقوب یاور کی پی ایچ۔ڈی۔کا مقالہ ہے جو ''ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری'' کے نام سے۔1997ء میں کتابی شکل میں منظر عام پر آیا۔اور آٹھ کتابیں ہیں جو الگ الگ مضامین کے مجموعے ہیں۔یعقوب یاور کی تنقیدی مضامین اکثر شخصیات اور ان کے فن پر مبنی ہیں۔جن شخصیات کا انھوں نے اپنی تنقید کا حصہ بنایا ہے ان میں غالبؔ، سرسید، فیضؔ، مجروحؔ، منٹوؔ، آغا حشر کاشمیری وغیرہ پر بہترین تجزیہ ہے۔اور اس کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ بھوپال سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور نامور شاعروں پر ان کی تنقیدی مضامین زیادہ ہیں جن میں اختر سعید، اختر وامق، شاہد اختر، محمد علی تاج بھوپالی وغیرہ ہیں۔ایک اور کتاب ''آغا حشر کاشمیری شخصیت اور فن'' ہے جس میں انھوں نے آغا حشر کی ادبی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

یعقوب یاور کا تنقیدی نظریہ یہ ہے کہ وہ کسی ایک تنقیدی دبستان اور مرکزی نظریے کے متحمل نہیں

ہیں انھوں نے جن جن شخصیات پر تنقید کی ہے کسی خاص نظریے کے تحت ان کے فن کو نہیں پرکھا ہے بلکہ فن کے لوازمات سے ان شخصیات کی تحریروں کا جائزہ لیا ہے اور ان کی قدر متعین کرنے کی سعی کی ہے۔شاعری کی تنقید میں یعقوب یاور کا نظریہ تنقید یہ ہے کہ وہ کسی کے کلام کو دو زاویے سے دیکھتے ہیں پہلا شاعر کے فکر و خیال کی نوعیت کا پتا لگانا، اور دوسرا موضوع کے بیان میں شاعر کس طرح کا اسلوب اختیار کرتا ہے۔انھیں دونوں زاویے سے یعقوب یاور نے شعراء کے کلام کو پرکھا اور جانچا ہے۔یعقوب یاور موضوع اور فن دونوں کو شاعری میں اہمیت دیتے ہیں لیکن فن کی طرف ان کی رغبت زیادہ ہے۔

باب پنجم: یعقوب یاور کے تراجم و ترتیب کا جائزہ

اس باب میں یعقوب یاور کی ترجمہ نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔اور اس میں ان کے ترجمہ شدہ چند کتابوں کا تجزیہ ہے۔جس سے ان کے ترجمہ کی کیفیت اور طریقۂ ترجمہ کا پتا چلتا ہے۔انہوں نے ترجمہ کے لیے جن کتابوں کا انتخاب کیا ہے وہ اپنے ادوار کے مقبول و معروف اور انعام یافتہ ہیں۔ان کے تمام تراجم انگریزی زبان سے کیے گئے ہیں۔ان کے ترجمے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مصنف کے لہجے، طرزِ ادا اور ذہنی تسلسل کو مرکزیت حاصل ہے۔جس سے وہ منشاء مصنف کو برقرار رکھتے ہوئے اصل کتاب کی اہمیت اور ترجمے کا مقصد پورا کرنے میں کامیاب ہیں۔یعقوب یاور کے تراجم میں تخلیقی عناصر موجود ہیں اور یہی ترجمہ کی سب سے بڑی خوبی ہوتی ہے۔ان کے تراجم کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ترجمہ کرنے میں کمال حاصل ہے۔انگریزی زبان کو سمجھنے اور پھر اسے اردو میں منتقل کرنے کی یہ اچھی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔اور ترتیب میں ڈرامہ 'کلیات آغا حشر کاشمیری' ہے۔جس کو یعقوب یاور اور آغا جمیل کاشمیری نے آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں کا کلیات سات جلدوں میں مرتب کیا ہے۔یہ کلیات قومی کونسل برائے فروغ اردو کی جانب سے 2004 میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔دیباچے میں آغا حشر کاشمیری کا تعارف، ان کی تصانیف اور ادبی خدمات کو مرتبین نے قلم بند کیا ہے۔مجموعی طور پر یعقوب یاور اردو ادب میں ایک قابل قدر نام ہے۔یہ بڑے ناول نگار، اچھے شاعر، بہترین مترجم اور ناقد و صحافی ہیں ساتھ ہی ان کے اندر بہترین

اتالیقی صفت موجود ہے۔

باب کے آخر میں ماحصل ہے جس میں یعقوب یاور کے فکر وفن کا محاکمہ پیش کرتے ہوئے ان کی انفرادیت اور ان کے نقطۂ نظر کو پیش کیا گیا ہے۔

مقالے کی تکمیل صرف ریسرچ اسکالر سے ممکن نہیں ہے۔ اس میں نگراں کی رہنمائی اور اساتذہ کرام اور دوست واحباب کے تعاون کی بھی ضرورت ہوتی ہے جس سے مقالہ پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ میں اپنے مشفق نگراں ڈاکٹر اے۔ آر منظر صاحب کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے دوران تحقیق میری مدد کی اور مجھے مفید مشوروں سے نوازا اور میری حوصلہ افزائی بھی کی۔ میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر سید فضل اللہ مکرم اور ڈی۔ آر۔ سی ممبران ڈاکٹر عرشیہ جبین اور ڈاکٹر محمو کاشف کا شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے دوران تحقیق میری مدد کی اور مفید مشوروں سے نوازا۔ اور شعبۂ اردو کے دیگر اساتذۂ کرام کا بے حد شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے دوران تحقیق مجھے نیک مشوروں سے نوازا اور میری حوصلہ افزائی کی۔

شعبہ کے دفتری عملہ کا بھی شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے دوران تحقیق میرا تعاون کیا۔ اور اس درمیان میں نے جن لائبریریوں سے استفادہ کیا ان لائبریریوں کے ذمہ داران کا بھی بے حد شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے مواد کی تلاش کے سلسلے میں میری مدد کی۔ اور میں اپنے مشفق استاد پروفیسر یعقوب یاور سابق صدر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کا بھی صمیم قلب سے شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے مواد کی فراہمی کے ساتھ میری مدد کی اور وہ مجھے ہمیشہ نیک مشورے بھی دیتے رہتے ہیں۔ ان کی کرم فرمائیاں آج تک مجھے حاصل ہیں۔

میں تہہ دل سے اپنے والدین کا احسان منداور شکر گزار ہوں کہ جن کی دعاؤں اور قربانیوں کے سبب میں یہاں تک پہنچا اور ان کی حوصلہ افزائی سے اپنے مقالے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے بھائی بہنوں کا شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے دوران تحقیق میری ہمت افزائی کی اور ہر وقت میرا ساتھ دیا۔ آخر میں اپنے دوست واحباب میں محبوب عالم، اظہر جمال، محمد یعقوب، بہاری لال، سری سین

کمار بھارتی، رسینہ کے اور جموں وکشمیر سے تعلق رکھنے والے دوست واحباب میں گلزار احمد ماگرے، مدثر احمد گنائی، ریاض احمد نجار، محمد ارشد کسانہ، عبدالرزاق، سراج احمد، زبیر احمد کھٹانہ وغیرہ کا میں شکرگزار ہوں کہ جنھوں نے دوران تحقیق میری مدد کی۔ آخر میں، میں اپنی ہم کلاس ساتھی زنیرہ ابرار کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے دوران تحقیق کے ساتھ ایم۔فل۔ سے لے کر پی۔ایچ۔ڈی تک کے تمام تعلیمی مراحل میں میری مدد کیں اور میری حوصلہ افزائی کرتی رہیں۔

تاریخ:..............................

اطیع اللہ

پی ایچ۔ڈی ریسرچ اسکالر

یونیورسٹی آف حیدرآباد

باب اول

یعقوب یاور: سوانح، شخصیت اور ادبی خدمات

سوانح

یعقوب یاور کے والد کا نام مطلوب علی خاں تھا جو ایک زمیندار کسان تھے دین سے خاصا لگاؤ ہونے کی وجہ سے انھیں دینی کتابوں کا مطالعہ کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ اپنے گھر میں دینی کتابوں کی لائبریری بنا رکھے تھے اور کچھ رسائل و جرائد بھی گھر پر منگواتے تھے جس میں رام پور کا رسالہ ''نور'' بھی تھا۔ مسلکاً یہ اسلامی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔

یعقوب یاور کی والدہ کا نام غوثیہ خانم تھا۔ یہ ایک نیک و گھریلو خاتون تھیں اور یعقوب یاور کی تعلیم و تربیت میں ان کا اہم کردار ہے یعقوب یاور کہتے ہیں:

> ''جب میں نے ہوش سنبھالا میری عمر تقریباً سات آٹھ سال کی رہی ہوگی تو میں نے گھر میں دیکھا کہ دینی کتابوں کا ایک انبار لگا ہے اور میرے والدین دینی کتابوں سے زیادہ لگاؤ رکھتے تھے اسی طرح میری بھی مذہبی کتابوں کی طرف دلچسپی بڑھی اور میرے ابو کی اس لائبریری میں علامہ اقبال کی کلیات بھی موجود تھی میں علامہ کے کلیات کوئی بار پڑھتا تھا۔ اس چھوٹی عمر میں شاعری کے معنی و مفہوم کو تو نہیں سمجھ پارہا تھا لیکن اچھا لگ رہا تھا شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے شکوہ جواب شکوہ زبانی یاد ہے۔'' [1]

پروفیسر یعقوب یاور کے گھر کا ماحول ادبی کم مذہبی زیادہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یعقوب یاور کو مذہبی

کتابوں کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔اس شوق نے مذہبی کتابوں اور اسلامی تاریخ کے مطالعے میں ان کے لئے مہمیز کا کام کیا۔بقول یعقوب یاور:

''میں والد صاحب کی جمع کردہ دینی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا جس کا مجھے بعد میں بہت فائدہ ہوا اور والد صاحب رام پور سے رسالہ ''نور'' منگواتے تھے اس کو میں بھی بہت ہی شوق سے پڑھتا تھا۔میری ادبی دلچسپی میں اس کا حصہ ضرور ہے۔'' 2

آبائی وطن:

یعقوب یاور کا آبائی وطن گاؤں ''کوٹ'' ہے جو اتر پردیش کے ضلع فتح پور میں ہے۔کوٹ کثیر آبادی والا ایک گاؤں ہے۔اس گاؤں کے اولین باشندوں کے بارے میں یعقوب یاور کی رائے ہے کہ غوری کا کوئی ایک سپاہی اپنی فوج سے الگ ہو گیا اور یہیں بس گیا تبھی سے وہی آبادی بڑھتی چلی گئی جو آج ککھر پٹھانوں کی بستی ہے۔

ولادت:

یعقوب یاور کی پیدائش 22/نومبر 1952 میں اتر پردیش کے موضع کوٹ ضلع فتح پور میں ہوئی۔سرکاری رکارڈ میں ان کی تاریخ پیدائش 16/اکتوبر 1952 درج ہے۔آپ کے والدین نے بڑے خلوص ومحبت سے آپ کا نام یعقوب علی خاں رکھا اور ادبی دنیا میں یعقوب یاور کے نام سے مشہور ہوئے۔اور یہی ان کا قلمی نام بھی ہے۔

تعلیم وتربیت:

پروفیسر یعقوب یاور کی ابتدائی تعلیم وتربیت والدین کی نگرانی میں گھر پر ہوئی۔انھوں نے بہت کم عمری ہی میں عربی واردو کی چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑھ لی تھی۔گھر پر دینی ماحول کی وجہ سے انھیں دینی کتابوں سے رغبت زیادہ ہو گئی تھی انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم کی شروعات عربی اور اردو کی کتابوں سے کیا،ان کے گاؤں میں درجہ چار تک کا ایسا مدرسہ تھا جہاں صبح میں عربی اردو کی کلاسیں چلتی تھیں جس میں انھوں نے بھی

اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ دو پہر کے بعد انگریزی کنوینٹ میں بھی وہ انگریزی اور ہندی پڑھنے جاتے تھے۔ یعقوب یاور بچپن میں تنہائی پسند اور ایک سنجیدہ قسم کے بچے تھے۔ ہم جولیوں سے الگ تھلگ رہا کرتے تھے۔ یعقوب یاور بتاتے ہیں:

''میں اپنے بچپن میں بہت ہی سنجیدہ قسم کا لڑکا تھا اور مجھے اس وقت تنہا رہنا اچھا لگتا تھا۔ میں صبح اٹھتا اور تیار ہو کر عربی پڑھنے کے لئے مدرسے میں چلا جاتا تھا۔ ہفتہ اور جمعہ کی چھوٹی میں میں گھر ہی پر دینی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا۔'' 3

اس طرح یعقوب یاور نے درجہ چار تک عربی اور اردو کی تعلیم مدرسے میں حاصل کی اور ساتھ ہی کنوینٹ میں کلاس چھ تک تعلیم حاصل کی۔ یعقوب یاور کی مڈل کلاس تک کی تعلیم گاؤں ''کوٹ'' کے بیسک پرائمری اسکول میں ہوئی۔ انھوں نے ہائی اسکول چودھری شیو سہائے انٹر کالج فتح پور یو پی بورڈ سے کیا۔ اور انٹر کی تعلیم مدھیہ پردیش بھوپال میں پرائیویٹ طریقے سے حاصل کی اس کے بعد انھوں نے بی۔اے، ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی سیفیہ کالج بھوپال سے کیا جو آج برکت اللہ یونیورسٹی کہلاتی ہے۔ آپ کے اردو اساتذہ میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی اور پروفیسر حیدر عباس رضوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ اپنے ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم کے بارے میں یعقوب یاور کہتے ہیں:

''میں نے اپنے گاؤں میں رہتے ہوئے ایک قریبی تعلیمی ادارے سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کر لیا تھا اور اس کے بعد مختلف وجوہات کی بنا پر میری تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ پھر کچھ عرصے بعد میری قسمت مجھے بھوپال لائی وہیں سے میں نے مراسلاتی کورس سے انٹر کیا اور اس کے بعد ریگولر طالب علم بن کر بی۔اے، ایم۔اے اور پی ایچ۔ڈی کیا۔'' 4

1974 میں جب یعقوب یاور نے بی۔اے میں داخلہ لیا تو اردو زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی، اقتصادیات اور سماجیات کو منتخب کیا۔ یعقوب یاور بی۔اے میں ریگولر طالب علم تو تھے لیکن کالج سے کوئی خاص تعلق نہیں رہا اور نہ ہی کالج کے اساتذہ سے ہی کیوں کہ یعقوب یاور اپنی گزر اوقات کے لیے دوران تعلیم

ملازمت بھی کرتے تھے۔اس کے بارے میں یعقوب یاور کہتے ہیں:

''بی۔اے کے دوران کالج سے اردو اساتذہ اور طلبہ سے تعلق نہ بنے کا سبب یہ تھا کہ صبح کی کالج اور میری ملازمت اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ میں کالج میں کچھ اضافی وقت دے سکوں چنانچہ ان دو سالوں میں کالج سے میرا تعلق بس کلاس روم ہی تک محدود تھا۔'' 5

ایم۔اے میں داخلہ لینے کے بعد جب وہ باقاعدگی سے کالج جانے لگے تب ان کی ملاقات پروفیسر عبدالقوی دسنوی سے ہوئی ان کے کہنے پر انھوں نے ایم۔اے میں اردو لیا اس واقعہ کے بارے میں یعقوب یاور لکھتے ہیں:

'' بی۔اے کے نتائج جب میرے ہاتھ میں آئے تو مجھے معلوم ہوا کہ میں نے سب سے زیادہ نمبر اردو میں اور سب سے کم نمبر اقتصادیات میں حاصل کیے ہیں لیکن اس وقت میں جس نوع کی ملازمت میں تھا وہاں کچھ بہتری کے امکانات مجھے صرف اقتصادیات ہی میں ایم۔اے کرنے کے لیے مجبور کررہے تھے۔ان دنوں مجھے کوئی ایسا شخص بھی میسر نہیں تھا جو مجھے مناسب مشورہ دے سکتا۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت کہ اگر میں نے اقتصادیات میں ایم۔اے کر لیا تو مجھے اپنے موجودہ عہدے میں ترقی مل جائے گی، بغیر زیادہ غور کیے داخلہ لے لیا۔جس دن میں نے فیس جمع کی تھی اسی دن اتفاق سے شعبۂ اردو میں چلا گیا تھا۔ وہاں قوی صاحب (پروفیسر عبدالقوی دسنوی) موجود تھے گذشتہ دو برسوں کے دوران حالانکہ ان سے کبھی میری راست گفتگو نہیں ہوئی تھی لیکن میں ان کی شخصیت سے متاثر تھا اور ان کے کارناموں سے بڑی حد تک واقف ہو چکا تھا انھوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا میں نے ایم۔اے میں داخلہ لے لیا ہے،تو میں نے جواب میں کہا کہ ہاں لیکن اردو میں نہیں اقتصادیات میں انھوں نے پوچھا کہ میں نے ایسا کیوں کیا اور مجھ سے میری مارک شیٹ لے لی۔ تھوڑی دیر تک میرے نمبر دیکھنے کے بعد انھوں نے کہا کہ میں نے غلطی کی ہے مجھے

اردو میں داخلہ لینا چاہیے تھا کیوں کہ میں نے سب سے زیادہ نمبر اردو ہی میں حاصل کیے ہیں مجھے جواب دینے میں کچھ تکلف ہوا تو انھوں نے کہا کہ اردو زبان وادب میں بھی کسی کا مستقبل سنوارنے کی پوری اہلیت ہے، بشرطیکہ پوری توجہ سے اس کے اسرار ورموز کو سمجھا جائے۔'' 6

اس طرح یعقوب یاور پوری طرح اردو سے جڑ گئے اور 1976 میں اردو سے ایم۔اے کرنے کے بعد 1990 میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی نگرانی میں ''ترقی پسند تحریک اردو شاعری'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ سپرد قلم کر کے بھوپال یونیورسٹی سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور پروفیسر گیان چند جین ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کے ممتحن تھے۔

ملازمت:

یعقوب یاور کی ابتدائی زندگی بہت ہی پیچ وخم اور صعوبتوں میں گزری۔ یعقوب یاور نے ہائی اسکول کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد گھر کی معاشی تنگ دستی کو دیکھتے ہوئے تعلیم کو ترک کر کے اٹھارہ برس کی عمر میں چند ناگزیر احساس کی بنا پر گھر کو خیرآباد کہہ دیا اور مختلف شہروں میں ذریعہ معاش کے لئے گھومتے پھرتے رہے۔ یعقوب یار کہتے ہیں:

''میں گاؤں سے بھاگ کر کانپور آیا تو اسٹیشن پر ایک ٹرین کھڑی ہوتی تھی بلا سوچے سمجھے میں ٹرین پہ سوار ہو گیا۔ میرے پاس نہ تو ٹکٹ تھا اور نا ہی ٹرین کے ٹکٹ کے بارے میں معلومات تھی۔ ٹرین چل دی آخر کار میں رات کے وقت ایک ایسے اسٹیشن پر پہنچا جس کا نام جھانسی تھا۔ پھر اس اسٹیشن پر بھی ایک ٹرین کھڑی تھی جو شاید چھپرا اکسپریس تھی میں اس پر سوار ہوا وہ ٹرین چلتے چلتے مجھے حیدرآباد کے نام پلّی کے اسٹیشن پر پہنچا دی۔ میں وہاں اترا دل میں یہ بات آئی کہ میں اب یہاں سے کہاں جاؤں۔ اتفاق سے اسٹیشن پر ایک متعارف شخص دکھائی دیے۔ ان کی نظر میرے اوپر پڑی اور کہا، یعقوب کیا حال چال ہے میرے دل میں وہیں یہ خیال آیا کہ شاید یہ مجھ سے

پوچھیں گے کہ یہاں تمہارا کیسے آنا ہوا لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ رسماً میں نے بھی کہہ دیا ہاں سب ٹھیک ہے۔ میں اسٹیشن کے باہر نکلا کچھ دیر ادھر ادھر بھٹکا میرے پاس جو کچھ پیسے تھے وہ ختم ہو گئے تھے،، بالآخر میں حیدر آباد میں آونلا تیل کی کمپنی میں کام کرنے لگا۔'' 7

یعقوب یاور حیدر آباد میں دو سال تک بطورِ ملازم آنولا تیل کی کمپنی میں رہے جہاں تیل کے باٹل پر لیبل لگاتے تھے اور ان کو تقریباً ماہانہ اسی (80) سے نوے (90) روپیہ ملتا تھا۔ ان کے لیے یہ تنخواہ بہت کم تھی اس لیے وہاں سے گھر آنے کے لیے سوچا اور پھر کانپور کے لیے ٹکٹ نکالا کسی بنا پر وہ بھوپال اسٹیشن پر رک گئے۔ وہاں سے بھوپال میں اپنے بچپن کے دوست جاوید کے گھر گئے اور یہیں بھوپال میں پھر سے ملازمت کا آغاز کیا چھوٹی موٹی نوکری کر کے اپنی تعلیم اور معمولات زندگی کے اخراجات کا بندوبست کرتے رہے۔ یہاں پر ایک پرائیویٹ کارخانے میں کلرک کی حیثیت سے ملازمت کی۔ بھوپال پہنچنے کے بارے میں یعقوب یاور لکھتے ہیں:

''جب میری ٹرین بھوپال پہنچی تھی اس وقت نصب شب گزر چکی تھی میری عمر اس وقت بیس برس کے آس پاس تھی اسٹیشن سے باہر نکلنے کے بعد جب تانگے والوں کی بھیڑ میرے سر پر مسلط تھی مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ میری منزل آخر ہے کیا اور وہ یہاں سے کتنی دور ہے دوران سفر مجھے بس بھوپال میں رہنے والے ایک بچے کا نام یاد آیا تھا جو ہمارے عزیزوں میں سے ہی ایک تھا جو تقریباً آٹھ دس برس کی عمر میں دس برس پہلے کبھی ہمارے گاؤں آیا تھا اس کا نام جاوید تھا جب معمر تانگے والے کا اسرار بڑھا تو میں نے وہی نام لے لیا۔ تانگے والے نے مجھ سے کہا وئی جاوید نا جو کرکٹ کھیلتا ہے۔ میں یہ سب نہیں جانتا تھا لیکن میں نے جواب میں ہاں کہہ دیا تھا اور وہ آدھی رات کے وقت مجھے اپنے تانگے پر بٹھا کر شاہ جہاں آباد کے کسی جاوید کے گھر لے جا رہا تھا جو کرکٹ کھیلتا تھا وہاں پہنچ کر میں نے ڈرتے ڈرتے دروازے پر دستک دی تو جو نوجوان باہر آیا تھا اسے نہ میں پہچان سکا تھا اور نہ وہ مجھے لیکن کسی غیبی مدد کے

تحت تھا یہ وہی جاوید جس کی مجھے تلاش تھی ہمیں ملے دس برس کا وقت بیت چکا تھا اور پھر ہماری صرف ایک بار ہی ملاقات ہوئی تھی یہ جاوید اب بچہ نہیں تھا جوان ہو چکا تھا میں نے جب اسے اپنے گاؤں کا نام بتایا تو اس نے مجھے اندر بلایا تعارف کی ساری رسمیں کھانا کھانے اور میرے سونے کا انتظام کیے جانے کے بعد طے ہوئیں۔ اس کے بعد میں اس بوڑھے تانگے والے کے خلوص جس نے آدھے گھنٹے کی ملاقات میں یہ تک بتا دیا تھا کہ اس کی دو بیویاں اور تین بچے ہیں اور اپنے میز بانوں کی محبتوں کو دل میں بسائے آرام سے سو گیا تھا یہ خلوص و اخوت سے پر سرزمین بھوپال میں میری پہلی رات تھی۔ میرے ان عارضی میز بانوں نے اگلی صبح ہی میرے آنے کی اطلاع میرے ماموں لائق علی خاں کو دے دی تھی جو اس وقت ٹی ٹی نگر کے ایک سرکاری رہائش گاہ میں رہا کرتے تھے اور جو اس وقت شاہ جہاں آباد کی باب عالی عمارت میں واقع چیف کنزرویٹر آف فاریسٹس کے دفتر میں اکاونٹس آفیسر تھے وہ شام میں دفتر سے واپسی پر آئے تھے اور مجھے اپنے ساتھ لے کر اپنے گھر چلے گئے تھے تقریباً میں ایک ماہ ان کے ساتھ رہا اس کے بعد اپنے طور پر اپنے مستقبل کو سنوارنے میں مصروف ہو گیا۔'' 8

یعقوب یاور بھوپال میں ایک لمبے عرصے تک مقیم رہے اور وہاں قیام کے دوران مختلف ملازمتیں کیں ذریعہ معاش کے ساتھ انھوں نے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی۔ جن کے یہاں یہ کام کرتے تھے انکے توسط سے اپنی اعلیٰ تعلیم کا آغاز کیا اس کے بارے میں یعقوب یاور کہتے ہیں:

''کل سیفیہ سے جا کر میری بیٹی کے لیے ایک فارم لے آنا میں ان کا چہرہ دیکھتا رہا پھر صبح بلا سوچے سمجھے کالج گیا اور وہاں سے انٹر مراسلاتی کا دو فارم لے لیا۔ جب گھر آیا تو مالک نے مجھ سے پوچھا کہ ایک فارم اور کس کے لئے ہے۔ میں کچھ دیر خاموش رہا اپنی طرف سر ہلا کر اشارہ کیا تو انھوں نے کہا کہ اچھا تو پڑھنا چاہتے ہو تو میں نے کہا ہاں۔ لیکن اس کے فیس لئے پیسہ میرے پاس نہیں تھا۔ مالک نے فوراً یہ کہہ دیا کہ فارم بھر لو اور فیس کا پیسہ مجھ سے لے کر جمع کر دو پھر اپنی تنخواہ سے تھوڑا تھوڑا کر کے کٹواتے

رہنا۔'' 9؎

اس طرح تعلیم کے مکمل ہونے تک مختلف قسم کی پرائیویٹ ملازمتوں سے یعقوب یاور منسلک رہے۔ پی ایچ۔ڈی مکمل کرنے کے فوراً بعد ان کی تقرری بنارس کے بسنت کالج برائے خواتین (BHU) راج گھاٹ فورٹ میں ہوئی۔ اس کالج میں انھوں نے 1990 تا 2008 تدریسی فرائض انجام دیئے۔ یعقوب یاور لکھتے ہیں:

''ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری پر میں نے پی ایچ ڈی کر لی خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ڈگری ملنے کے پہلے ہی میرا تقرر بنارس ہندو یونیورسٹی سے متعلق ایک گرلس کالج میں بحیثیت استاد ہو گیا۔ اور مجھے اس شہر بے مثال (بھوپال) کو چھوڑنا پڑا۔'' 10؎

بسنت کالج سے قبل بحیثیت استاد ان کی تقرری رائے پور کے درگا کالج کے شعبہ اردو میں بھی ہوئی تھی لیکن یعقوب یاور کے کچھ بدخواہوں نے ان کا نام یہاں سے کٹوا دیا تھا۔ یعقوب یاور اس تعلق سے لکھتے ہیں:

''جب میرا تقرر رائے پور کے درگا کالج میں یہاں قائم ہونے والے نئے شعبہ اردو میں ہوا۔ اس انٹرویو میں بیرونی ماہر موضوع کی حیثیت سے پروفیسر آفاق احمد کو مدعو کیا گیا تھا۔ جنھوں نے اس عہدے کے لیے میرا انتخاب کیا تھا۔ بس یہیں میرا واسطہ بھوپال میں اپنے ان بدخواہوں سے پڑا جن کو میں ابھی تک نہیں پہچان سکا تھا اب ان کے نام لے کر انھیں اور خود کو کیا شرمندہ کروں لیکن ان تمام سرگرمیوں نے مجھے ڈپریشن میں مبتلا کر دیا تھا اور مجھے باقاعدہ ڈاکٹر انصاف سے اپنا علاج کرانا پڑا تھا۔ اسی بیچ جب مجھے بنارس کے ایک گرلس کالج سے انٹریو کا کال لیٹر ملا تو کمال رازداری سے کام لیتے ہوئے دوست تو دور اپنے گھر کے لوگوں تک کو اس کی بھنک نہ لگنے دی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ بنارس میں ڈاکٹر حنیف نقوی صاحب ہیں جن کا بھوپال سے گہرا تعلق ہے۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں بھوپال کے میرے یہ بدخواہ انھیں بھی اپنی سازش میں شامل کر کے میرا نقصان نہ کر دیں۔ چنانچہ انٹر

ویو دینے کے لیے میں احباب سے حیدرآباد جانے کی بات کر کے بنارس پہنچا تھا۔ خدا کا شکر کہ بادمخالف کے شدید جھونکوں کے باوجود اس سمندر میں میرا بیڑا پار لگا اور بنارس کے وسنت کالج برائے خواتین میں میرا تقرر ہوگیا۔ یہاں میرا انٹرویو لینے والے ماہرین میں لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی اور بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے پروفیسر حکم چند نیر شامل تھے۔'' 11ء

2008 میں شعبہ اردو بنارس ہندو یونیوسٹی میں اسوسی ایٹ پروفیسر کے حیثیت سے یعقوب یاور منسلک ہوئے وہیں پروفیسر ہوئے اور صدر شعبہ کی حیثیت سے بھی اپنی ذمہ داری نبھائی ہے۔ 2017 میں یہ شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی سے ریٹائر ہو گئے۔

شادی:

یعقوب یاور کی شادی حیدرآباد دکن گولکنڈہ میں ہوئی ان کے اہلیہ کا نام ''پروین'' تھا۔ جو بہت ہی متقی اور پرہیز گار عورت تھیں۔ ان کی اہلیہ کا آبائی وطن بھی کوٹ ہے ان کے والد، والدہ کبھی کبھار حیدرآباد سے کوٹ جاتے تھے۔ اسی دوران یعقوب یاور کی والدہ کی ملاقات ان کے اہلیہ کے والدہ سے ہوئی اور رشتہ طے ہو گیا۔ اس طرح یعقوب یاور کی شادی پروین سے ہوئی۔ یعقوب یاور نے اپنی شریک حیات کو شادی سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کے والدین نے ان کے لیے جس لڑکی کا انتخاب کیا تھا وہ ایک سیدھی سادی خوبصورت اور نیک سیرت خاتون تھیں۔ یعقوب یاور اپنی شادی کے بارے میں کہتے ہیں:

''شادی سے پہلے میں نہ اپنے اہلیہ کو جانتا تھا اور نہ ہی ان کے گھر والے مجھے جانتے تھے۔ میرے والدین میری شادی طے کئے اور میں نے بلا چوں چرا قبول کیا۔'' 12ء

دونوں کی ازدواجی زندگی بہت خوشگوار تھی۔ ان کی اہلیہ ان کا بے حد خیال رکھتی تھیں دونوں ایک دوسرے کے ساتھ پیار و محبت سے رہتے تھے۔ ان کی اہلیہ محترمہ پروین کا انتقال 7/اپریل 2021ء کو بنارس میں ہوا۔

اولاد:

یعقوب یاور کے تین اولاد ہیں ایک بیٹا اور دو بیٹی، بیٹے کا نام شہباز علی خاں ہے اور یہ پوسٹ گریجویٹ ہیں اور یہ گھریلو کام کے ساتھ بچوں کو ٹیوشن پڑھاتے ہیں۔ بڑی بیٹی کا نام ناہید فاطمہ ہے جو اردو میں بنارس ہندو یونیوسٹی سے پی ایچ۔ڈی کی ہیں اور فی الوقت اردو سے پی ڈی ایف کر رہی ہیں۔اور دوسری بیٹی کا نام ثنا فاطمہ ہے۔جو بی ایس سی کی ہیں۔

ادبی سفر:

یعقوب یاور اپنے ادبی سفر کا آغاز زمانہ طالب علمی ہی میں کر چکے تھے۔انھیں پڑھنا لکھنا اور شاعری کرنا جنون کی حد تک پسند تھا۔ درجہ آٹھ سے ہی انھوں نے شاعری کرنا شروع کر دیا تھا۔لیکن اس وقت اس میں کوئی پختگی نہیں تھی یعقوب یاور کہتے ہیں:

> ''ایک بار ہمارے گاؤں میں مجلس منعقد ہوئی تھی اور اس میں بچے حمد،نعت اور نظم سنا رہے تھے اور اسی وقت ہمارے چچا جرمن سے گھر آئے ہوئے تھے۔اس محفل میں میں نے اپنی تک بندی کی ہوئی ایک نظم سنائی جس پر خوش ہو کر میرے چچا نے مجھے ایک روپے دیئے تھے اور وہیں کان میں یہی بھی کہا تھا کہ میاں شعر و شاعری سے اپنے آپ کو الگ رکھو کیوں کہ شعر و شاعری سے زندگی سنورنے والی نہیں ہے۔'' 13؎

باضابطہ طور پر ان کے ادبی سفر کی ابتداء ایم۔اے میں شاعری سے ہوئی۔ جب وہ ایم۔اے کے طالب علم تھے تو شعبہ اردو کی جانب سے عبدالقوی دسنوی کی رہنمائی میں ادبی پروگرام منعقد ہوتا تھا، جس میں طلبہ اپنی تخلیقات پیش کرتے اور داد و تحسین وصول کرتے تھے۔ وہ اپنے ادبی سفر کے آغاز کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''ایم۔اے میں داخلہ لینے کے بعد ہی یہاں کے شعبۂ اردو میں میرے ادبی ذوق کی آبیاری کا کام شروع ہوا۔ یہاں ہر سنیچر کو پابندی سے ایک ادبی نشست منعقد کی جاتی تھی جس میں طلبا اپنی مختلف تحریر پیش کیا کرتے تھے اور ہر نشست کے آخر میں اساتذہ

ان تحریروں پر تبصرہ کر کے ان کی رہنمائی کا کام انجام دیا کرتے تھے اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں ان نشستوں میں کچھ پیش کرنے کی صلاحیت سے عاری ہوں۔ ایم۔ اے سال آخر میں اس وقت مسعود ہاشمی ہوا کرتے تھے جو تقریباً ہر نشست میں اپنی کوئی غزل ترنم سے سنایا کرتے تھے۔ شاعری سے تھوڑی بہت دلچسپی مجھے پہلے سے بھی تھی میرا بھی جی چاہتا تھا کہ میں اس نشست میں کوئی غزل پڑھوں اور لوگ میری تعریف کریں۔ چنانچہ میں نے ایک غزل کہی اور اس وقت شعبۂ اردو سے منسلک استاد خالد محمود صاحب کو دکھا کر دریافت کیا کہ کیا میں یہ غزل اگلی نشست میں پڑھ سکتا ہوں انھوں نے کچھ تکلف سے مجھے پڑھنے کی اجازت کے ساتھ یہ مشورہ بھی دیا کہ میں اپنی غزلیں کسی استاد کو دکھا لیا کروں۔ مجھے بھلا کون استاد میسر تھا جسے میں دکھاتا چنانچہ میں سید جھے مسعود ہاشمی کے پاس گیا اور انھیں اپنی یہ غزل دکھائی انھوں نے اس میں کچھ ترمیم و تنسیخ کی اور شعبۂ اردو کی اگلی نشست میں میں نے اسے ترنم سے پیش کیا لیکن میری غزل پر لوگوں کا ردعمل خاطر خواہ نہیں تھا۔ مروتاً چند بجھی بجھی سی آوازیں لوگوں کے منھ سے نکلیں جنھیں میں داد بالکل نہیں سمجھ سکتا تھا لیکن میں نے حوصلہ نہیں ہارا اور ایک غزل اور کہی اور اگلی نشست میں اسے سنایا۔ اس بار ساتھیوں کا ردعمل پہلے سے کچھ بہتر تھا پھر یہ سلسلہ چل پڑا اور تقریباً ہر نشست میں میں نے کچھ نہ کچھ سنانا شروع کر دیا۔'' 14؎

اس طرح انکی تخلیقی سفر کا آغاز ہوا۔ ان کی پہلی غزل ماہنامہ ''تعمیر'' ہریانہ میں شائع ہوئی تھی۔ زمانہ طالب علمی میں جرمن زبان کے متعدد افسانوں کے ترجمے کیے جو ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی میں شائع ہوتے رہے۔ یعقوب یاور کا پہلا ترجمہ کردہ ناول جرمن ناول نگار ہرمن ہیس کا ناول ''سدھارتھ'' ہے جو 1982 کو ترجمے کی شکل میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کے بعد کئی ناولوں کے ترجمے کیے جو نسیم بک ڈپو لکھنو سے شائع ہوئے۔

یعقوب یاور نے تمام تراجم انگریزی زبان سے کیے ان کے ترجمہ کردہ ناولوں سے مغربی ادب کے ناولوں کے مطالعہ کا ذوق وشوق رکھنے والے اردو قارئین مستفید ہو رہے ہیں۔ یعقوب یاور نے مشرقی

ادب کے ساتھ ساتھ مغربی ادب کا بھی مطالعہ نہایت ہی گہرائی و گیرائی سے کیا ہے۔مشرف عالم ذوقی ان کے ترجمے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''تیرتھ رام فیروز پوری اور مظہرالحق علوی کے بعد مغربی ادب کے تراجم کی باگ ڈور یعقوب یاور نے بھی سنبھالی ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ یقیناً وہ ایک بڑا کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔'' 15

ناول کے علاوہ یعقوب یاور نے دیگر علمی وادبی کتابوں کے بھی ترجمے کیے ہیں۔ان کے ترجمے میں روانی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔منشائے مصنف کا خیال رکھتے ہوئے انھوں نے ترجمے کے تمام فنی لوازمات کو اپنے ترجمے میں برتا ہے۔ان کے ترجمے کے مطالعے سے ترجمے کے بجائے تخلیق کا گمان ہوتا ہے۔ترجمے کی طرف یعقوب یاور کو رغبت کس طرح سے ہوئی اس کے بارے میں یہ بتاتے ہیں:

''ہوا یوں تھا کہ میرے ایک ہم جماعت جناب حبیب احمد ایک بار اپنے کسی دوست کو تحفے میں دینے کے لیے سدھارتھ خرید کر لائے۔ میں نے اسے پڑھ ڈالا۔ دوسرے دن میں نے انھیں اس ناول کی کہانی بیان کی تو انھوں نے کہا کہ کاش میں اسے خود پڑھ پاتا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے، میں اسے اردو میں منتقل کر دیتا ہوں۔ چنانچہ صرف اپنے دوست کے پڑھنے کے لیے میں دو ہفتے میں اس ناول کو اردو میں منتقل کر دیا۔ اس دوران نسیم بکڈ پو لکھنو کے مالک نسیم انہونوی صاحب بھوپال آئے ہوئے تھے۔ ان سے ملاقات کے وقت ناول کا ترجمہ شدہ مسودہ میرے ہاتھ میں تھا انھوں نے مجھ سے لے کر اسے دیکھا اور کہا کہ اس پر نظر ثانی کر لو میں اسے چھاپ دوں گا۔ میرے لیے تو یہ اندھے کو دو آنکھیں مل جانے جیسا تھا۔۔۔۔۔ میں نے اپنے ترجمے پر نظر ثانی کی اور اسے تسیم صاحب کے سپرد کر دیا اور یہ چھپ گیا۔ نسیم انہونوی صاحب چاہتے تھے کہ میں ان کے ادارے کے لیے مزید ترجمے کروں، چنانچہ یہ سلسلہ کافی عرصے تک جاری رہا۔'' 16

ادبی خدمات:

تحقیق وتنقید

1۔امروز۔نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ یوپی،1990

2۔ترقی پسند تحریک اوراردوشاعری۔ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ۔1997

3۔تحریک وتعبیر۔بھارت آفسیٹ گلی قاسم جان دہلی،1999

4۔تفکیر وتفہیم۔بھارت آفسیٹ گلی قاسم جان دہلی،2003

5۔مرغزارافکارجلداول۔عرشیہ پبلیکیشنز نئی دہلی۔2011

6۔افہام۔عرشیہ پبلیکیشنز نئی دہلی۔2015

7۔آغا حشر کاشمیری۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی۔2016

8۔احتساب۔سٹی بک پوائنٹ،کراچی،پاکستان۔2018

9۔مرغزارافکارجلددوم۔عرشیہ پبلیکیشنز،دہلی۔2021

ترتیب:

10۔کلیات آغا حشر کاشمیری جلداول۔قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان،نئی دہلی۔2004

11۔کلیات آغا حشر کاشمیری جلددوم۔قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان،نئی دہلی۔2004

12۔کلیات آغا حشر کاشمیری جلدسوم۔قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان،نئی دہلی۔2004

13۔کلیات آغا حشر کاشمیری جلدچہارم۔قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان،نئی دہلی۔2005

14۔کلیات آغا حشر کاشمیری جلدپنجم۔قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان،نئی دہلی۔2005

15۔کلیات آغا حشر کاشمیری جلدششم۔قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان،نئی دہلی۔2005

16۔کلیات آغا حشر کاشمیری جلدہفتم۔قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان،نئی دہلی۔2005

17۔کلیات آغا حشر کاشمیری جلدہشتم۔قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان،نئی دہلی۔2016

18۔مکتوبات مسرور مسلم۔عرشیہ پبلیکیشنز،نئی دہلی۔2020

تخلیق (شاعری)

19۔الف۔نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ فیض آباد۔یوپی1988

20۔قلم گوید۔بھارت آفسیٹ،دہلی2000

21۔بارزیاں۔عرشیہ پبلیکیشنز،دہلی2020

ناول

22۔دل من۔بھارت آفسیٹ گلی قاسم جان،دہلی1998

23۔عزازیل۔بھارت آفسیٹ گلی قاسم جان،دہلی 2001

24۔جہاد۔ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس،دہلی۔2009

25۔سنگ گراں ہے زندگی۔سٹی بک پوائنٹ،کراچی،پاکستان۔2020

26۔دھول دیپ۔عرشیہ پبلیکیشنز،نئی دہلی۔2020

تراجم (ناول)

27۔سدھارتھ۔نسیم بک پوائنٹ،لکھنؤ۔1982

28۔رقص اجل۔نسیم بک پوائنٹ،لکھنؤ۔1985

29۔سینٹ پیٹرس برگ۔سٹی بک پوائنٹ،کراچی،پاکستان۔2018

30۔کمند ہوا۔نسیم بک پوائنٹ،لکھنؤ۔1985

31۔طاق نسیاں۔نسیم بک پوائنٹ،لکھنؤ۔1986

32۔شب گزیدہ۔نسیم بک پوائنٹ،لکھنؤ۔1987

33۔کرسمس۔سٹی بک پوائنٹ،کراچی،پاکستان۔2018

34۔درہ خیبر کے اس پار۔نسیم بک پوائنٹ،لکھنؤ۔1988

35۔وادی پنج شیر۔سٹی بک پوائنٹ کراچی پاکستان۔2018

36۔زہراب نیل۔نسیم بک پوائنٹ،لکھنؤ۔1989

37۔گاڈ فادر۔سٹی بک پوائنٹ،کراچی، پاکستان۔2018

38۔ڈاکٹر ژواگو۔سٹی بک پوائنٹ،کراچی، پاکستان۔2000

39۔تتلی گھر۔بھارت آفسیٹ گلی قاسم جان دہلی،2000

40۔پاپیلاں۔بھارت آفسیٹ گلی قاسم جان دہلی،2007

41۔میلوہائی باد تجارت۔بھارت آفسیٹ گلی قاسم جان دہلی،2016

42۔اورینٹ ایکسپریس۔سٹی بک پوائنٹ،کراچی، پاکستان۔2019

دیگر تراجم

43۔سردار ولبھ بھائی پٹیل۔پبلیکیشن ڈیویژن،نئی دہلی۔1998

44۔سیکھنے کا فن۔کرشن مورتی فاونڈیشن، وارانسی۔1999

45۔کتاب حیات۔کرشن مورتی فاونڈیشن، وارانسی۔1999

46۔تاریخ ساز ایجادات۔پبلیکیشن ڈیویژن،نئی دہلی۔2002

47۔مکالمات جے کرشن مورتی۔سٹی بک پوائنٹ،کراچی، پاکستان۔2020

48۔تہذیب کا سوال کرشن مورتی فاونڈیشن، وارانسی۔2021

سمیناروں وکانفرنسوں میں شرکت:

یعقوب یاور نے سمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کی غرض سے ہندوستان میں جن علاقوں کا سفر کیا ہے ان میں دہلی، لکھنؤ حیدر آباد بھوپال، گجرات، جموں وکشمیر مہاراشٹرا، چنئی وغیرہ ہیں۔دہلی کا سفر ادبی مصروفیت کے سلسلے میں انھوں نے کئی بار کیا ہے۔ملک کے تقریباً تمام شہروں کے اداروں اور جامعات میں انھیں مقالہ پڑھنے کے لیے مدعو کیا جاتا ہے۔ہندوستان کے علاوہ بیرونِ ملک میں بھی سمینار و کانفرنس کی

غرض سے انھوں نے ادبی سفر کیا۔ 2016 میں یہ ترکی گئے ہوئے تھے جہاں انھوں نے اردو کے صورتِ حال پر مقالہ پڑھا اور اس سمینار کی صدارت بھی کی۔ کچھ کانفرنسوں اور سیمیناروں کی تفصیلات اس طرح سے ہیں:

اسماء مضامین	مقام	سن اشاعت
1۔ اردو یونیورسٹی خواب اور حقیقت	دہلی یونیورسٹی، دہلی	1994
2۔ ترجمے کا فن اور مسائل	حمیدیہ پی جی کالج بھوپال	1995
3۔ لکھنؤ کا ایک اور نول کشور نسیم انہونوی	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ	1996
4۔ آغا حشر کا شعری شناخت نامہ	بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس	1996
5۔ غالب شناسی کی روایت	ندوۃ العلماء لکھنؤ	1998
6۔ عصری شعریات میں تاثیر کا فقدان	ادارۂ ادبیات اسلامیہ، دہلی	1998
7۔ دلاور فگار کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری	دلاور فگار اکیڈمی بھداؤں، یوپی	1999
8۔ مدھیہ پردیش میں اردو غزل	مادھو کالج اجین	2001
9۔ وامق جونپوری کا انداز نظم گوئی	دہلی اردو اکیڈمی، دہلی	2001
10۔ انیسویں صدی کی ایک اہم اصلاحی تحریک آریہ سماج۔ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی		2003
11۔ انیسویں صدی کے چند لازوال مزاحیہ کردار	دہلی اردو اکیڈمی، دہلی	2004
12۔ آغا حشر کے طبع زاد اردو ڈرامے	دہلی اردو اکیڈمی، دہلی	2004
13۔ ترقی پسند تحریک اور اردو غزل	غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی	2012
14۔ ابو محمد سحر کی شاعری	اسوسی ایشن آف انڈین مسلم، ایم پی	2012
15۔ اردو کے اہم خود نوشت سوانح نگار	دہلی اردو اکیڈمی، دہلی	2015
16۔ جاں نثار اختر کا کردار	پی جی کالج الہ آباد	2016

17۔ادب تنقید اور تحقیق کا باہمی رشتہ	انقرہ یونیورسٹی، ترکی	2016
18۔سرسید ہندو مسلم یکجہتی	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد	2018
19۔اردو اور دیگر زبانیں	مدھیہ پردیش اردو اکادمی	2021

مندرجہ بالا سیمیناروں کے علاوہ مختلف مضامین پر مختلف مقامات پر سیمینار پڑھے ہیں جس میں ادبی وسماجی وشخصی مضامین شامل ہیں تاہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔

صحافت:

بحیثیت صحافی بھی یعقوب یاور نے اپنی خدمات انجام دیئے ہیں۔ جب وہ بھوپال میں تھے تو روزنامہ ''افکار'' میں سلسلہ وار کالم لکھتے تھے۔اس میں ان کا کالم سیاسی، تعلیمی اور معاشرتی ہوا کرتا تھا اور ان کالموں میں شہر بھوپال کے تعلق سے بہت ساری معلومات ہوا کرتی تھیں ان صحافتی کالموں میں یعقوب یاور نے اپنے صحافتی جوہر دکھائے ہیں۔ان کا پہلا کالم 9 فروری 1988 کو ''اردو اور ہندی'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔اور ان کے آخری کالم کا نام ''امتحان اور نقل'' تھا۔اور ان تمام کالموں کو اپنی کتاب ''امروز'' میں اِکٹھا کیا ہے۔اس کی اشاعت 1991 میں ہوئی ہے۔

امروز:

اس مجموعے میں انکے وہ کالم جمع ہیں جو روز نامہ ' افکار' بھوپال میں شائع ہوتے تھے۔تمام کالموں کے عنوان درج ذیل ہیں:

1۔اردو اور ہندی	2۔ شاعر اور غیر شاعر
3۔ رنگ اور خوشبو	4۔ بھوپالی اور غیر بھوپالی
5۔ عاشق اردو، ایم عرفان	6۔غالب اور بھوپال
7۔ اکیسویں صدی اور دوردرشن	8۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی
9۔منشی نول کشور	10۔ورق ورق (مجموعہ کلام کلیم سرونجی)

11۔ ''تمس''اور ہونی انہونی

12۔ ابوالکام آزاد

13۔ ہندوستان اور بھارت

14۔ اقلیت اور احساس کمتری

15۔ اکثریت اور احساس برتری

16۔ ابوالکام آزاد اور ان کی وصیت

17۔ ٹی وی اور دلّی

18۔ بھوپال اور ہندو مسلم اتحاد

19۔ سنگ اور سنگینیں

20۔ گھریلو لائبریری اور کتابوں کا شوق

21۔ فراق گورکھپوری

22۔ سیاسی اور تہذیبی قومیت

23۔ مٹھی بھر آکاش

24۔ بھوپال اور ٹیمپو تہذیب

25۔ شاعر اور شاعری

26۔ میں اور سیفیہ کالج

27۔ اخلاقی زوال

28۔ اقبال اور ادھین

29۔ محنت، ذہانت اور سرمایہ

30۔ کرکٹ بخار

31۔ خان شاکر علی خان

32۔ اردو اور اسلام

33۔ شاعری اور سماج

34۔ عصر حاضر اور قدروں کا بحران

35۔ خاندانی اور منصوبہ بند

36۔ جمہوریت اور مذہب

37۔ ایران عراق جنگ

38۔ موجیں (مجموعہ کلام سلام)

39۔ پرانا اور نیا بھوپال

40۔ کمرشیل فلم اور ویڈیو

41۔ پولس کا منوبل

42۔ انگریزی ذریعہ تعلیم

43۔ تجارت اور ملازمت

44۔ ہمارے رہائشی منصوبے اور غریب عوام

45۔ امتحان اور نقل

ان کے یہ مضامین دیوناگری رسم الخط میں نکلنے والے اردو اخبار روز نامہ بھوپال میں 9 فروری 1988 سے لے کر 31 مارچ 1988 میں شائع ہوتے رہے۔ ان کے یہ مضامین مختلف النوع موضوعات

پر مشتمل ہیں جس میں سیاسی، سماجی، اصلاحی اور ادبی سب شامل ہیں۔ ان کا ایک مضمون بھوپالی اور غیر بھوپالی میں مقامی اور غیر مقامی کے روداد کو پیش کیا گیا ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مقامی اور غیر مقامی کا جھگڑا ہے اس سے کبھی کبھی برے اثرات بھی مرتب ہو جاتے ہیں۔ یعقوب یاور لکھتے ہیں:

> ''مقامی اور غیر مقامی کا جذبہ بھوپال میں بھی پایا جاتا ہے۔ شاعروں کی محفل ہو یا سیاست کا میدان یا ترقی کے دوسرے مراحل، ایسی باتیں اٹھائی جاتی رہی ہیں۔ ہمارے سیاست داں بھی یہاں اس جذبے کو پروان چڑھانے میں مدد دیتے رہتے ہیں۔ مثلاً پچھلے سالوں میں بھوپال کی دیواروں پر ایک عجیب نعرہ لکھا ہوا نظر آیا کرتا تھا'' بھوپال بھوپالیوں کا ہے ہم اسے چراگاہ نہیں بننے دیں گے''۔''[17]

اس طرح یعقوب یاور نے اپنے ان کالموں میں سنجیدگی کے ساتھ کئی اہم مسئلوں کو سپرد قلم کیا ہے۔ جن میں معلوماتی عناصر کے ساتھ اصلاحی اور عصری مسائل موجود ہیں۔

اردو ادب کو فروغ میں انھوں نے میڈیا کا بھی استعمال کیا ہے۔ مختلف چینلوں پر اپنی شاعری، کہانی اور تنقیدی کام کو لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ 18 جولائی 2013 کو انھیں دوردرشن اردو میں بلایا گیا اس چینل پر انھوں نے اپنے کچھ شعری سرمائے کو پیش کیا اور کہانیاں بھی سنائی۔ اسی طرح یوٹوب وغیرہ پر ان کے لیکچرز موجود ہیں۔ ساتھ ہی ان کے مشاعرے میں کہے گئے اشعار بھی یوٹوب پر ہیں۔ 3 نومبر 2015 وردھا یونیورسٹی مہاراسٹرا میں ''اردو لیپی اور اس کا اتیہاس'' کے عنوان سے ایک پروگرام منعقد کیا گیا تھا۔ جس میں یعقوب یاور کو خصوصی مقرر کے طور پر بلایا گیا تھا جس میں انھوں نے اردو شعری اصناف پر لکچر دیا یہ لکچر بھی یوٹوب پر کو موجود ہے۔

مشاعرے میں شرکت:

اردو ادب کے سمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کے ساتھ یعقوب یاور مشاعرے میں بھی شرکت کرتے ہیں اور ناظرین وسامعین کو اپنے اشعار سے لطف اندوز کیا کرتے ہیں۔ 2014 میں بنارس اسوسی ایشن کی جانب سے ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا۔ جس میں انھیں مہمان خصوصی و بحیثیت شاعر اور صدر

مدعو کیا گیا۔ ہندوستان کے اہم مشاعروں میں بنیاباغ (بنارس) کا مشاعرہ قابلِ ذکر ہے اس مشاعرے میں یعقوب یاور کئی بار مشاعرے کے صدر اور شاعر کی حیثیت سے موجور ہے۔ مشاعرے میں انھوں نے اپنی شعری تخلیقات کو بہت ہی عمدگی سے پیش کیا۔2013 میں بنارس ہندو یونیورسٹی کی جانب سے منعقدہ مشاعرے میں راقم بحیثیت ناظم موجود تھا۔ اس مشاعرے میں ہندوستان کے بڑے بڑے ادباء وشعراء موجود تھے۔ اس میں یعقوب یاور بحیثیت صدر اور شاعر مشاعرے کی رونق تھے۔

سماجی وفلاحی خدمات:

یعقوب یاور باقاعدہ سماجی وفلاحی تنظیوں سے وابستہ تو نہیں ہیں لیکن جب بھی کوئی ضرورت مند ان کے پاس جاتا ہے تو ان کی مدد کرتے ہیں۔کبھی کبھی سماجی و فلاحی جلسوں میں شرکت بھی کرتے ہیں۔ بنارس کے ویل فیئر سوسائٹی کے سماجی وفلاحی جلسوں میں یہ برابر شرکت کرتے ہیں۔ اور بین الاقوامی فلاحی وسماجی اجلاس جو ہندوستان میں منعقد ہوتے ہیں اس میں یعقوب یاور کو قوم کی نمائندگی کے لئے بھی بلایا جاتا ہے۔ سارناتھ (بنارس) میں تبتیوں وچینیوں نے بین الاقوامی فلاحی مجلس منعقد کیا تھا جس میں یعقوب یاور کو مسلم قوم کی نمائندگی کے بلایا گیا۔ اس میں یعقوب یاور نے جہاں تمام قوموں کی تہذیب وثقافت کے بارے میں بتایا وہیں لوگوں کو مسلم قوم کی بدحالی سے روشناس کرایا۔

انعامات واعزازات:

یعقوب یاور کو ان کی ادبی خدمات کے صلے میں مختلف انجمنوں اور اکیڈمیوں نے انعامات و اعزازات سے نوازا۔ جن کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

1۔ ترجمہ شدہ ناول ''سدھارتھ'' پر 1982 میں اردو اکادمی لکھنؤ، یوپی نے انھیں انعام سے نوازا

2۔ ان کی تنقید و تحقیقی کتاب ''ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری'' پر اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے 1999 میں انعام سے نوازا

3۔ ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ''تفکیر و تفہیم'' پر 2008 میں اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے انعام

عطا کیا۔

4۔ مدرحلیمہ فاؤنڈیشن ورانسی کی جانب سے 2006 میں ''نگارِ بنارس'' ایوارڈ سے نوازا گیا۔

5۔ 2008 میں اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے انھیں ان کی کتاب ''پا پیلاں'' پر انعام دیا۔

6۔ 2001 میں انڈیا مسلم اسوسی ایشن بھوپال کی جانب سے انھیں اردو اکیڈمک ایکسلینس ایوارڈ سے نوازا گیا۔

7۔ ساہتیک سنگ وارانسی نے 2012 میں ان کو ''سیوک اسمرتی سمان'' سے نوازا۔

8۔اتر پردیش اردو اکادمی نے یعقوب یاور کوان کے ترجمہ پر لائف ٹائم اچیومینٹ ایوارڈ 2017 میں دیا۔

9۔2018 قادری ادبی فاؤنڈیشن، دہلی نے ''پاپیلاں'' کے دوسرے ایڈیشن پر انھیں انعام سے نوازا گیا۔

شخصیت

لفظ شخصیت اپنے اندر بہت سارے اجزا کو سموئے ہوئے ہے۔ انسان کی سیرت و کردار سے شخصیت بنتی ہے۔لفظ شخصیت کوانگریزی میں 'Personality' کہتے ہیں۔جولاطینی لفظ'Persona' سے اخذ کیا گیا ہے،جس کا مطلب وہ مکھوٹا یا مصنوعی چہرہ جو ڈرامہ کے کردار ڈرامہ کرتے وقت چہرے پر لگاتے ہیں۔گویا اس سے ظاہری شکل وصورت مراد لی جاتی ہے''فرخ جاوید'' میں اس کے معنی یوں لکھے ہیں:

> '' لفظ شخصیت (Persona) اصل میں لاطینی ''پرسونا'' سے اخذ کیا گیا ہے۔جس کا مطلب ایسے نقاب سے ہے جو بطور مصنوعی چہرہ استعمال کیا جاتا ہے۔گویا'' پرسونا'' کا مطلب ظاہری شکل وصورت اور عمل وحرکات ہے۔''18ء

شخصیت انسان کے ظاہری اور باطنی خصوصیات کا مجموعہ ہوتی ہے جس میں انسان کے عادت واطوار، سیرت و کردار سبھی شامل ہوتے ہیں اور یہ تمام خصوصیات انسان کی موروثی ہوتی ہے اور جس ماحول میں انسان رہتا ہے اس کی دین ہوتی ہے۔یعقوب یاور کی شخصیت کی تعمیر میں ان کے ماحول اور معاشرتی اثرات کا عمل دخل ہے۔وہ جس ماحول میں اپنی زندگی گزارے ہیں ان سب کا ان کے اوپر اثر ہے۔یعقوب یاور نے زندگی کے کئی مراحل کو دیکھا اور زندگی کے مشکلات کا ڈٹ کر سامنا کیا اور بڑی بڑی مصیبتوں کو انھوں نے جھیلا ہے۔جب ہم ان کے شخصیت کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یعقوب یاور کی سنجیدگی اس بات پر دال ہے کہ وہ زندگی کے تمام اُتار چڑھاؤ کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی لکھتے

ہیں:

''یعقوب یاوراس شہر کے ان افراد میں سے ہیں جنھوں نے اپنی صلاحیت، ذہانت، معلومات اور انداز فکر کی وجہ سے دوسروں کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ وہ معروف شاعر ہیں، ان کا ادب کا مطالعہ اچھا ہے اور ماحول ومسائل پر وہ اچھی نظر رکھتے ہیں۔ سنجیدہ اور محنتی ہیں، ہر کام کو ایک خاص ڈھنگ اور سلیقے سے کرتے ہیں۔ حالات نے انھیں آزمائشوں میں بھی ڈالا ہے پریشانیوں سے بھی دوچار کیا ہے۔ جن سے گزرتے ہوئے وہ اکثر بددل بھی ہوئے ہیں، مایوسیوں میں بھی گھرے ہیں لیکن مسلسل محنت اور کچھ کر لینے کے جذبے نے ان کو ہمیشہ کامیابی سے ہمکنار کیا ہے۔''19

یعقوب یاور کی شخصیت اثر انگیز ہے اور وہ خوش مزاج شخصیت کے مالک بھی ہیں۔ ان کا انداز گفتگو نرم ہے حالانکہ آواز میں کچھ تیزی ہے۔ وہ سنجیدہ طبیعت کے مالک ہونے کے ساتھ ہر ایک کے ساتھ شفقت ومحبت سے پیش آتے ہیں۔ اپنے ہمعصروں کی عزت واحترام کرتے ہیں۔ یعقوب یاور نرم گو ہونے کے ساتھ ساتھ صاف گو بھی ہیں کسی کے بارے میں جو بات کہنی ہوتی ہیں وہ منہ پر کہہ دیتے ہیں۔ وہ اس بارے میں خیال نہیں کرتے ہیں کہ کوئی مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔ کسی دوست یا قریبی کے بارے میں کوئی برا خیال ان کے دل میں نہیں رہتا ہے۔

معمولات زندگی:

یعقوب یاور ایک سلیقہ مند ادیب کے ساتھ ایک ذمہ دار انسان بھی ہیں۔ وہ اپنا کام خود کرتے ہیں۔ وقت کے بے حد پابند ہیں۔ صبح سویرے اُٹھ کر فجر کی نماز پڑھتے ہی پھر کچھ دیر بعد ٹہلنے کے لیے نکل جاتے ہیں اور اس کے بعد پڑھائی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ یعقوب یاور کو دیر رات تک مطالعہ کرنے کی عادت ہے۔ یعقوب یاور کی اہلیہ ان کے دن بھر کے مشاغل کے بارے میں کہتی ہیں:

''آپ صبح اُٹھتے ہی چائے پیتے ہیں پھر پڑھنے کے لیے بیٹھ جاتے ہیں اور تقریباً دو

ڈھائی گھنٹہ صبح میں پڑھائی کرتے ہیں۔آپ پانچ وقت نماز کے پابند ہیں۔ادھر کچھ
برسوں سے فرائض کی ادائیگی کا انہماک بڑھتا جا رہا ہے۔قرآن مجید کا مطالعہ دن میں
ایک مرتبہ تفسیر اور ترجمے کے ساتھ کرتے ہیں۔'' 20؎

یعقوب یاور پڑھنے لکھنے کا بے حد شوق رکھتے ہیں جب وہ کوئی چیز لکھتے یا پڑھتے ہیں تو انھیں وقت کا پتا نہیں چلتا ہے۔پورے انہماک کے ساتھ وہ لکھنے پڑھنے میں غرق رہتے ہیں اپنی پڑھائی کے اوقات کے بارے میں کہتے ہیں:

''میں پڑھائی لکھائی میں اتنا مصروف رہتا ہوں کہ مجھے وقت کا پتا ہی نہیں چلتا ہے اور
جب میں اپنے ناولوں کو لکھتا تھا تو اپنے فون کو آف کر دیتا تھا یا کچھ دن پہلے دوستوں کو
بتا دیتا تھا کہ آپ لوگ ہمیں فون مت کیجیئے گا۔ایک بار کا واقعہ بتاتے ہیں کہ میں ایک
ناول کا ترجمہ کرنے شام میں بیٹھا پھر صبح ہوگئی اور ہمیں وقت کا پتہ نہیں چلا اور نا ہی
تھکن کا احساس ہوا۔'' 21؎

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یعقوب یاور لکھنے پڑھنے کا شوق جنون کی حد تک رکھتے ہیں۔یعقوب یاور وقت کا صحیح استعمال کرنے کے ساتھ فضولیات سے دور رہتے ہیں کبھی بھی ادھر اُدھر گھومنا ان کو پسند نہیں ہے۔ان کی بیوی اس بارے میں کہتی ہیں:

''میں نے شروع دن سے ہی ہے انھیں وقت ضائع کرتے نہیں دیکھا بازاروں میں
گھومتے تفریح کرتے نہیں دیکھی۔دوستوں کے ساتھ بھی دیر رات ٹہلتے نہیں
دیکھا۔''22؎

حلیہ:

یعقوب یاور کا حلیہ کچھ اس طرح ہیں کشادہ پیشانی، چہرہ نا تو زیادہ لمبا اور نا ہی زیادہ گول۔متداول خوبصورت چہرہ۔چہرے پر نہ مونچھ رہتا ہے اور نہ داڑھی۔سر پہ بال بھی بہت کم ہے جوان فلسفیافہ اور عالمانہ خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ان کا رنگ گورا ہے۔قد اور ناک متوسط ہے۔جسم تھوڑا موٹا ہے لہجہ دل

لبھانے والا ہے۔ پُرکشش آواز یعقوب یاور کی شخصیت میں رعنائی پیدا کر دیتی ہے۔

غذا:

یعقوب یاور کو گوشت، مچھلی وغیرہ پسند ہیں لیکن سادی غذا بھی وہ بڑی شوق سے کھاتے ہیں۔ پھل اور مٹھائیاں کھانے کے بھی شوقین ہیں۔ لیکن سبزیوں کے مقابل میں گوشت کو زیادہ فوقیت دیتے تھے۔ پھلوں میں انھیں سبھی پھل پسند ہیں۔ اپنے کھانے کے بارے میں کہتے ہیں:

> ''ابھی کچھ دنوں سے بیمار ہوں جس کی وجہ سے میں کچھ قسم کے کھانوں سے پرہیز کرتا ہوں جیسے رسدار مٹھائیاں اور گوشت وغیرہ بھی لیکن سوکھی مٹھائیاں اب بھی کھاتا ہوں۔ میں بیماری سے پہلے ہر قسم کے کھانے کو بہت شوق سے کھاتا تھا لیکن ادھر بیماری کی وجہ سے کچھ پرہیز کر رہا ہیں۔'' 23

لباس:

یعقوب یاور اپنی زندگی بہت ہی نفیس انداز میں گزارتے ہیں۔ صاف ستھرے اور پریس کیے ہوئے کپڑوں کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کے کپڑوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ پرانے کپڑوں کا استعمال نہیں کرتے ہیں۔ وہ اکثر سپاری سوٹ پہنتے ہیں اور کوٹ پینٹ ٹائی کے ساتھ پہنتے ہیں۔ جمعہ کے دن وہ پٹھانی سوٹ پہنتے ہیں۔ کپڑے تقریباً روز تبدیل کرتے ہیں۔ انہیں ہر ڈیزائن کے کپڑے پہننے کا بہت شوق ہے۔

ڈسپلین:

یعقوب یاور ایک ادیب اور استاد ہی نہیں بلکہ اصول پسند اور ڈسپلین کے عادی انسان ہیں۔ وہ اپنے گھریلو ذمہ داریوں میں بھی ڈسپلین کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں اور گھر کے دوسرے افراد کو بھی اصول پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ نہایت ہی سلیقہ مند انسان ہیں۔ ہر چیز کو سلیقہ و قرینے سے کرتے ہیں۔ کوئی چیز انھیں اگر بے ترتیب دکھائی دیتی ہیں تو وہ غصہ بھی ہو جاتے ہیں۔

معاصرین اور دوست واحباب کے ساتھ برتاؤ:

معاصرین کے ساتھ یعقوب یاور کا برتاؤ دوستانہ رہا ہے۔انھوں نے حسد اور جلن سے خود کو دور رکھا ہے۔ ہر کسی سے سنجیدگی سے ملتے ہیں۔ان کے دوست بھی ان کے ساتھ خلوص سے ملتے ہیں۔ان کے دوستوں میں ڈاکٹر اراوتی،حنیف احمد نقوی، کبیر اجمل، سید فریدی، غفران احمد،عبدالرحمان،مشرف عالم ذوقی وغیرہ ہیں۔مشرف عالم ذوقی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں کیا کہوں ایک بار پھر الفاظ سے محروم ہوں یعقوب یاور مجھے اس دوستی پر فخر ہے ایک نام جس نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ایک نام جو شروع سے ادب کی اعلی قدروں سے وابستہ رہا جس کی تخلیقات ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔جس نے ''جہاد اور عزازیل'' جیسے ناول خلق کیے جس نے سندھ کی قدیم تہذیب پر مبنی ایک ایسا ناول لکھ ڈالا کہ ہماری اردو دنیا حیران رہ گئی۔انگریزی سے ترجمے کیے تو تخلیقی رنگوں کی آمیزش نے ترجمے میں جان ڈال دی ایک ایسا نام جو حالات کی سرنگوں میں خود کو قید نہیں رکھتا۔اس کی خاموش صدا احتجاج بن جاتی ہے اس دوستی کو سلام کرتا ہوں۔'' 24؎

یعقوب یاور بھی اپنے دوستوں کی تعریف کرتے ہیں اور دوستوں کی قابلیت وصلاحیت کا اعتراف کرتے ہیں اور ان کے دل میں یہ بات رہتی ہے کہ ہمارے ساتھی ترقی اور کامیابی حاصل کریں۔یعقوب یاور نے اپنے معاصرین کے ساتھ کبھی بھی بے روا برتاؤ نہیں کیا۔اگر معاصرین میں کسی نے ان کے بارے میں برا کہا یا لکھا بھی تو یعقوب یاور اس پر ناراضگی کا اظہار نہیں کرتے ہیں بلکہ اسے درگزر کرتے ہوئے سنجیدگی کے ساتھ پیش آتے ہیں یعقوب یاور بتاتے ہیں:

''جب میرا پہلا شعری مجموعہ منظرِ عام پر آیا تو دلیپ بادل کا تاثر ایک اخبار میں چھپا اس تاثر میں لکھا تھا کہ آج کل ہر کوئی شاعری کرنا شروع کر دیا ہے اور ان کا شعری مجموعہ بھی چھپنے لگا ہے۔جب کہ انھیں شعر کہنا نہیں آتا۔اتفاق سے میں الہ آباد گیا تھا اور دلیپ کے گھر بھی جانا ہوا دلیپ صاحب مجھے پہچان نہیں رہے تھے میں ان کے

پاس بیٹھے کسی مسلے پر گفتگو کر رہا تھا کہ اچانک اپنے شعری مجموعہ پر ان کا دیا ہوا تاثر یاد آیا میں نے باتوں باتوں میں چھیڑ دیا کہ کسی یعقوب یاور کا شعری مجموعہ آیا ہے تو انھوں نے ہاں میں سر ہلا دیا اور بات جاری رہا۔ پھر وہ بغور وہ مجھے دیکھنے لگے انھوں نے کہا آپ ہی یعقوب یاور ہیں تو میں نے کہا ہاں تو انھوں کہا کہ میرا تاثر آپ کے شعری مجموعہ پر چھپا ہے آپ کے کسی جاننے والے نے لکھ کر کہا کہ اس کو آپ اپنے نام سے چھپوا دیجئے اور یہ ناگزیر حرکت میں نے کر دیا میں آپ سے معافی مانگتا ہوں بعد میں میں نے آپ کے شعری مجموعہ کو پڑھا تو اندر اندر اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ میں ہنسنے لگا اور ان سے کہا کوئی بات نہیں میں نہ آپ سے ناراض ہوں اور نہ اس سے جس نے اسے چھپوایا ہے۔'' 25؎

وہ اپنے دوست انوار احمد کے بارے میں کہتے ہیں:

''مجھے فخر ہے کہ محترم انوار صاحب میرے دوست ہیں۔ ان کی خوبیاں مجھ پر رفتہ رفتہ منکشف ہوئی، کم بولنے والوں کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے آج میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ کتنے ہر دل عزیز استاد اور ایک معتبر ادیب ہیں۔ بحیثیت انسان بھی انھوں نے میرے دل کو چھوا ہے۔ اللہ انہیں سلامت رکھے دوستی کی اس پہلی سالگرہ پر میں اپنے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔'' 26؎

یعقوب یاور جہاں اپنے معاصرین ادیبوں و نقادوں کے ساتھ خوش اسلوبی سے پیش آتے ہیں وہیں پر وہ اپنے ساتھیوں کے بارے میں امید کرتے ہیں کہ وہ اچھے کام کریں اور دُعا کرتے ہیں کہ اللہ انہیں ترقی دے۔ شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی سے جب رٹائر ہوئے اور اپنے ساتھی آفتاب احمد آفاقی کے صدر بننے پر انھوں نے یہ تاثر لکھا ہے:

''اردو دنیا ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی سے بخوبی واقف ہے۔ آج صدر شعبہ اردو کی ذمہ داریاں ان کے سپرد کرتے ہوئے مجھے گونا گوں طمانیت کا احساس ہو رہا ہے۔ میں بخوبی جانتا ہوں کہ وہ شعبہ اردو کو نئی بلندیوں سے آشنا کرانے کے اہل ہیں۔ دوسروں

کے دکھ درد میں ہمہ وقت شریک رہنے کا ان کا جذبہ قابل رشک ہے۔ وہ دوسروں کی رائے کا احترام کرنا اور واضح طور پر اپنی بات رکھنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ مشکل سے مشکل مسائل سے نبرد آزمائی کا حوصلہ ان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہی وہ باتیں ہیں جو کسی بھی گروہ کی رہنمائی میں بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ اپنے ساتھیوں سے میری گزارش ہے کہ صدق دل سے ان کی رہنمائی کو قبول کریں انشاء اللہ انھیں مایوسی نہیں ہوگی آج اس موقع پر میں اللہ رب العزت کے سامنے دست دعا ہوں کہ ان کی سرپرستی میں شعبہ اردو دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے اور شعبہ کا اتحاد یوں ہی برقرار رہے۔۔۔آمین

نگہ بلند سخن دل نواز جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میرِ کارواں کے لئے''

(علامہ اقبالؔ) 27؎

یعقوب یاور جس طرح ایک بہترین ادیب، اچھے انسان ہیں اسی طرح ایک بہترین استاد بھی ہیں۔ ان کے پڑھانے کا انداز بہت ہی دلکش تھا۔ یہ جس بھی موضوع پر پڑھاتے تھے بچے ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ یعقوب یاور پڑھانے کے لیے جس موضوع کا انتخاب کرتے تھے اس کے بارے میں پہلے خوب مطالعہ کرتے تھے۔ پھر کلاس روم میں آ کر بچوں کو پڑھاتے تھے۔ شعبہ میں تمام طالب علم ان کے پڑھانے کے انداز سے بہت متاثر تھے۔ اور یہ طالب علموں کے ساتھ مشفقانہ رویہ رکھتے تھے۔ ان کے ایک طالب علم منظور احمد کا یہ تاثر ہے:

''آج سے تقریباً سولہ سال پہلے میں نے پروفیسر یعقوب یاور کو دیکھا تو میرے دل میں احساس ہوا کہ کاش ان سے میں پڑھ سکوں اور ان سے مجھے سیکھنے کا موقع حاصل ہو اور آج میں اس ہر دل عزیز پروفیسر سے پڑھ رہا ہوں مجھے بہت خوشی ہے ان کے پڑھانے کا انداز بہت ہی متاثر کن ہے۔'' 28؎

یعقوب یاور نے شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی میں راقم الحروف کو بھی ایم۔اے کے دوران علم

عروض پڑھایا اور اقبال کی نظمیں وغزلیں اور سودا، ذوق، پنڈت دیا شنکر نسیم، محسن کاکوروی کے قصائد و مثنویات کو بھی پڑھائے ہیں۔ مجھے بھی اس بات کا احساس ہے کہ وہ ہر چیز کو اتنے سلیقے سے بتاتے اور سمجھاتے تھے کہ ان کے پڑھانے کے وقت ساری چیزیں ذہن میں اتر جاتی تھیں۔

ذمہ دار شخصیت:

یعقوب یاور ایک ذمہ دار شخصیت کے حامل ہیں بحیثیت فرزند، بحیثیت شوہر، بحیثیت باپ، بحیثیت استاد وہ اپنے تمام فرائض کو بہ خوبی انجام دے رہے ہیں۔ اگر انھیں کوئی ذمہ داری سونپی جاتی ہے تو وہ سلیقے سے اسے نبھاتے ہیں۔ گھر کی ذمہ داری ہو یا باہر کی کہیں بھی غفلت نہیں کرتے انھیں اپنی ذمہ داریوں کا بہ خوبی احساس رہتا ہے۔ یہ اپنی ذمہ داریوں کو دوسروں پر لادنے کی کوشش نہیں کرتے۔

الغرض یعقوب یاور ایک اچھے انسان ہیں سب کے ساتھ ہمیشہ خلوص و ہمدردی کا جذبہ رکھتے ہیں۔ ہر ایک سے نرم لہجے میں بات کرتے ہیں۔ ملنساری اور مخلصی ان کی شخصیت کا خاصہ ہے۔ بحیثیت انسان یہ اپنی تمام ذمہ داریوں کو جانتے ہیں اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ پروفیسر یعقوب یاور بہترین ناول نگار اور اچھے شاعر عمدہ مترجم کے ساتھ ساتھ اچھے انسان ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات

1۔ شخصی انٹرویو، یعقوب یاور، 16/دسمبر 2017

2۔ شخصی انٹرویو، یعقوب یاور، 16/دسمبر 2017

3۔ شخصی انٹرویو، یعقوب یاور، 16/دسمبر 2017

4۔ شخصی انٹرویو، یعقوب یاور، 16/دسمبر 2017

5۔ شخصی انٹرویو، یعقوب یاور، 16/دسمبر 2017

6۔ مرغزار افکار، یعقوب یاور ص:18

7۔ شخصی انٹرویو، یعقوب یاور، 16/دسمبر 2017

8۔ یعقوب یاور مرغزار افکار، ص:14-15

9۔ شخصی انٹرویو، یعقوب یاور، 16/دسمبر 2017

10۔ مرغزار افکار، یعقوب یاور ص:22

11۔ مرغزار افکار، یعقوب یاور ص:22

12۔ شخصی انٹرویو، یعقوب یاور، 16/دسمبر 2017

13۔ شخصی انٹرویو، یعقوب یاور، 16/دسمبر 2017

14۔ مرغزار افکار، یعقوب یاور ص:19

15۔ تاثر مشرف عالم ذوقی، ''دل من'' آخری صفحہ

16۔ شخصی انٹرویو، یعقوب یاور، 16/دسمبر 2017

17۔ شخصی انٹرویو، یعقوب یاور، 16/دسمبر 2017

18۔ فرخ جاوید، عمرانیات ص95

19۔امروز،یعقوب یاور:ص8

20۔شخصی انٹرویو،اہلیہ یعقوب یاور،16ردسمبر 2017

21۔شخصی انٹرویو،یعقوب یاور،16ردسمبر 2017

22۔شخصی انٹرویو،اہلیہ یعقوب یاور،16ردسمبر 2017

23۔شخصی انٹرویو،یعقوب یاور،16ردسمبر 2017

24۔شخصی انٹرویو،مشرف عالم ذوقی،16ردسمبر 2017

25۔شخصی انٹرویو،یعقوب یاور،16ردسمبر 2017

26۔شخصی انٹرویو،یعقوب یاور،16ردسمبر 2017

27۔شخصی انٹرویو،یعقوب یاور،16ردسمبر 2017

28۔شخصی انٹرویو،منظور احمد،18ردسمبر 2017

باب دوم

یعقوب یاور کے ناولوں کا تجزیہ

الف: موضوع و مسائل:

ب: فنی جائزہ:

1۔ پلاٹ:

2۔ کردار:

3۔ مکالمہ:

4۔ جذبات:

5۔ منظر کشی:

6۔ زبان و بیان:

7۔ تکنیک:

1980 کے بعد جن ناول نگاروں نے اپنا نام اردو ناول نگاری میں مستحکم کیا ہے اس میں الیاس احمد گدی، پیغام آفاقی، جوگندر پال، اقبال مجید، سید محمد اشرف شموئل احمد، حسین الحق، مشرف عالم ذوقی، عبد الصمد، ساجدہ زیدی، غضنفر، وغیرہ قابل ذکر ہیں ان میں ایک نام یعقوب یاور کا بھی ہے۔ ان کے معاصر ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں جس چیز کو موضوع بنایا ہے اس میں اکثر حالات حاضرہ، اقلیتوں کے مسائل، عورتوں کے جنسی استحصال، فرقہ ورانہ فساد، غریبوں، مزدوروں کا استحصال، سماج میں پھیلے ہوئے ظلم و جبر وغیرہ ہیں یعقوب یاور نے اپنے ناولوں کا موضوع ان سے متبائن رکھا ہے۔ چاہے ان کا ناول عزازیل ہو یا ان کا پہلا ناول ''دل من'' ہو۔ ان دونوں ناولوں میں یعقوب یاور نے تاریخ و مذہبی کتابوں سے مدد لے کر ایسی کہانی بنائی ہے جو اردو میں اور ناول نگاروں کے یہاں بہت ہی کم ملتا ہے۔ ان کا تیسرا ناول جہاد ہے جو ان کے معاصرین ناول نگاروں کے ناولوں سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن صرف موضوع کی یکسانیت کی حد تک ورنہ واقعات جو اس ناول میں ہے وہ اردو کے دیگر ناول میں نہیں ملتا ہے۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ ان کے معاصرین کا مختصراً جائزہ لے لیا جائے۔

مشرف عالم ذوقی:

مشرف عالم ذوقی یکم مارچ 1962ء کو بہار میں پیدا ہوئے۔ بی۔ اے کرنے کے بعد صحافت کی دنیا میں قدم رکھا۔ افسانوی ادب میں ذوقی اپنی ایک شناخت رکھتے ہیں۔ یہ یعقوب یاور سے تقریباً 10 سال چھوٹے ہیں۔ یعقوب یاور کے دوستوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ذوقی اپنی تخلیقات کو عام زندگی کی حقیقتوں، نفسیاتی کیفیتوں اور پرانی قدروں کے تصادم واقعات سے سجاتے ہیں۔ یہ ایک بسیار نویس ادیب تھے۔ ان کی وفات یکم اپریل 2021 کو ہوئی۔ ان کے 14 ناول اور 8 افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ جو

اس طرح سے ہیں: نیلام گھر، بیان، شہر چپ ہے، پوکے مان کی دنیا، پروفیسر ایس کی عجیب داستان، وایا سنامی، آتشِ رفتہ کا سراغ، لے سانس بھی آہستہ، نالہ شب گیر، ذبح، عقاب کی آنکھیں، مرگ انبوہ، مردہ خانے میں عورت۔ نیلام گھر1992ء میں شائع ہوا۔ اس میں مشرف عالم ذوقی نے موجودہ انتظامیہ کی بد عنوانیاں اور سماج کے اعلی طبقے کی برائیوں اور عورتوں کے جنسی استحصال کو موضوع بنایا ہے۔ اس طرح سے ان کا دوسرا ناول ''بیان'' ہے جس کا موضوع بابری مسجد ہے اسی طرح ان کے دوسرے ناول میں موجودہ دور کی برائیوں اور ظلم وجبر کا تذکرہ ملتا ہے۔ انکے افسانوی مجموعے یہ ہیں۔(1)''بھوکا اتھوپیا''1993(2) ''فریج میں رکھی عورت''1997(3)''لینڈ اسکیپ کے گھوڑے''2003وغیرہ منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

شموئل احمد:

شموئل احمد 4 مئی1943 کو بھاگل پور بہار میں پیدا ہوئے۔ان کے ادبی سفر کا آغاز زمانہ طالب علمی میں ہی ہوا۔ یہ دور حاضر کے معروف فکشن نگار ہیں ان کے ناول اور افسانے اس طرح سے ہیں۔ افسانوی مجموعے، بگولے، سنگار دان، القہوس کی گردن، عنکبوت، اور ناول میں، ندی، مہاماری، اے دل آرارہ، گرداب۔ ان کا پہلا ناول ''ندی'' ہے جس میں عورتوں اور مرد کے نفسیاتی پیچیدگیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ناول ''مہاماری'' میں عصرِ حاضر کی سیاسی، سماجی اور سرکاری افسر شاہی کے پورے سسٹم کو بڑی بے باکی سے اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور ناول 'اے دل آوارہ' سوانحی سانچے کا ہے۔اور 'گرداب' ایکسٹرامیٹریل پر منحصر ہے۔

الیاس احمد گدی:

الیاس احمد گدی16اپریل1932 کو جھارکھنڈ کے ضلع جھریا دھنباد میں پیدا ہوئے۔انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانے سے کیا ان کا پہلا افسانہ''سرخ نوٹ'' 1946 میں شائع ہوا۔ان کے افسانوی مجموعوں میں آدمی، رانی منڈی، اور ناولوں میں رحم، مرحم، فائر ایریا، جس پر انھیں 1996 کو ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ان کا انتقال 1997 میں ہوا۔ان کا مشہور ناول''فائر ایریا'' ہے جو ایک

علاقائی ناول ہے جس میں بہار میں کوئلے کی کان میں کام کرنے والے مزدوروں کی مشکل بھری زندگی اور کول مائن کے مالکوں، ٹھیکے داروں، افسروں کی شاہی زندگی اور ان کی تمام مکاریوں اور چالاکیوں کو تفصیل کے ساتھ ناول میں پیش کیا گیا ہے۔ الیاس احمد گدی کا یہ ایک بہترین ناول ہے۔ یعقوب یاور نے اپنے تینوں ناول میں ناول لکھنے کا جو طریقہ اپنایا ہے وہ الیاس احمد گدی کے اس ناول سے ایک چیز میں مساویت رکھتے ہیں۔ وہ یہ کہ یعقوب یاور نے ناولوں کو باب اور جز میں لکھا ہے۔ اسی طرح ''فائر ایریا'' میں بھی جز کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور چیز میں مماثلت نہیں ہے۔

اقبال مجید:

ان کی پیدائش 12 جولائی 1934 کو مرادآباد میں ہوئی۔ ان کے افسانے اور ناول حسب ذیل ہیں۔ افسانوی مجموعے، دو بھیگے لوگ، ایک حلفیہ بیان، شہر بدنصیب، تماشا گھر، آگ کے پاس بیٹھی عورت۔ ان کا پہلا ناول ''کسی دن'' یعقوب یاور کے پہلے ناول کے ساتھ 1998 میں شائع ہوا۔ یہ ایک سماجی اور سیاسی ناول ہے جس میں انسانی پیچیدگیوں کو سیاسی فضا میں پیش کیا گیا ہے۔ اور اس میں مسلم کے استحصال کا ذکر ہے۔ ان کا دوسرا ناول ''نمک'' 1999ء میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ ناول اپنے اختصار کی وجہ سے شہرت کا متحمل ہے۔ اس ناول کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دریا کو کوزے میں بند کیا گیا ہے۔ ناول میں نئی تہذیب کی ارتقاء اور پرانی تہذیب کی شکست وریخت کو دکھایا گیا ہے۔

شفق:

ان کا نام شفیق احمد خان ہے۔ ان کی پیدائش 9 فروری 1945 کو بہار کے ضلع سہسرام میں ہوئی۔ 1980 کے بعد جدید اردو فکشن نگار میں ایک مشہور نام شفق کا ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں انسانی زندگی کے شکست وریخت کے ساتھ معاشرہ، فرد اور ذات کی داخلی وخارجی عوامل کو پیش کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں عصری مسائل کے الیے پوری وجودیت کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کا ناول '' کانچ کا بازی گر'' اردو ناولوں میں کافی مقبول ہوا۔ اس میں اندرا گاندھی کے نافذ کردہ قانون ایمرجنسی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دوسرا ناول

''بادل'' ہے جس میں شفق نے موجودہ عہد کے مسلمانوں کی بے چینی اور عالمی سطح پر جنگ وفسادات کے بڑھتے ہوئے رجحان سے پیدا شدہ مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ ناول 2002ء میں شائع ہوا۔ اس کے سات سال بعد یعقوب یاور نے ناول ''جہاد'' لکھا۔ جس میں انھوں نے گجرات کے فساد کے بعد الگ الگ جگہوں پر ہونے والے فرقہ ورانہ فساد کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں کی صورتِ حال کو بیان کیا ہے۔ لیکن یہ ناول اپنے موضوع اور ہیت کے اعتبار سے ''بادل'' سے مختلف ہے۔ شفق کا ایک ناول 'کابوس' ہے جس میں حالات حاضرہ کے بیان کے ساتھ مذہبی تصادمات کا ذکر ہے۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں سمٹتی ہوئی زمین، سگ گزیدہ، شناخت، انار کا باغ ہیں۔

حسین الحق:

ان کی پیدائش 2 نومبر 1949 کو سہسرام بہار میں ہوئی۔ یہ اردو کے مابعد جدید ناول نگاروں میں کافی اہمیت کے حامل تھے۔ ان کا انتقال 2021 میں ہوا۔ ان کے تین ناول ''بولو مت چپ رہو'' ''فرات''، ''اماوس میں خواب'' ہیں۔ فرات میں انھوں نے نئی تہذیب کو موضوع بنایا ہے اور نئی نسل کس طرح ماضی کو بھول رہی ہے اس کو بیانیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ''بولو مت چپ رہو'' میں بہار کی درس و تدریس کو موضوع بنایا ہے۔ ناول ''اماوس میں خواب'' اس پر انھیں 2020 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں پس پردہ شب، صورت حال، مطلع، نیو کی اینٹ، گھنے جنگلوں میں، ہیں۔

غضنفر:

غضنفر کی پیدائش 9 مارچ 1953 کو گوپال گنج بہار میں ہوئی۔ ان کی تخلیقی سفر کا آغاز 1971 میں ڈراما ''کوئلے سے ہیرا'' سے ہوا۔ ان کے افسانوی تصانیف میں ناول پانی، کینچلی، کہانی انکل، ودیا بانی، فسوں، وش منتھن، مم، مانجھی، یہ ناول ہیں اور ان کے دو افسانوی مجموعے حیرت فروش، پارکنگ ایریا، ہیں۔

غضنفر کا پہلا ناول ''پانی'' 1989ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ''پانی'' غضنفر کا خالص سیاسی ناول ہے

جس میں سیاسی رہنماؤں اور ہندوستان کے دارالتحقیق کے سائنس دانوں اور مذہب کے ٹھیکے داروں پر طنزیہ ضرب لگائی گئی ہے۔غضنفر کا دوسرا ناول ''کینچلی'' ہے۔جس میں دو افراد کی ازدواجی زندگی کی ایک ایسی تصویر ہے جس میں کرب ہے معزوری ہے، مفلسی ہے، اقتصادی حالات، فکری جذبات، اور جنسی خواہشات کو ناول میں برئے کار لایا گیا ہے۔اس کے علاوہ غضنفر نے ''کہانی انکل''، ''دویہ بانی''، ''فسوں''، ''وش منتھن'' لکھا ہے۔غضنفر اور یعقوب یاور میں ایک اور مماثلت ہے وہ یہ کہ جس طرح یعقوب یاور نے اپنے ناول ''دل من'' میں ہندی کے الفاظ استعمال کیے ہیں اسی طرح غضنفر نے اپنے ناولوں میں ہندی کے الفاظ کو استعمال کیا ہے۔لیکن ''دل من'' میں جو ہندی استعمال کی گئی ہے وہ سنسکرت زدہ ہے۔

پیغام آفاقی:

پیغام آفاقی یعقوب یاور کے معاصرین میں ایک اہم نام ہے جو 10 جون 1956 کو سیوان بہار میں پیدا ہوئے۔ان کے دو ناول 'مکان' اور 'پلیتہ' اور ایک افسانوی مجموعہ 'مافیا' ہے۔ان کا ناول ''مکان'' اپنے دور کا مشہور ناول ہے جس میں انھوں نے ہندوستان کے جدید شہری معاشرے کی بظاہر خوش نما اور پرکشش تہہ میں پوشیدہ کرپشن، لاقانونیت، بے راہ روی کو پیش کیا ہے۔اور شہروں میں کرایہ کے مکان کے مسئلوں کو پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا ناول ''پلیتہ'' ہے اس میں پیغام آفاقی نے ہندوستان کی جمہوریت کو نشانہ بناتے ہوئے سیاست اور حکومت پر طنز کیا ہے۔اور یہ بتایا ہے کہ آج ہمیں انگریزوں سے آزادی مل گئی ہے لیکن پردے کے پیچھے عام آدمی کالے پانی کی سزا پاتے ہیں۔ پیغام آفاقی اور فکشن کو متنوع اور جدید جہات سے روشناس کرایا۔

سید محمد اشرف:

ان کی پیدائش 8 جولائی 1957 کو سیتاپور یوپی میں ہوئی۔ مابعد جدید ناول نگاری میں ان کا ایک اہم نام ہے۔ان کا پہلا ناول 1997ء میں شائع ہوا۔جس کا نام ''نمبر دار کا نیلا'' ہے۔جس میں انھوں نے تشدد، منافرت، بین الاقوامی سیاست کی دہشت پسندی کا ذکر ہے۔اور ہندو دھرم کو گائے کو ماتا مانتے ہیں

اس کے نام پر فساد کا ذکر ہے۔ان کے افسانوی مجموعوں میں، باد صبا کا انتظار، دار سے بچھڑے، ہیں۔ان میں انھوں نے مسلمانوں کے حالات اور ہندو مسلم تصادمات کی وجہ سے جو فساد برپا ہوتے ہیں ان کو موضوع بنایا ہے۔

عبدالصمد:

ڈاکٹر عبدالصمد 18 جولائی 1952 میں بہار شریف میں پیدا ہوئے۔ان کے چھ ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ پہلا ناول ''دوگز زمین'' 1988 میں شائع ہوا۔دوسرا ناول ''مہاتما'' 1992 میں تیسرا ناول ''خوابوں کا سویرا'' 1996 میں چوتھا ناول ''مہا ساگر'' 1999 میں پانچواں ناول ''دھمک'' 2005 میں، چھٹا ناول ''بکھرے اوراک'' 2010 میں ''جہاں تیرا ہے یا میرا ہے'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ان کے افسانوی مجموعوں میں بارہ رنگوں والا کمرہ، پس دیوار، سیاہ کاغذ کی دھجیاں، میوزیکل چیئر، آگ کے اندر راکھ، ہیں۔

عبدالصمد اپنے ناولوں میں سیاست، تقسیم ہند، دور حاضر میں موجودہ تعلیمی مسائل ومباحث کو بروئے کار لایا ہے۔مسلمانوں کی بدحالی، سیاسی رہنماؤں کی مفاد پرستی اور لوٹ کھسوٹ کے سبب بے روزگاری، مسلمانوں کو شک وشبہے کی نظر سے دیکھے جانے کو اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔

یعقوب یاور نے اپنے افسانوی ادب کا آغاز کہانی 'کرفیو' سے کیا جو کلکتہ کے رسالہ آبشار میں 1987 کو شائع ہوئی۔اس کہانی میں یعقوب یاور نے فرقہ وارانہ فساد، مذہبی تصادم کے منفی اثرات کو پیش کیا ہے۔جس میں ہندو مسلم کو علامتی انداز میں کردار بنا کر کہانی کو پورا کیا گیا ہے۔مذہبی منافرت کی شدت کو اس کہانی میں اس طرح بیان کیا ہے کہ جس ملک میں ہندو مسلم بھائی چارے کی بات تھی آج اس ملک میں مذہب کے نام پر قتل وغارت گری اور عصمت دری کا بازار گرم ہے۔یعقوب یاور کی یہ پہلی کہانی اپنے اندر عصرِ حاضر کے بہت سارے لوازمات اور تجربات کو سموئے ہوئے ہے۔اس میں کہانی کار کا انداز بیان متاثر کن ہے اور کہانی میں وحدت تاثر موجود ہے۔مکالماتی انداز پر مبنی یہ کہانی افسانے کے فن کو اپنے اندر سموئے

ہوئے ہے۔اس کہانی میں جو کردار منتخب کیے گئے ہیں ان میں موضوع کو بیان کرنے کی پوری صلاحیت ہے۔یعقوب یاور نے بڑی چابک دستی اور ہنرمندی سے ایک ایسے مسئلے کو منظرِ عام پر لایا ہے جو آج سماج کا المیہ بن چکا ہے۔مذہب و دھرم کی شدت اس چھوٹی سی کہانی میں پوری توانت کے ساتھ موجود ہے۔اس کہانی میں صرف تین کردار ہیں جو مذہبی علامت سے پیوست ہیں۔ایک کردار گیروئے لباس والا جو ہندو دھرم کا مطیع وفرمانبردار ہے۔اور ایک ماتھے پر سیاہ نشان والا جو اسلام کا پیروکار ہے۔گیروا اور سیاہ نشان دونوں مذہب و دھرم کے پابند ہونے کی علامت ہے۔گیروئے سے پوجا پاٹ کرنا اور سیاہ نشان سے پنج وقتہ نمازی ہونا۔کہانی میں یہ دونوں کردار مر چکے ہوتے ہیں اور اپنی اپنی داستان کو ایک دوسرے کو سناتے ہیں جس میں ان کے کالے کارنامے اور کرتوت شامل ہیں۔گیروئے لباس والا اپنی زندگی کی کچھ ایسے کام کو بتاتا ہے جس پر انسانیت کا خاتمہ ہوتا ہے۔اس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔کہانی کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔جس میں یعقوب یاور نے اس کردار کے ذریعے سے سماج میں پھیلی ہوئی فرقہ وارانہ فساد کے جڑ کو پیش کیا ہے:

''گیروئے لباس والے آدمی نے اپنی داستان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔میں تنہا جا رہا تھا کہ چوک کے پاس میں نے دیکھا ایک بوڑھا ایک نوجوان لڑکی کو ساتھ لیے جلدی جلدی سڑک پار کر رہا تھا۔انھیں دیکھ کر میں نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری آگے بڑھ کر میں تحکمانہ لہجے میں کہا ٹھہرو۔وہ رک گیا اس کے پیچھے کالے کپڑوں میں سر سے پیر تک چھپی ہوئی خوف زدہ لڑکی بھی رک گئی۔

یہ کون ہے۔؟ میری کرخت آواز اس کی سماعت کو للکارا ''میری بیٹی'' سہمی ہوئی آواز میں کہا

میں ہوا میں خنجر لہراتے ہوئے لڑکی کی طرف بڑھا وہ رونے لگی میں نے ایک جھٹکے میں اس کے چہرے پر پڑا ہوا نقاب نوچ ڈالا۔اس کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکلی ،لیکن میرے ہاتھ اپنا کام کرتے رہے۔بوڑھے نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔میں

نے چیخ کر کہا۔''آنکھیں کھلی رکھو ورنہ۔۔۔۔میرا اشارہ خنجر کی طرف تھا۔بوڑھا گھگھیانے لگا میں دوبارہ لڑکی کی طرف متوجہ ہونے لگا اس کے دودھیا جسم سے نکلتی ہوئی شعائیں میرے جسم کو جھلسا رہی تھیں۔ایک لمحہ کو میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے سامنے پانی کا گلاس ہے اور میں اسے پی گیا۔''1ے

یعقوب یاور نے کہانی میں آج کے سماج پر کاری ضرب لگائی ہے اور بتایا ہے کہ آج مسلمانوں کے خلاف دوسری قوموں میں کس طرح سے نفرت بھری ہوئی ہے کہ وہ انسان کی نہیں بلکہ انسانیت کی عصمت دری کرتے ہیں۔عصرِ حاضر میں مسلمانوں کی جو حالت ہے اس کو اس چھوٹی سی کہانی میں بہت ہی بے باکانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔اور فرقہ پرست وشدت پسند فسادیوں کے اعمال کو بھی تیکھے اور چبھتے ہوئے انداز میں لکھا گیا ہے۔یہ کہانی کئی زاویے سے اہم ہے اس میں فرقہ وارانہ فساد اور مذہبی تصادمات کے تمام اسباب وعوامل کو علامتی انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔اور بتایا گیا ہے کہ آج مذہب و دھرم کے ٹھیکے دار لوگوں کو مارنا اور ان کی بہو بیٹیوں کی عصمت دری کرنا اعلی درجے کا پوجا پاٹ اور دھرم سمجھنے لگے ہیں۔کہانی میں جہاں مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی سازشوں اور اعمال کو اجاگر کیا گیا ہے وہیں مسلمانوں کی کمی کو بھی بتایا گیا ہے کہ آج مسلمان خود فرقہ بندی اور گروہ بندی میں بٹ گئے ہیں۔ان سے اتحاد و اتفاق غائب ہو چکا ہے اور آپسی بھائی چارگی جو اس قوم کی ممیّزات میں شامل تھی۔اس کو یہ قوم بھول چکی ہے جس کی بنا پر غیر قوم ان پر بھیڑیے کی طرح ٹوٹ پڑی ہے۔افسانے کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''میری داستان بہت مختصر سی ہے۔ماتھے پر سیاہ نشان والے نے اپنی سرگزست بیان کرتے ہوئے کہا۔''عبادت خانے سے نکل کر میں اپنے گھر جارہا تھا کہ آسمان سے آگ برسنے لگی اور زمین شولے اگلنے لگی۔چہار جانب آتشیں رقص ہو رہا تھا۔میں اس منظر سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا اور میں نے وہی کیا جو میرے دل نے کہا۔اپنی کامرانیوں کے نشے میں چور اور اپنی کامیابیوں سے سرشار میں جب اپنے گھر پہنچا تو باہر کے موسم کا اثر وہاں مجھ سے پہلے پہنچ چکا تھا۔میں اس منظر کی تاب نہ لا سکا اور مر گیا۔''2ے

مسلمان جو ایک اللہ اور ایک کتاب کو ماننے والا ہے پر آج اس کے اندر وہ خصلتیں پائی جانے لگی ہیں جس کی بنا پر اس کو اپنے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا ہے۔جس کے سبب پوری قوم ہلاکت و بربادی کا سامنا کر رہی ہے۔اس کہانی میں ایک کردار ٹوپی والا ہے جس کو سیاسی رہنما اور حاکم کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔جب گیروئے لباس والا اور ماتھے پر سیاہ نشان والا یہ کردار مر جاتے ہیں تو ٹوپی والا کرفیو کا اعلان کرتا ہے۔یعقوب یاور کی یہ کہانی ان کے افسانہ نگاری سے دلچسپی کو اجاگر کرتی ہے۔یہ حالات حاضرہ پر لکھی گئی ایک اچھی کہانی ہے۔موضوعاتی سطح پر اس میں پختگی اور کہانی پن کے لوازمات کے ساتھ فنی رمزات اس میں موجود ہیں۔لیکن نہ جانے کیوں یعقوب یاور نے اپنے آپ کو افسانے کی دنیا سے الگ کر لیا۔اور صرف ناول نگاری کی طرف پوری یکسوئی سے جڑ گئے۔

ناول دل من کا جائزہ:

اردو ادب میں 1869ء سے لے کر اب تک بے شمار ناول لکھے گئے ہیں۔ ان میں اصلاحی، تاریخی، سماجی، سیاسی، تہذیبی، مذہبی وغیرہ ناول شامل ہیں۔اردو میں تاریخی ناول نگاری مغرب کے وسیلے سے آئی۔عبدالحلیم شرر سے لے کر عصمت چغتائی اور قاضی عبدالستار تک اردو میں بہت سارے تاریخی ناول لکھے گئے اور ان کو کامیابی اور مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔تاریخی ناول نگاروں میں یعقوب یاور کا نام بھی شامل ہے۔انھوں نے اب تک تین ناول لکھے ہیں جس میں ''دل من'' ایک ایسا ناول ہے جس میں یعقوب یاور نے ایسی تہذیب وتمدن کو جگہ دی ہے جس کی تاریخ بہت پرانی اور ہزار سال قبل مسیح کی ہے جسے موہن جودڑو ہڑپا کی تہذیب سے موسوم کیا جاتا ہے۔

سندھ کی تہذیب پر بہت کم ہی تحریریں نظر آتی ہیں۔انگریزی میں اس کے حوالے سے سب سے پہلے 1842ء میں ایک کتاب شائع ہوئی جس میں جیمس لوائس نے پہلی بار ہڑپا کی نشانی کو پیش کیا۔درج ذیل اقتباس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے۔

" James Lewis was the frist Europen to see the

ruin of harapa. Writing under the pseudonym'charles masson' he described them in his book narratire of various journy of Balochistan Afghanistan and panjab which was published in1842"3

1998ء میں یعقوب یاور نے اردو ناول نگاری میں ایک اضافہ ناول ''دل من'' لکھ کر کیا۔ اردو کا یہ واحد ناول ہے جو کلی طور پر موہن جو داڑو کی تہذیب و تمدن پر منحصر ہے۔

ایک انگریزی مضمون کے مطابق سندھ کے موضوع پر اب تک 13 ناول تحریر کیے گئے ہیں۔ جو یہ ہیں:

1- Murdon ka teela-Rangeya Raghava(hindi) 1948

2- Dilmun-Yaqoob yawar(urdu) 1998

3- Bahao-Mustansar hussain tarar.(urdu) 2004

4- Winteron the plain of Ghosts-Eileen.kernaghan (English) 2004

5- Immortals of Meluha -Amishtripathi (English) 2004

6- Seeret of the Nagas Amishtripathi (English) 2011

7- Trade winds of Meluha.Vasant deve (English) 2012

8- Tri-shapath-ga Iravati (Hindi) 2013

9- Lure of soma- Shankar kashyap (English) 2014

10- Fall of shuruppak - Shankar kashyap (English) 2014

11-Bhator-R.EJ Burke- Shankar kashyap (English) 2014

12- Maati R.Ej - Shankar kashyap (English) 2014

13- Fireseer-Amy Raby- Shankar kashyap (English) 2014

سندھ کی تہذیب پر 1948ء میں ''مردوں کا ٹیلا'' کے نام سے ناول پہلی بار ہندی میں شائع ہوا۔ اس کے بعد 1998ء میں یعقوب یاور نے ''دل من'' لکھ کر اردو میں موہن جوداڑو اور ہڑپا کی کہانی سے پہلی بار اردو قارئین کو روشناس کرایا۔انھوں نے بڑی چابک دستی سے تہذیب سندھ کو ناول میں پیش کیا ہے۔اس ناول کے لکھنے کے محرکات کے بارے میں یعقوب یاور بتاتے ہیں۔

''دل من وادی سندھ کی قدیم ترین تہذیب پر مبنی ایک ناول ہے ۔اس خطے اور تہذیب سے بچپن ہی سے مجھے نہایت دلچسپی رہی ہے۔آٹھویں کلاس سے لے کر بی اے تک ہر سال تاریخ کے پرچے میں یہ سوال آتا رہا ہے،اور میں اس سوال کا جواب نہایت دلچسپی سے دیتا رہا۔اس تہذیب کے تعلق سے میں کلاس روم کے باہر بھی مطالعہ کیا کرتا تھا۔چنانچہ جب میں نے ناول کی جانب توجہ کی تو سب سے پہلے اس موضوع کا خیال آیا اور مجھے لگا کہ یہ ایک اچھوتا موضوع ہے اور میں اس کی بنیاد پر ایک اچھا ناول تخلیق کرسکتا ہوں ۔چونانچہ میں نے اپنے مطالعہ کو تازہ کیا۔نئی دریافتوں کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی ۔امریکن انسٹیٹیوٹ کی لائبریری میں (جو اس وقت بنارس میں ہوا کرتی تھے اور اب وہاں سے منتقل ہو کر گڑگاؤں چلی گئی ہے)ایک طویل عرصے تک آنا جانا رہا۔تین چار برس کی محنت کے بعد میرے بعد خاصا مواد جمع ہوگیا تو میں نے قلم اٹھایا میرا اندازہ تھا کہ اسے لکھنے میں مجھے ایک ماہ کا وقت لگے گا۔لیکن دو ہفتے کے بعد لگا کہ یہ ناول مکمل ہو چکا ہے۔۔۔۔دل من کے نام سے یہ ناول چھپ گیا جو اپنے آپ میں مکمل ہے۔'' 4

وسنت دیو کے مضمون کو پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''دل من'' سے پہلے اس موضوع پر دنیا بھر میں جتنے بھی ناول لکھے گئے ہیں اس میں ''دل من'' سب سے زیادہ مبسوط اور منظّم ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"In 1948,Rengeya Raghva wrote murdon ka teela in Hindi.its gloomy title meaning'Maund of the

dead'signifying Mohenjodaro was hardly one that world attract many readers.No novelist draed to write on the great civilization for half a century,till yaqoob yawar boldly"came out with dilmun in 1998."5

اس ناول کے موضوعاتی تجزیہ سے پہلے میں یہ چاہتا ہوں کہ اس چیز کی تاریخ کو پیش کر دیا جائے جس پر اس ناول کا انحصار ہے۔

موہن جوداڑو کی تاریخ برصغیر میں:

عام طور پر انسان کی تہذیب و تمدن کا تعلق اس کے کھانے کمانے کے ڈھنگ، رہن سہن کے طریقوں، علم و ہنر کے درجات اور ان کے افعال سے ہوتا ہے۔اس کے علاوہ آپس میں لوگوں کے ملنے جلنے اور خالی اوقات میں ان کے سیر و تفریح سے بھی ہوتا ہے۔انسان اپنی زندگی کے طریقے اور معیار سے کبھی خوش نہیں ہوتا ہے وہ ہمیشہ اپنے وقتِ حال سے مستقبل کو بہتر بنانا چاہتا ہے۔اسی بنا پر اس کو کامیابی نصیب ہوتی ہے۔یہی جدو جہد انسان کو روزی روٹی کمانے، رہنے سہنے کے پہلے سے بہتر طریقے سکھاتا ہے۔پروفیسر محمد مجیب لکھتے ہیں:

> ''تمدن یا تہذیب کے معنی ہیں انسان کا اپنی ذہنی اور اخلاقی قوتوں کو ترتیب دینا۔اور انہیں کام میں لانا۔جماعتوں کی تہذیب، افراد کی محنت، صلاحیت، ذوق یا فکر کی پیدا کی ہوئی چیزوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔'' 6

برصغیر میں تہذیب کی پہلی کرن شمالی مغرب کے علاقوں میں نمودار ہوئی۔اس کو ہڑپا تمدن کے نام سے جانا جاتا ہے۔یہ علاقہ ہڑپا تمدن میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔اس کو وادی سندھ کی تہذیب بھی کہا جاتا ہے۔اس کے متعلق جن چند خطوں کی کھدائی پہلی بار ہوئی وہ دریا سندھ کے کنارے تھے۔اس تہذیب کے نشانات موجود بلوچستان (پاکستان) سندھ، پنجاب، ہریانہ، گجرات، راجستھان اور مغربی اتر پردیش کے علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔اس تہذیب کا سب سے پہلے ملنے والا شہر پنجاب میں ہڑپا تھا۔جسے 1920

میں تلاشا گیا۔ دوسرا بڑا شہر سندھ میں موہن جوداڑو تھا۔ اس کے بعد کئی دیگر مقامات پر اس تہذیب کے نشانات دریافت کیے گئے ہیں۔ جن میں پنجاب میں روپڑ، راجستھان میں کالی بنگن، گجرات میں لوتھل اور ہریانہ میں بنوالی۔ لیکن مورخین نے موہن جوداڑو اور ہڑپا کو سندھ کی تہذیب میں زیادہ اہمیت دی ہے۔

1921 کے بعد سر جان مارشل اور ان کے ساتھیوں نے جو آثار دریافت کیے ان سے ہندوستان کی تاریخ میں تقریباً دو ہزار سالوں کا اضافہ ہوا اور دنیا کو قدیم ترین تہذیبوں میں سے بڑی تہذیب کا علم ہوا۔ اس پر ابھی بھی تلاش جاری ہے۔ اس تہذیب کا زمانہ 2500 ق م سے لے کر 1700 ق م تک ہے لیکن اس کا تسلسل 3800 ق م تک نظر آتا ہے۔ پرانی کھدایوں سے اس تہذیب سے وابستہ شہروں کی تعداد چالیس ہے۔ مگر اب ان میں سیکڑوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

ہڑپا اور موہن جوداڑو دو بڑے گنجان آبادی والے شہر تھے۔ دونوں تین میل سے زیادہ کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ دونوں شہر ترقی کی اعلی مثال تھے۔ سڑکیں پختہ کشادہ، جو جنوب سے شمال کی جانب جاتی تھیں۔ اور زاویہ قائمہ پر مڑ جاتی تھیں۔ موہن جوداڑو کی سڑکیں لمبی اور چوڑی تھیں۔ ڈی۔ڈی کوسمبی نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اس کی تصویر پیش کی ہے:

> ''وادی سندھ کے شہر حقیقی معنی میں ایک حیرت ناک قسم کی شہری منصوبہ بندی کا مظہر ہے۔ زاویہ قائمہ بناتی ہوئی سیدھی سڑکوں کے علاوہ بارش کے پانی کے لیے ایک نہایت ہی اعلی نکاشی کا نظام موجود تھا۔ اور نالیوں کو گندے پانی سے صاف کرنے کے لیے چوبچے تھے۔ اس طرح کی کوئی بھی چیز کسی ہندوستانی شہر میں عہد حاضر تک نہیں ہے۔ آبادی کا نقشہ لاجواب تھا۔ عمارت 400x200 گز کے مستطیل سلسلے تھے جن میں وسیع بڑی سڑکیں عمدہ چھوٹی گلیاں۔ دنیا میں اور کہیں ایسا شہری نظام نہیں ملا جو اس قدر نفاست رکھتا ہو اور اتنے قدیم زمانے میں اسے محتاط منصوبے کے تحت قائم کیا گیا ہو۔'' 7

موہن جوداڑو کے مکانات کئی منزلہ اور محل نما ہوتے تھے۔ عمارتیں پختہ اچھے مسالے اور اینٹوں کی

بنی ہوتی تھیں۔ ان مکانوں میں صحن بھی ہوتے تھے۔ کبھی ایک کبھی ایک سے زیادہ۔ ماہرین آثار قدیمہ نے ایک ایسے مکان کا نقشہ بھی پیش کیا ہے جس میں چار بڑے صحن اور دس کمرے تھے۔ ان میں رہائش کی سہولتیں بہت عمدہ تھیں۔ غسل خانے اور حمام کثرت سے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سندھ کے شہریوں کو جسمانی صفائی کی بڑی فکر رہتی تھی یا پھر غسل کرنا ان کے مذہبی آداب میں شامل تھا۔ سڑکوں پر جگہ جگہ حوض بنے تھے۔ گلی بازاروں اور ہر جگہ اینٹوں کی نالیاں تھیں۔ اسی طرح کوڑے کے لیے جگہ جگہ برتن رکھے گئے تھے۔ سر مورٹیمر وہیلر کا کہنا ہے کہ:

''موہن جوداڑو اور اس کے دیگر مقامات پر اس تہذیب کی خصوصیت میں صفائی کے لیے معائنہ کرنے کو (ان نالیوں میں) پاٹے ہوئے سوراخ بنے ہوئے تھے۔ قدیم ایشیا میں یہ اپنی طرز کا سب سے مکمل نمونہ ہے۔ سارے شہر سے یہ عیاں ہے کہ اس کے عروج کے وقت وہاں خوشحال متوسط طبقہ آباد تھا۔ اور بلدیائی نظام بڑے جوش و خروش سے چلایا جاتا تھا۔'' 8

اور رما شنکر ترپاٹھی لکھتے ہیں:

''حمام اور اینٹ کے مدور کنویں اکثر گھروں کی اہم خصوصیت تھی۔ نالیوں کے ذریعے پانی کے نکلنے کا انتظام مکانات میں بھی اور سڑکوں پر بھی حیرت انگیز تھا۔ کوڑے کرکٹ کے لیے ڈھولوں اور بدرو کے لیے چہ بچوں کا انتظام ظاہر کرتا ہے کہ لوگ سرکاری نگرانی کا شعور رکھتے تھے۔ مجموعی طور پر خوشحال تھے اور معمولی حیثیت کے گھروں میں بھی ضرورت کا کل سامان مہیا رہتا تھا۔ بڑی بڑی عمارتیں شائد سرکاری ملکیت میں تھی۔'' 9

اناج کے بڑے بڑے گودام بھی تھے۔ اناج کا ایک گودام موہن جوداڑو کے قلعہ بندی کے نیچے ڈھلان والے سرے پر تھا۔ اس کی لمبائی 150 فٹ اور چوڑائی 75 فٹ تھی۔ اس عمارت کے ستائیس (27) حصے تھے اور اناج کے پرانے ذخیروں پر انتظامی کنٹرول بھی تھا اس گودام کی حیثیت قومی بینک جیسی تصور کی جاسکتی ہے۔ یہاں بادشاہ اور مذہبی پیشواؤں کی ملی جلی طرز حکومت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان تمام دریافت شدہ تہذیب کو وادی سندھ کی تہذیب کا نام دیا گیا۔ اس تہذیب کے نشانات دوسرے شہروں میں بھی دریافت کیے گئے ہیں۔ سندھ کی تہذیب میں لوگوں کی معیشت کا دارومدار زراعت اور تجارت پر منحصر تھا۔ وہ گندم اور جو، کی کھیتی کرتے تھے۔ جانوروں میں بیل، بھیڑ، بھینس اور ہاتھی تھے۔ کھدائی میں ان کی ہڈیوں سے پتا چلتا ہے۔

وادی سندھ کی تہذیب کے رسم الخط کو پڑھنے کی دنیا بھر کے ماہرین نے بہت کوشش کی لیکن ابھی تک کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ تحریریں مختلف مہروں، برتنوں پر کنندہ ہیں۔ جن پر ہرنیں، گھوڑے، بیل، بکری وغیرہ اور دوسری چیزوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ بعض مہروں پر مرد دیوتاؤں کی تصاویر بھی ہیں۔ اسکے علاوہ شادی، بیاہ کی رسمیں اور مذہبی عقائد کا بھی پتا چلتا ہے۔ یعقوب یاور نے بھی اپنے اس ناول میں ان سب چیزوں کو جگہ دی ہے۔ موہن جوداڑو، دل من کا دوسرا نام ہے۔ سموئیل این کریسم جیسے مورخین نے سمورین ادب میں مذکورہ دل من کو وادی سندھ کا ایک شہر تصور کیا ہے۔ وادی سندھ کا دوسرا اہم شہر ہڑپا ہے۔ جس کو سری ارون نے اپنی کتاب 'بھارتیہ پرااتہاس کوش' میں ہڑپا کے قدیم نام کے لیے ''ہریپو پکا'' نام استعمال کیا ہے۔ ''دل من'' میں یعقوب یاور نے بھی ہڑپا کے لیے ''ہریوپکا'' نام استعمال کیا ہے۔ پیش لفظ میں ناول نگار خود لکھتے ہیں:

> ''موہن جوداڑو بمعنی ''مردوں کا ٹیلا'' کا جدید نام مورخین نے اپنی سہولت کے لیے رکھا ہے۔ یہ اس شہر کا اصل نام نہیں ہوسکتا، اسی لیے کریمر کے دلائل کی روشنی میں اس ناول میں موہن جوداڑو کا قدیم نام دل من تصور کیا گیا ہے۔ وادی سندھ کا دوسرا اہم شہر ہڑپا ہے۔ شری ارون نے اپنی کتاب ''بھارتیہ پرااتہاس کوش کے صفحہ 541'' پر ہڑپا کے قدیم نام کے لیے ہریوپیکا کا اسم استعمال کیا ہے۔ اس ناول میں ہڑپا شہر کے اس نام کا یہی جواز ہے۔'' 10ء

ناول دل من کا جائزہ:

''دل من'' یہ ایک نیم تاریخی ناول ہے۔ اس کا پس منظر تمدنِ سندھ ہے۔ ناول کو پڑھنے کے بعد یہ

معلوم ہوتا ہے کہ اس ناول میں تمدن سندھ کے بہت ہی پرانی تہذیب کو بیان کیا گیا ہے۔ اس ناول میں عورت کو مرکزیت حاصل ہے جو مظلوم ہے اور اس کا جنسی استحصال ہوتا ہے۔ جس کی بنا پر اس کے اندر بدلے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنا بدلہ لینے کا تہیہ کرتی ہے۔ وہ اپنی پوری زندگی کو اپنے اوپر ہوئے ظلم کے بدلے کے لیے صرف کر دیتی ہے۔ اور آخر میں کامیاب بھی ہوتی ہے۔ ناول میں یہ مرکزی کردار دیوانئ نامی ایک خوبصورت لڑکی ہے۔ جس کے والدین مر چکے ہوتے ہیں۔ شہر دل من میں وہ اور اس کا بھائی ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں۔ سندھ کی تہذیب و تمدن کے مطابق ایک دوسرے سے پیار بھی کرتے ہیں۔ اور شادی کا ارادہ بھی رکھتے ہیں اور پیار کی وہ ساری باتیں بھائی اور بہنوں میں چلتی تھیں جو عام عاشق و معشوق میں ہوتا ہے۔ جب متھو، دیوانئ کی تعریف کرتا ہے تو دیوانئ اس کی زبان سے نکلنے والے کلمات سے بہت خوش ہو جاتی تھی اور اس کے اوپر نامعلوم سی کیفیت چھا جاتی تھی۔ دونوں کا پیار پروان چڑھتا ہے اور شادی تک بات پہنچ جاتی ہے۔ ناول نگار کے خیال میں آریوں سے قبل بھائی بہنوں کے درمیان شادی کی روایت رہی ہوگی۔ شاید اسی وجہ سے ناول میں دیوانئ اور متھو آپس میں پیار و محبت کرتے تھے اور شادی بھی کرنا چاہتے تھے۔ اس قضیہ کو یعقوب یاور نے ناول میں اس طرح سے پیش کیا ہے:

> ''میرا نام دیوانئ ہے میرا بھائی متھو پرایہ مجھ سے کہا کرتا تھا میں بہت سندر ہوں اور دیوتاؤں نے میرے شریر کو بنانے میں کافی سمے لگایا ہوگا۔ جب وہ ایسا کہتا تھا تو مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ ہم دونوں نے من ہی من میں یہ طے کر رکھا تھا کہ آپس میں وواہ کر کے جیون آرام سے گزاریں گے۔ پرنتو وہ سب کہاں ہو پاتا ہے جس کی اچھا کی جائے میری سندرتا ہی میری سب سے بڑی شترو نکلی۔ اچھا ہوتا کہ میں اتنی سندر نہ ہوتی۔۔۔ متھو نگر پالک کے باغیچے کا مالی تھا۔ روز سویرے سورج نکلنے کے پہلے ہی اسے باغیچے میں پہنچ جانا ہوتا تھا۔ جب سورج کچھ اونچا ہو جاتا تو وہ اپنا سویرے کا کام ختم کر کے گھر آتا اور کھانا کھا کر ہم دونوں دیر تک اپنے بھوشیہ کے سپنے دیکھا کرتے۔ شام میں وہ پھر کام پر جاتا اور اس بار اس کی واپسی سورج ڈوبنے کے بعد ہوتی۔ کبھی

کبھی کام کچھ زیادہ ہوتا تو آنے میں دیر بھی ہو جاتی۔ جب جب ایسا ہوتا میں گھبرانے لگتی۔ایک انجان سا بھے ہر سمے مجھے گھیرے رکھتا تھا۔''11؎

ناول میں یعقوب یاور نے مرکزی کردار دیوانئ جو بہت ہی حسین وجمیل تھی۔ سندھ کی تہذیب و عقیدے کے مطابق اس پر دیوتاؤں کا بہت کرم تھا اور وہ خاص قسم کی لڑکی تھی۔ تقریباً پورا ناول اسکے اردگرد گھومتا ہے۔ ناول کا ایک کردار'' راجا کشال'' جو کہ دل من کا نگر پالک ہوتا ہے اور اسے مہامن کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ جو شراب میں مست رہتا تھا اور اسے حسین لڑکیاں بہت پسند تھیں۔ راجہ ہونے کے ناطے جسے چاہتا وہ اپنے ہوس کا شکار بنالیتا تھا۔

کشال اپنے مہاویروں کے ساتھ جنگل میں شکار پر نکلا تھا۔ دیوانئ بھی جنگل میں لکڑیاں چننے کے لیے گئی تھی۔ اتفاق سے راجہ کے ایک ویر کی نظر دیوانئ پر پڑی۔ ویر دیوانئ کو دیکھ کر ہی یہ سوچنے لگا کہ اگر ہم اس حسین لڑکی کو راجا کے سپرد کرتے ہیں تو راجا ہمیں انعام واکرام سے نوازے گا۔ کیونکہ تمام ارکان سلطنت یہ جانتے تھے کہ راجہ کشال عورتوں کو تفریح کا سامان تصور کرتا تھا اور ہر حسین عورت اس کی کمزوری تھی۔ جسے وہ اپنا کر اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل کرتا تھا۔ جب ویر نے دیوانئ کے بارے میں راجا کو بتایا تو راجا بہت خوش ہوا۔ اور کہا کہ اسے ضرور ہمارے پاس لایا جائے، لیکن جب اسے راجا کے پاس لایا گیا تو جہاں دیوانئ بہت ہی گھبرائی اور سہمی ہوئی تھی اس نے ایک چالاک لڑکی ہونے کا ثبوت دیا اور راجا سے کہا کہ میری شادی ہو چکی ہے۔ سندھ کی تہذیب میں یہ شامل تھا کہ شادی شدہ عورت کو برے سے برا آدمی بھی اپنی ہوس کا شکار نہیں بناتا تھا۔ اسی وجہ سے راجہ کشال نے اسے اس وقت تو کچھ نہیں کہا اور گھر جانے کی اجازت دے دی لیکن راجہ کشال کی نظر میں دیوانئ کی خوبصورتی بیٹھ گئی تھی اور اس کے بارے میں ہمیشہ سوچتا رہتا تھا۔ ناول نگار نے کشال کی جنسی خواہشات کے عزائم کو ناول میں اس طرح سے لکھا ہے کہ وہ عورتوں کو تفریح کا سامان سمجھتا تھا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''رات دن سوتے جاگتے وہ اس سحر کار اپسرا کو نہیں بھول پائے تھے۔ وہ آنکھیں بند کرتے تھے تو اس اپسرا کی متحرک پشت کا منظر دل ودماغ پر مسلط ہونے لگتا۔ وہ اپنے

اصولوں سے مجبور تھے ورنہ کسی عورت کا حصول ان کے لیے مشکل کام نہ تھا۔ وہ شادی شدہ عورتوں سے دور رہتے تھے اور اب ان کا یہ اصول ان کے دل میں پھانس بن کر چبھ رہا تھا۔ لاکھ کوششوں کے باوجود وہ روپسی اپسرا ان کے تصور سے باہر نہیں نکلی۔''12؎

شہر میں تلاش و جستجو کے بعد معلوم ہوا کہ دیوانئ نگر پالک کے باغبانی پر مامور متھو کی بہن ہے اور راجہ کشال اس لڑکی کی یاد کو بھول نہیں پاتا تھا اس لیے اس نے اپنے ویروں کو حکم دیا کہ اس لڑکی کے بارے میں پوری معلومات حاصل کی جائے۔ ایک دن راجہ کشال دیوانئ کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس کا ایک ویر آیا اور کہا کہ مہامن کو آداب۔ ہم نے جو جنگل میں لڑکی دیکھی تھی اور جس نے ہم سے کہا تھا کہ میری شادی ہو گئی ہے حقیقت میں اس کی شادی نہیں ہوئی ہے لیکن جلد ہی وہ اپنے بھائی متھو سے شادی کرنے والی ہے۔ جب راجا کشال کو معلوم ہوا کہ وہ غیر شادی شدہ ہے تو کشال کے ذہنی رویہ کو ناول نگار نے اس طرح سے لکھا ہے:

''سورج ڈوبنے سے پہلے ساری جانکاری لے کر مہا کرتا کروٹا نگر پالک کے سامنے تھا اس نے کشال کو وہ ساری باتیں بتا دیں جو اسے مختلف ذرائع سے معلوم ہوئی تھیں۔ مہا کرتا کی باتیں کشال بڑے غور سے سن رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے سنا کہ دیوانئ کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے تو جیسے کہ اس کے دل کی کلی کھل گی۔ یہ جان کر اسے غصہ بھی آیا کہ دیوانئ نے اسے احمق بنایا تھا لیکن وہ ناراض نہیں ہوا کہ اب اس جیسی روپسی کے وصال کی اتنی قیمت تو دینی ہی چاہیے۔''13؎

پھر کشال ان تمام باتوں کو سننے کے بعد دل ہی دل میں خوش ہوا کہ چلو اچھا ہوا دیوانئ شادی شدہ نہیں ہے۔ راجہ کشال اپنے ویروں کو حکم دیا کہ جتنا جلدی ہو سکے دیوانئ کو میرے محل میں لایا جائے۔

دیوانئ کو یہ اندیشہ تھا کہ کشال جو کہ عیاشی اور شراب نوشی میں مست رہتا ہے اور اس کی نظر بد مجھ پہ پڑ چکی ہے وہ کسی وقت بھی میری عزت کو تار تار کر سکتا ہے۔ دیوانئ نے اپنے بھائی متھو کے ساتھ یہ منصوبہ بنالیا

تھا کہ بہت جلد ہم آپس میں شادی کر لیں گے۔لیکن رات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ اس کے گھر کو راجہ کشال کے ویروں نے گھیر لیا تھا۔دیوانئ جب اپنے دروازے پر آتی ہے تو دیکھتی ہے کہ کشال کے ویر باہر کھڑے ہیں اور دیوانئ کو دیکھ کر ویر کہتے ہیں کہ راجہ کشال آپ کو مہمان بنانا چاہتے ہیں۔آپ مہربانی کر کے ہمارے ساتھ چلئے جب دیوانئ یہ بات سنتی ہے تو اسے بہت ہی خوف و دہشت ہوتی ہے۔اسے یقین ہو جاتا ہے کہ آج مجھ پر قہر ٹوٹنے والا ہے۔راجہ کشال کے ویر جبراً دیوانئ کو دربار میں پیش کرتے ہیں۔چند عورتیں اسے غسل دلا کر غازے سے سجاتی ہیں اور دوشیزگی کے لباس میں کشال کے بستر استراحت پر بیٹھا دیتی ہیں۔راجہ کشال اپنی جنسی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے جب دیوانئ کی طرف بڑھتا ہے۔تو دیوانئ اس سے منت و سماجت کرتی ہے۔لیکن کشال کے نہ ماننے پر وہ غصہ میں آجاتی ہے اور تلخ آواز میں گالی بھی دیتی ہے۔کیونکہ دیوانئ ایک ایسی لڑکی تھی جس کے اندر خود اعتمادی اور احتجاجی اثرات موجود تھے۔جس سے اس نے خود کو راجا کے حوالے نہیں کیا بلکہ راجا نے زبردستی اس کا استحصال کیا درج ذیل اقتباس میں دیوانئ کے احتجاجی رویے اور بے بسی کو دکھایا گیا ہے:

''کشال اس کے پاس بیٹھ گیا اور بولا اس نگر کی کوئی بھی سندری اپنے پالک کے آتھیہ سے پرسن ہوسکتی ہے تم بھاگیہ وان ہو تمہیں بھی پرسن ہونا چاہئے، مجھے چھوڑ دو کتے ورنہ میں تجھے کچا چبا جاؤں گی غصے میں کانپتی ہوئی دیوانئ نے چیختے ہوئے کہا۔ کمرے میں تھپڑ کی آواز گونجی اور دیوانئ نڈھال سی بستر پر گر گئی۔کشال نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کے کپڑوں کو کھولنا شروع کر دیا۔جیسے جیسے دیوانئ کا تانبے جیسا بدن اس کے سامنے کھل رہا تھا، اس کے ہوش حواس رخصت ہوتے جا رہے تھے۔ دیوانئ اب کوئی مزاحمت نہیں کر رہی تھی اس کا نڈھال جسم بستر پر بکھرا ہوا تھا اور کشال کسی فاتح کی طرح اس کے شکست خوردہ جسم سے من مانی کر رہا تھا۔رات اپنا سفر طے کر رہی تھی اور دیوانئ کا مقدر اپنی زندگی میں اب کبھی نہ آنے والی صبح کے غم میں بستر پر پڑا اسسکیاں لے رہا تھا۔''14

راجا کشال دیوانئ کی ایک بھی نہ سنا اپنے جبر وقہر کو بلند کرتے ہوئے دیوانئ کو مارا اور اپنی جنسی آسودگی حاصل کرنے کے بعد اسے روپ نگر بھیج دیا۔ روپ نگر یہ وہ جگہ تھی جہاں راجا کشال کے ذریعے جنسی استحصال کے بعد خواتین بھیجی جاتی تھیں۔ وہاں کچھ عورتیں خبط کا شکار ہو جاتی تھیں اور کچھ اپنی موت کا انتظار کرتی تھیں۔ اور کچھ عورتیں دوسرے مردوں کے جنسی خواہشات کا سامان بن جاتی تھیں۔ دیوانئ کی پہلی رات روپ نگر میں بہت ہی تکلیف سے گزرتی ہے۔ مسا کا نام کا ایک آدمی جس کی نظر بد دیوانئ پر پڑی تھی وہ بھی اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل کے لیے روپ نگر دیوانئ کے پاس پہنچتا ہے اور جب دیوانئ کی نگاہ اس پر پڑتی ہے تو راجا کشال کی طرف سے کیے گئے جبر وظلم اس کے سامنے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اس کے اندر آگ بھڑک اٹھتی ہے لیکن اس نے اپنے غصہ پر قابو رکھا اور بڑی ہی چالاکی کے ساتھ خوش اسلوبی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ مسا کا اپنی ہوس کی تکمیل کے لیے بہت ہی جلدی میں تھا اسے کسی طرح کا ڈر اور خوف بھی نہ تھا کہ دیوانئ اس کے ساتھ کچھ کر سکتی ہے۔ لیکن دیوانئ نے دل میں یہ بیٹھا لیا تھا کہ اب ایک ایک کر کے مرد ذات سے بدلا لے گی جو اس کا جنسی استحصال کرے گا۔ دیوانئ کی چالاکی اور اس کی ذہنی سطح جس میں سنجیدگی اور پختگی ہے اس کو ناول نگار نے اس طرح سے لکھا ہے۔:

> ''اور بولی مسا کا اتنی جلدی بھی کیا ہے ابھی رات ہی کتنی ہوئی ہے۔ تم ٹھیک کہتی ہو
> دیوانئ پرنتو میں اپنے ویاکل من کا کیا کروں برسوں پرتیکشا کی ہے تمھاری اب تم ملی ہو
> دھیریہ نہیں آتا۔ تو ٹھیک ہے دیوانئ نے کہا۔
> یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ چراغ گل کیا اور پلٹی تو اس کا محافظ خنجر اس کے ہاتھ میں
> تھا۔ مسا کا اندھیرے میں دیکھ نہیں پایا اور ایک ہی لمحہ میں تیز دھار والا یہ خنجر اس کے
> سینے میں بائیں طرف پیوست ہو چکا تھا۔'' 15

مسا کا دیوانئ کی ہوشیاری کو سمجھ نہ پایا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا دیوانئ نے اپنی ذہانت اور بلند عزائم اور خود اعتمادی کے بل بوتے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس بات کی خبر پورے شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ کیوں کہ اس طرح کا منظر کبھی کسی نے دیکھا ہی نہیں تھا کہ ایک عورت کسی مرد کو موت کے

گھاٹ اتارتی ہو۔ روپ نگر کی عورتیں بہت تعجب و حیرت سے اس منظر کو دیکھ رہی تھیں۔ اسی قتل کے جرم میں دیوانئ کو شہر دل من جو چاروں طرف سے آہنی دیوار سے محیط ہوتا ہے اس کے باہر جنگل میں پھینک دیا جاتا ہے تا کہ درندے کھا ڈالیں اس سماج میں یہ قانون تھا کہ اگر کوئی عورت کسی مرد کے خلاف کوئی بات کہتی یا کوئی کام کرتی تو وہ گناہ گار ثابت ہوتی تھی۔ دیوانئ نے تو قتل کیا تھا اس لیے اسے پورا سماج گناہ گار سمجھتا تھا۔ اور سب کو یقین تھا کہ دیوانئ مرجائے گی لیکن دیوانئ کو ذرا بھی افسوس نہیں ہوا کہ اسے جنگل میں پھینک دیا گیا۔

جنگل میں پورے دن بھوک و پیاس نے دیوانئ کو نڈھال کر دیا تھا جیسے جیسے سورج بادلوں میں چھپ رہا تھا اس کی زندگی کی سانسیں بھی ختم ہو رہی تھیں۔ لیکن اس کو یہ بات دامن گیر تھی کہ میں اپنی عزت کا بدلہ راجہ کشال سے ضرور لوں گی۔ دیوانئ ان عورتوں میں سے نہیں تھی جو کسی بھی ظلم وستم کو آسانی سے برداشت کر لے وہ ہار نہیں ماننے والی تھی وہ اپنے وجود اور ضمیر کی آواز پر اٹھ کھڑی ہونے والی عورت تھی۔ اس جنگل میں اسے یہ امید تھی کہ میں یہاں بھی اپنی زندگی گزار سکوں گی اور ایک دن اپنی اس عصمت ریزی کا بدلہ کشال سے ضرور لوں گی۔ دیوانئ کے اندر خود اعتمادی تھی وہ اپنا مقدر خود بنانے پر یقین رکھتی تھی۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اگر دل میں خود اعتمادی ہو تو منزل خود بخود مل جاتی ہے۔ دیوانئ کے ساتھ ایسا ہی ہوا جب جنگل میں بھوک و پیاس کی شدت برداشت نہ کر پا کے وہ بے ہوش گئی لیکن جب اسے ہوش آیا تو دیوانئ خود کو ایک بزرگ کی کٹیا میں پائی۔ سارے احوال اس صوفی منش کو سنائی اور اپنی زندگی کے مقصد سے باخبر کی۔ اور سنت کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ایک مظلوم لڑکی ہے بعد میں سنت کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے ایک دن جب دیوانئ آشرم کے قریب ایک چٹان پر سوئی رہتی ہے تو اس پر پھولوں کی بارش ہوتی ہے اور ایک ناگ آتا ہے اور اس کے پاس بیٹھ جاتا ہے یہ منظر دیکھ کر مہرشی سمجھ جاتے ہیں کہ دیوانئ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ پر وہ خواب حقیقت پر منحصر ہوتا ہے جس سے مہرشی کو اس بات کا پورا یقین ہو جاتا ہے کہ دیوانئ کو غیبی طاقت حاصل ہے یہ عام لڑکیوں سے الگ ہے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد دیوانئ کو شہر گملا نگر ہجرت کرنے کو کہتے ہیں جہاں عورتوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وہاں کا نگر پالک کوشک نارتھا۔ مہرشی کی وجہ سے اس نے

کافی عزت دی اور دیوانئ کو محل میں ٹھہرایا۔ کچھ ماہ بعد دیوانئ کو لڑکا پیدا ہوا جس کا نام مہرشی کی وصیت کے مطابق سرال رکھا گیا۔

راجہ کوشک نار نو آمد شیر خوار بچے کے خوشی میں ایک جشن کا انعقاد کرتا ہے اور اس محفل میں صرف شادی شدہ لوگوں کو آنے کی دعوت دی جاتی ہے سب اپنی اپنی بیویوں کے ساتھ آتے ہیں۔ اس جشن میں دوسرے شہر کے لوگ بھی مدعو کیے گئے تھے۔ جس میں دل من کے راجا کشال کی طرف سے اس کے ویرآئے تھے۔ جس بچے کی ولادت پر جشن کا اہتمام ہوتا ہے وہ راجہ کشال اور دیوانئ کا لڑکا تھا۔

اس جشن میں اناث و ذکور کا آپس میں ملنا، عریاں رقص اس طرح کی چیزیں تھیں جشن کا ایک اصول ایسا تھا کہ اس جشن میں اگر کوئی عورت حاملہ ہوتی تھی تو اس کا سارا اخراج راجہ پر عائد ہوتا تھا۔ اس میں بہت سی عورتیں حاملہ ہوئیں اور راجا کوشک نار کی عورت بھی حاملہ ہوئی اور اسے بچی پیدا ہوتی ہے۔

کچھ ماہ بعد جب دیوانئ کو پتہ چلتا ہے کہ راجا کشال کو ہمارے یہاں رہنے کی بھنک لگ گئی ہے۔ تو وہ سوچتی ہے کہ یہاں سے بھی اب ہمیں نکلنا پڑے گا دیوانئ گملا نگر سے نکل جاتی ہے اور سرال کو ابتدائی تعلیم کے لیے دوسرے شہر ہر یو پیکا (ہڑپا) بھیج دیا جاتا ہے۔ سرال اپنی تعلیم کے لیے جب دوسرے شہر میں مقیم ہوتا ہے اسی درمیان راجہ کشال نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہاں جا کر اس لڑکے کو ختم کر دیا جائے جو میرے راج پاٹھ اور مجھے ختم کرنا چاہتا ہے۔ لیکن سرال نے راجا کشال کے منصوبے کو بدل دیا اور بہت ہی جواں مردی کے ساتھ کشال کے ویروں کا مقابلہ کیا اور انہیں موت کے گھاٹ بھی اتار دیا۔ کشال کے سپاہیوں کے قتل کی خبر جب شہر کے لوگوں اور گروکل کے استادوں کو ہوئی تو انہیں بے چینی ہوئی اور ڈر ستانے لگا اور وہ سوچنے لگے کہ شاید اب راجا کشال اس کا بدلہ ہم سے لے گا۔ اور سرال ہر یو پکا سے رات کے اندھیرے میں ایک نئے شہر سمیریا کی طرف ہجرت کر گیا۔ فن سپہ گری میں ماہر ہونے کے سبب سمیریا میں اسے خوب سراہا گیا۔ اور وہاں کا راجہ "پتیشی لوگل زگسی" نے اپنی فوج کی کمان اسے سونپ دیا اور کچھ ہی دنوں میں سرال کو ایک جنگ کے لیے دوسرے شہر بھیج دیا جب دشمنوں پر فتح یابی حاصل کر کے سرال واپس آیا تو وہاں کے راجہ اور عوام میں خوشی

کی لہر دوڑ گئی سبھی نے بڑی ہی دل جمعی اور ذوق وشوق کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ ناول کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''سرال ایک ہاتھی پر سوار آگے چل رہا تھا یہ ہاتھی شاروکین نے اپنے لیے مشرق سے منگوایا تھا شہر کی سرحد پر اس نے پتیسی کو دیکھا تو، نیچے اتر کر پیشی اور مقدس من انت کو ان کے مرتبے کے مطابق احترام دیا پھر کچھ مذہبی رسومات ادا کی گئی سرال نے اہل شہر کے درمیان کچھ وقت گزارا یاردوس اور مارتیسی سے وہ خاص طور پر ملا آپس میں دعاؤں کا تبادلہ ہوا اور آخر میں سرال پھر سے پتیسی لوگل گسی کے پاس آ گیا اور بولا آنند کے اس اوسر پر میں آپ سے کچھ مانگنا چاہتا ہوں آشا ہے انکار نہ کریں گے۔''16

دیوانئ کو اپنے بیٹے سرال کی ساری خبریں ملتی رہتی تھیں۔ دیوانئ دل ہی دل میں بہت خوش تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ اب میرا بیٹا اس لائق ہو گیا ہے کہ اپنے اس بیٹے کے ذریعے کشال سے اپنا بدلہ لے سکتی ہوں۔ سرال اپنی ماں سے بے پناہ محبت کرتا تھا ماں کی بات بلا چوں چراں تسلیم کرتا تھا۔ ناول نگار دیوانئ کی محنت جہد مسلسل کو اس انداز سے دکھایا ہے کہ کشال نے جب دیوانئ کی عصمت دری کی تو اس کے بعد دیوانئ نے اپنے دل میں یہ بات ٹھان لی تھی کہ ایک دن ضرور اپنی عصمت کا بدلہ اس کی جان سے لوں گی۔ اس کے خاطر کشال کے نطفے کو اپنے رحم مادر میں بڑھنے دیا اس کی پیدائش کے بعد اس کو پالا پوسا اور اس کی تعلیم و تربیت کی اور اس لائق بنا دیا تھا کہ وہ کشال کو موت کے گھاٹ اتار سکے۔ سارا واقعہ دیوانئ کے منشا کے مطابق ہوا پھر دیوانئ نے اپنے بیٹے سرال سے اپنے اوپر کشال کی طرف سے کیے گئے سارے ظلم و جبر کو بتا دیا۔

سرال کملانگر میں پہنچنے کے بعد کوشک نار کی بیٹی تارکی سے شادی کیا کچھ دن آرام کرنے کے بعد دل من پر حملہ آور ہوا۔ راجا کشال کو ہلاک کر کے اپنا پرچم دل من پر لہرایا۔ اس طرح سے دیوانئ نے اپنا بدلہ راجا کشال سے لیا۔ دیوانئ نے اس بدلے کے لیے اپنے آپ کو کئی مصیبتوں سے گزارا تھا۔ کئی امتحانات سے اسے گزرنا پڑا تھا لیکن اس کے اندر بغاوت اور بدلے کا جذبہ اس قدر بھرا ہوا تھا کہ اس نے کبھی اپنے آپ کو کمزور نہیں سمجھا جس طرح پہلی بار اس نے مسا کا کا قتل کیا اور اس نے اپنے دل میں یہ بات ٹھان لی تھی کہ

میں نے پہلے درجہ کی مخلوق پر جیت حاصل کر لی ہے۔اس طرح کشال کے قتل کے بعد اس کے دل میں یہ سکون ہوا کہ جس نے میرے جنسی حق کو اجازت کے بغیر حاصل کیا اسے اس کی قیمت اپنی جان گنوا کر دینی پڑی۔ یہ اس ناول کا مرکزی موضوع ہو جس کو مصنف نے بڑے ہی چابک دستی سے بیان کیا ہے۔ یہ اس ناول کا اہم حصہ ہے کہ عورت اپنے اوپر ہوئے ظلم کا بدلہ لیتی ہے۔جس میں یعقوب یاور نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عورت نے اپنے حق کی لڑائی سندھ کی تہذیب میں بھی کی ہے حالانکہ ناول کا انحصار حقیقت پر مبنی تو نہیں ہوتا ہے۔اس واقعہ کے ذریعہ موہن جوداڑو کی تہذیب وثقافت کو بیان کیا گیا ہے ناول میں بیان کردہ واقعہ کے مطابق موجودہ ترقی یافتہ دور میں جو تانیثیت یا نسائی تحریک ہے اس کے نمونے سندھ کی تہذیب میں ملتے ہیں۔لیکن وہ شاید شاذ و نادر تھے جس کو ناول میں بیان کیا گیا ہے۔ دیوانئی کے اس احتجاج اور بغاوتی تیور کو اس زمانے کی عورتیں بھی بہت ہی عجیب اور حیرت انگیز مانتی تھیں۔حالانکہ ناول کے ان واقعات کو کلی طور پر تاریخ کا حصہ نہیں کہہ سکتے ہیں کیوں کہ ناول کا پلاٹ تخیل اور تصور پر منحصر ہوتا ہے۔ یعقوب یاور خود لکھتے ہیں:

> ''اس ناول میں کہانی کو آگے بڑھانے میں تاریخی حقائق کا لحاظ رکھا گیا ہے۔اس بات کا لحاظ بھی رکھا گیا ہے کہ معلوم سیاسی، تہذیبی اور مذہبی حقائق کے خلاف کوئی بات نہ آنے پائے۔ پھر بھی یہ تخیل پر مبنی ایک ناول ہے۔تاریخی دستاویز نہیں اس لیے اس کا امکان ہیں کہ کہیں کوئی ایسی بات آ گئی ہو جو تاریخی حقائق سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔''[17]

یعقوب یاور کے اس بات سے یہ اندازہ لگ جاتا ہے کہ اس ناول میں حتی المقدور تاریخ کا سہارا لیا گیا ہے۔ اس بنا پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ سندھ کی تہذیب میں کچھ ایسی صورتیں رہیں ہوں گی اور کچھ عورتوں نے اپنے حق کے لیے آواز اٹھائی ہوں گی۔موہن جوداڑو میں دیوانئی نے اپنے جنسی استحصال کے خلاف مردوں سے جنگ چھیڑی تھی اور اس میں اس کی جیت ہوئی۔

جب کوئی بھی ناول لکھا جاتا ہے تو اس کا ایک مرکزی موضوع ہوتا ہے اس کے علاوہ ایسے فروعی

واقعات ومسائل کو بھی پیش کیا جاتا ہے جس کے تحت مرکزی موضوع پائے تکمیل کو پہنچتا ہے۔ جس کی بڑی اہمیت ہے۔ ناول میں جزئی مسائل کے طور پر بھائی بہن میں شادی کی تہذیب کو ناول نگار نے پیش کیا ہے۔ موہن جوداڑو کی تہذیب میں یہ رائج تھا کہ اگر دیوتا بھائی بہن کی شادی سے خوش ہے تو سماج بھائی بہن کی شادی کو خوشی سے قبول کر لیتا ہے۔ ناول میں مرکزی کردار ''دیوائی'' ہے اور اس میں ایک ذیلی کردار اس کا بھائی ''متھو'' ہے یہ اپنے بہن دیوائی سے بے حد پیار کرتا تھا۔ دیوائی بھی اپنے بھائی متھو سے پیار کرتی تھی دونوں آپس میں شادی کرنا چاہتے تھے۔ دونوں پوری تیاری بھی کر چکے تھے پر اسی دوران کشال اپنے ویروں کی مدد سے دونوں کو گرفتار کراتا ہے اور دیوائی کو اپنی ہوس کا شکار بنالیتا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس میں دیوائی کے ان ارادوں کو مصنف نے پیش کیا ہے۔ جو سندھ کی تہذیب میں ایک لڑکی کے دل میں پنپتی تھی:

> ''ہم دونوں من ہی من میں یہ طے کر رکھا تھا کہ آپس میں ویواہ کر کے جیون آرام سے گزاریں گے پرنتو وہ سب کہاں ہو پاتا ہے جس کی اچھا کی جائے۔ میری سندرتا ہی میری سب سے بڑی شتر و نکلی اچھا ہوتا کہ میں اتنی سندر نہ ہوتی۔۔۔ متھو نگر پالک کے باغیچے کا مالی تھا۔ روز سویرے سورج نکلنے کے پہلے ہی اسے باغیچے میں پہنچ جانا ہوتا تھا۔ جب سورج کچھ اونچا ہو جاتا تو وہ اپنا سویرے کا کام ختم کر کے گھر آتا اور کھانا کھا کر ہم دونوں دیر تک اپنے بھوشیہ کے سپنے دیکھا کرتے۔ شام میں وہ پھر کام پر جاتا اور اس بار اس کی واپسی سورج ڈوبنے کے بعد ہوئی۔ کبھی کبھی کام کچھ زیادہ ہوتا تو آنے میں دیر بھی ہو جاتی۔ جب جب ایسا ہوتا میں گھبرانے لگتی۔ ایک انجان سا بھے ہر سمے مجھے گھیرے رکھتا تھا۔''18

اس ناول کے اندر قدیم ہندوستانی عناصر بھی موجود ہیں جو ویدک کال سے پہلے کے مانے جاتے ہیں جس میں بھائی بہن کی شادی جو آریوں میں معیوب مانا جاتا ہے ساتھ ہی دیوی دیوتاؤں کا ذکر جو آج بھی ہندوستان کی ممیّزات میں شامل ہے۔ جڑی بوٹی جس کو بعد میں آیوروید کہا جانے لگا، رشی اور منی ان سب کا ذکر اس ناول میں موجود ہے۔ اور اس ناول میں فروعی واقعہ کے طور پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ دیوائی کو جب راجا

کشال نے اپنے ہوس کا شکار بنایا۔ پھر اس سے روپ نگر بھیج دیا گیا جہاں ایسی عورتیں جاتی تھیں جو راجا کشال کے ہوس کا شکار ہوا کرتی تھیں۔ درندے صفت مردان کے ساتھ من مانی کرتے تھے جس سے ان میں کچھ عورتیں خبطی ہو گئی تھیں اور کچھ اپنی موت کا انتظار کرتی تھیں اور کچھ مردوں کی ہوس کو اپنا کرتب سمجھنے لگی تھیں۔

اس ناول کے فروعی واقعات میں ایک واقعہ یہ ہے کہ سندھ کی تہذیب جب کوئی جشن ہوتا تھا تو اس میں عریاں رقص کے ساتھ مذکر اور مونث کی مباشرتی اختلاط کی آزادی تھی۔ ناول میں جب دیوانئ کو لڑکا پیدا ہوتا ہے تو راجا کوشک نار نے الگ الگ کے شہروں کے راجاؤں کو دعوت دی تھی کہ سب اس میں جشن میں شریک ہوں اور اپنی عورتوں کے ساتھ بھی ایک پروگرام کا حصہ بنے۔ کوشک نار کے جشن میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ اس رات جتنی عورتیں حاملہ ہوں گی اس کا خرچ بادشاہ اٹھائے گا۔ اتفاق سے اس رات کوشک نار کی عورت بھی حاملہ ہوئی اور اس سے ایک بچی پیدا ہوئی جس کا نام تارکی رکھا گیا بعد میں دیوانئ کے لڑکے کی اس سے شادی بھی ہوئی تھی۔

اس ناول کے واقعات میں ایک واقعہ یہ تھا کہ جب دیوانئ کو مساکا کے قتل کے جرم میں جنگل میں پھینک دیا جاتا ہے تو مہرشی نام کے ایک سنت نے اسے اپنی کٹیا میں رکھا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود لیا۔ مہرشی بید تھے جو جڑی بوٹیوں (دواؤں) پر تحقیق کرتے تھے اپنے شاگردوں کے ساتھ مل کر جڑی بوٹیوں کی دوائیاں تیار کرتے تھے ان کا پختہ عقیدہ تھا کہ کسی بیماری کے پیچھے ماورائی طاقت کا اثر نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی جادوٹونے کے ذریعے اس کا علاج ممکن ہے۔ آج سائنس اور میڈیکل سائنس کی اتنی ترقی کے باوجود بھی ہندوستان میں یہ عقیدگی عام ہے کہ بہت سی بیماریاں ایسی ہیں جن کا تعلق ماورائی ہوتا ہے۔ اور اس کا علاج صرف جھاڑ پھونک اور جادوٹونا ہے۔ اس زمانے میں جڑی بوٹیاں تیار کی جاتی تھی اور بیماریوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا گرچہ ان کا عقیدہ دیوی اور دیوتاؤں پر پختہ تھا۔ ناول میں دیوانئ کو ایک دیوی کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ دیوانئ پر پھولوں کی بارش ہونا دیوانئ کی سانپوں کا حفاظت کرنا، دیوانئ کے طریقے علاج سے صحت یاب ہونا

یہ سب اس بات کی علامت ہے کہ دیوانئ عام لڑکی نہیں بلکہ ایک دیوی نما لڑکی ہے۔لیکن تمام بیماریوں کے لیے سندھ کی تہذیب میں جڑی بوٹیوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔مہمان نوازی اور لوگوں کی مدد کرنا عام تھا جس کو ناول میں بیان کیا گیا ہے۔

کملانگر ایک ایسا شہر تھا جہاں معاشرے میں عورتوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔دیوتاؤں کے بجائے دیوی کی پوجا کی جاتی تھی۔کملانگر کا راجا کوشک نار ہے جو عورتوں کی بڑی عزت کرتا ہے اسی لیے مہرشی نے دیوانئ کو کملانگر ہجرت کرنے کو کہا۔ناول کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''گومل ندی پار کر کے وہ پھاٹک کے قریب پہنچے۔انھوں نے بڑی حیرت سے دیکھا کہ نگر پالک کوشک نار اپنے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لیے ان کی آمد کے منتظر ہیں، نگر پالک کے پیچھے ان کے مہا کرتا اور کرتاؤں کی قطار تھی پھر مہاجن اور دیگر جنوں کی بھیڑ تھی۔جیسے ہی وہ پھاٹک کے پاس آئے نگر پالک نے بڑھ کر پہلے دیوانئ پھر مہرشی گرپا اور پھر سوریم کے گلے میں ہار پہنائے۔ان کے قدموں کو چوم کر انھیں احترام دیا۔پھر داسوں کی طرف اشارہ کیا تو وہ مٹی کے قیمتی اور خوب صورت برتنوں میں ٹھنڈا پانی لے آئے۔نگر پالک نے اپنے ہاتھوں سے تینوں کے پاؤں دھوئے اور ان سے درخواست کی کہ وہ ناگرکوں کو درشن دے کر ان کے ساتھ گڑھی میں پدھاریں۔'' 19

مذکورہ بالا عبارت سے راجا کوشک نار کی مہمان نوازی اور اس کے سخی ہونے کا پتا چلتا ہے۔راجا دیوانئ کی آمد سے بہت خوش تھا اس کی خوشی میں انتہا اس وقت ہوئی جب مہرشی نے راجا کوشک نار کو یہ خوش خبری سنائی کہ دیوانئ اور اس کے بچے کی برکت کی وجہ سے اس کو اولاد ہوگا۔تو وہ بہت خوش ہوا۔اس نے دونوں کی ضیافت میں کوئی کمی نہ ہونے دی۔

ناول کے ذیلی مسائل میں شہر دل من، ہڑپا اور دوسرے شہروں کے اندر تجارت کا جو سلسلہ تھا وہ بھی ہے۔سندھ کی تہذیب میں دل من شہر میں دوسرے شہر کے تاجر تجارت کے لیے آیا کرتے تھے اور یہاں اپنا سامان بیچ کر اس کے عوض میں انھیں جو قیمت ملتی تھی اس سے اپنی زندگی گزارنے کا سامان لیتے تھے۔اس

تجارت میں مختلف قسم کے اناج کے ساتھ مٹی کے برتن اور کھلونے وغیرہ شامل تھے۔

سندھ کی تہذیب میں بھی راجا مہاراجا اپنے بچوں کو پڑھانے کے لیے گھر سے دور گروکل میں بھیجا کرتے تھے۔ سرال کو تعلیم کے لیے ہڑپا بھیجا گیا۔ سرال نے وہاں آ کاش گرنتھ کی تعلیم حاصل کی اس کے ساتھ ساتھ اسے جنگ کے لڑنے کے طریقے بھی سکھائے گئے۔ گروکل کے قاعدے قانون سخت ہوتے تھے سندھ کی تہذیب میں لڑکیوں کو بھی پڑھانے کا انتظام تھا لیکن لڑکیوں اور لڑکوں کے تعلیم میں افتراق تھا دونوں کی تعلیم الگ الگ طریقے سے اور الگ الگ جگہوں پر ہوتی تھی:

> ''لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام گروکل میں بالکل الگ تھا لڑکوں اور لڑکیوں کو آپس میں ملنے کی اجازت نہ تھی صرف گروجن دونوں طرف آ جا سکتے تھے۔ اس لیے برسوں گروکل میں گزار دینے کے باوجود ایک دوسرے سے ملاقات ممکن نہ ہو پاتی۔ ان کا طریقۂ تعلیم لڑکوں سے مختلف تھا۔ ان کے سونے، سو کر اٹھنے، ندی میں غسل کرنے اور تعلیم کا وقت بھی لڑکوں سے الگ تھا۔ سرال کو اس طرف کی جانکاری دوسرے شاگردوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ رہتی تھی۔ اس لیے کہ گرو ماتا روز ہی ان کے عجیب وغریب قصے اسے سنایا کرتی تھیں۔ سرال کے ساتھی اس کے پوچھا کرتے کہ آج ماتا نے کیا بتایا اور وہ فخریہ دوستوں کو یہ قصے سناتا۔ سرال کو لگتا کہ جیسے یہ دنیا اس کے لیے اچھوتی ہے۔ اس کے دل میں ان کے لیے احترام اور عقیدت تھی۔ عمر کے اپنے تقاضے تھے لیکن جب کبھی اس کے دل میں گرو ماتا کی باتیں سن کر کچھ ہلچل پیدا ہوتی تو وہ سختی سے اپنی خواہشات کو کچل دیتا۔'' 20؎

مذکورہ بالا عبارت سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سندھ کی تہذیب جو تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح کی ہے پھر بھی آج کے دور کی مناسبت سے اس وقت کی ترقی زیادہ معلوم ہوتی ہے چاہے وہ عمارتوں کے بارے میں ہوں یا سڑکوں کے بارے میں یا پھر سڑک کے کنارے نالیوں کے بارے میں۔ جب سائنس اور ٹکنالوجی نہیں تھی اس وقت بھی سندھ کی تہذیب میں انسانی ضروریات کے بہترین وسائل موجود تھے۔ ہزار سال قبل مسیح لڑکیوں اور لڑکوں کا اس طرح گھروں سے دور گروکل میں پڑھنا، علم کی ترقی کی

علامت تھی اس بات سے ذہن مرکزی کردار دیوانئ کی بغاوت اور احتجاج کی طرف جاتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اس وقت دیوانئ مردوں کے مقابل میں تعلیم یافتہ رہی ہو۔ گرچہ والدین کے انتقال کے بعد وہ صرف اپنے اور اپنے بھائی تک محدود ہوگئی تھی لیکن جب اس کا جنسی استحصال ہوا اور اس کا جنسی حق اس کی اجازت کے بغیر راجا کشال نے حاصل کیا تو اس کے ذہن میں بغاوتی جذبہ زیادہ بڑھ گیا اور اپنے حکمت عملی اور بلند ذہن سے پہلے تو مسا کا قتل کیا پھر راجا کشال کے نطفے کی پرورش کر کے اسے ویر بنایا اور اس کے ذریعے سے اپنا بدلہ لیا۔

ناول دل من کے نسوانی کرداروں میں جہاں دیوانئ کو مرکزیت حاصل ہے وہیں کیتی نامی کردار کی بھی اہمیت ہے۔ اس کے مثبت و منفی افعال کی بنا پر بغاوت اور احتجاج کا جذبہ اس کے اندر پایا جاتا ہے۔ سرال نے جب دل من پر حملہ کیا تو اس دوران سرال اور کیتی کی ملاقات ہوئی۔ سرال اور کیتی دونوں آپس میں ایک دوسرے کو اپنا دل دے بیٹھے۔ کیتی جو راجا کشال کی بیٹی اور دل من کی شہزادی ہے۔ سرال نے رفتہ رفتہ دل من شہر پہ اپنا قبضہ قائم کر لیا اور اپنی ماں دیوانئ کے مجرم کشال کا قتل کر کے اپنی ماں کا بدلہ لیا۔ کیتی کو جب معلوم ہوا کہ جس سے میں پیار کرتی ہوں وہ کوئی معمولی لڑکا نہیں ہے وہ دیوانئ کا دیویتر ہے۔ اس نے ہی میرے باپ کا قتل کیا ہے تو اس کے اندر بھی بدلے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور سرال سے اپنے باپ کا بدلہ لینے کے لیے کمر بستہ ہو جاتی ہے۔

سرال سے کیتی کی شادی کو ایک برس ہو چکا ہوتا ہے لیکن وہ اپنے باپ کے قتل کا بدلہ نہیں لے پاتی ہے اس کے لیے مختلف قسم کے حربے اختیار کرتی ہے۔ اسے جب معلوم ہوا کہ میرے باپ کے قتل کا سبب دیوانئ ہے جس نے اپنے بیٹے سرال کا استعمال کر کے میرے باپ کا قتل کروایا وہی اصل مجرم ہے۔ ناول میں اس واقعہ کو یوں بیان کیا گیا ہے:

> ''اب کوٹ کے اندر کیتی کی سرگرمیوں میں نمایاں تبدیلی آ گئی تھی۔ سب سے زیادہ وہ دیوانئ کی دشمن تھی۔ سرال کا جرم صرف یہ تھا کہ اس کا استعمال کیا گیا تھا۔ جنگ جو اور بہادر ہونے کے ساتھ وہ کتنا معصوم ہے، یہ کیتی سے بہتر بھلا کون جان سکتا تھا۔

لیکن وہ مجرم تھا سزا اسے بھی ملنی تھی البتہ وہ تارکی سے ناراض نہیں تھی اس نے صدق دل سے اسے معاف کر دیا تھا اس نے طے کیا تھا کہ دیوانئ کو سزا دلانے میں وہ تارکی کا استعمال کرے گی جیسے دیوانئ نے سرال سے کام لیا تھا۔۔۔۔کیتی اور دیوانئ کا تعلق اب ایک عجیب نوعیت اختیار کر رہا تھا۔سرال سے گفتگو کے دوران وہ دیوانئ کے احترام کا لحاظ رکھتی اور کبھی کوئی حرف شکایت زبان پر نہ لاتی ۔ہاں کبھی کبھی وہ یہ ضرور کہتی کہ عمر کی زیادتی نے ماں کو چڑ چڑا بنا دیا ہے اور انھیں جلد غصہ آ جاتا ہے۔وہ بڑی احتیاط سے یہ باتیں سرال کے ذہن میں اتار رہی تھی۔لیکن سرال کی غیر موجودگی میں وہ دیوانئ کو ہر ہر بات پر نہ صرف ٹوکتی بلکہ دوسرے طریقوں سے بھی اسے ذلیل کرنے کا موقع تلاش کرتی رہتی۔''21

کیتی اور دیوانئ کے تعلقات بگڑ چکے تھے ۔ وہ اصل مجرم سرال کو نہیں بلکہ دیوانئ کو مانتی تھی۔ پر سرال کے سامنے اس کی ماں کا احترام دکھانے کے طور پر کرتی تھی لیکن سرال کے جانے کے بعد اسے برا بھلا کہنے لگتی تھی اس چیز کو ناول میں اس طرح پیش کیا گیا ہے:

''میں سننے کو اتسک ہوں ماتا، سرال نے احترام سے کہا اسے امید تھی کہ وہ کیتی کے لیے کچھ تعریفی باتیں کرے گی۔لیکن دیوانئ نے کہا پتر کیتی کے درویوہار سے میں مجبور ہو چکی ہوں یو تو تم اسے سمجھاؤ کہ مجھ سے سمبندھ اچھے رکھے یا پھر میرے الگ رہنے کی ویوستھا کر دو۔سرال حیران تھا، اسے فوراً خیال آیا کہ چونکہ اس کی ماں تارکی کی وجہ سے کیتی کو زیادہ اہمیت نہیں دیتی اس لیے اسے تارکی کے قریب لانے کا یہ آخری حربہ استعمال کر رہی ہے۔ وہ بات کی گہرائی میں جانے کے بجائے بولا:''میں کیتی کو سمجھا دوں گا ماتے تم چنتا نہ کرو۔'' دوسری طرف کیتی نے تارکی سے ملنا جلنا بڑھا دیا تھا۔اب وہ تارکی سے ایسی باتیں کرتی کہ اس کے پیٹھ پیچھے سرال اس کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتا۔اس نے اسے یہ بھی بتایا کہ سرال اپنے سابقہ رویئے پر شرمندہ ہے لیکن سامنے آ کر اس کا ذکر کرنے کی اسے ہمت نہیں ہے۔اس نے یہ بھی یقین دلایا

تھا کہ وہ اسے سرال سے ملوائے گی اور اس کا کھویا ہوا مرتبہ اسے واپس ملے گا۔''22؎

اس اقتباس کے ذریعے یعقوب یاور نے کیتی کی شاطرانہ چال کو بھی پوری طرح واضح کیا ہے کہ کیتی نے سرال کے دل میں اس طرح جگہ بنالی تھی کہ سرال کو کیتی کی باتوں پر حد درجہ اعتماد ہو گیا تھا اور اس کی ماں جو اس کے لیے ماں اور باپ دونوں تھی اس کی باتوں پر اسے یقین کم ہونے لگا تھا۔اس کے دل میں یہ بات آئی کہ ماں کو شاید کچھ غلط فہمی ہے جو کیتی کے بارے میں اس طرح سے کہہ رہی ہے۔اس ناول میں تانیثیت کے ساتھ عورتوں کے ذہنی تصادمات کو بھی بڑی باریک بینی سے بیان کیا گیا ہے۔جس میں دیوانئ، تارکی اور گاگنی، ولّی کے آپسی تعلقات اور ان کے خواہشات کو مصنف نے ناول میں بروئے کار لایا ہے۔ موہن جوداڑو کی تہذیب کے ساتھ ان ہی تمام واقعات پر اس ناول کا انحصار ہے۔دیوانئ اپنے بدلے کے لیے جب اپنے بیٹے سرال کا استعمال کرتی ہے تو تارکی جو کشال کی بیٹی ہے جسے پتا چل جاتا ہے کہ دیوانئ کی وجہ سے میرا باپ مارا گیا ہے تو اس معاملے میں چھان بین کے بغیر تارکی دیوانئ کو گنہگار سمجھنے لگتی ہے اور اسے اپنی سازش کا حصہ بناتی ہے پھر دیوانئ کو ولّی کے قتل کے جرم میں دیوانئ کے بیٹے کے ذریعے سے ہی اسے سزا دلواتی ہے۔ولّی ناول میں ایک ایسی کردار ہے جو تارکی کے شوہر سرال سے پیار کرتی ہے جس کی بنا پر تارکی ولّی سے ناراض ہوکر اس کا قتل کر دیتی ہے اور اس قتل کو دیوانئ کے ساتھ منسوب کر دیا جاتا ہے۔ان سارے واقعات کے پیچھے ناول میں بہت ساری باتیں رونما ہوتی ہیں جس میں چاپلوسی ،حسد،بغض،تعصب جیسے عناصر موجود ہوتے ہیں۔یعقوب یاور نے ان کرداروں کے ذریعے ناول میں لازوال فنکاری کا ثبوت دیا ہے۔اس ناول میں یہ سارے کردار کہیں بھی بے موقعہ کوئی حرکت نہیں کرتے ہیں۔اس ناول میں کرداروں کا کوئی فعل غیر ضروری یا نامناسب نہیں معلوم ہوتا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاری تین ہزار سال پہلے کے واقعات اور تہذیب وثقافت کو دیکھ رہا ہے۔یہ ناول موجودہ دور کی تہذیب وثقافت سے تو دور ہے لیکن دور حاضر کے لیے سبق آموز ہے۔موہن جودڑو جیسی پرانی تہذیب وثقافت کو اس ناول میں وحدت تاثر کے ساتھ ناول نگار نے بڑی ہی چابکدستی سے بیان کیا ہے۔اس ناول کا اختتام اور آغاز ایک ایسی کہانی سے ہوتا

ہے جس میں مرکزی کردار دیوانئ کو دو قتل کے جرم میں دل من شہر سے باہر پھینکا جاتا ہے۔ پہلا قتل اس نے اپنے بدلے کے لیے کیا تھا حالانکہ دوسرے قتل کے جرم میں جب اسے دل من شہر سے باہر پھینکا جاتا ہے تو وہ اس بار سازش کا شکار ہوتی ہے اور ایک ناکردہ جرم کی سزا پاتی ہے۔ دل من شہر میں عورتوں کے ساتھ لوگوں کا کیسا سلوک تھا دیوانئ اس کی ترجمانی کرتی ہے ساتھ ہی اس ناول میں دل من شہر کے سماجی و معاشرتی بے راہ روی اور ناانصافی کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ ناول کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''آکاش سے خون برس رہا ہے۔۔۔۔نہیں یہ خون نہیں ہے، لیکن اس کا رنگ سرخ کے بجائے سفید کیوں ہے۔۔۔۔یہ بادلوں کے پیچھے سے شیر کیسے جھانک رہا ہے۔آکاش میں بھلا شیر کیسے ہو سکتا ہے ۔۔۔۔نہیں یہ شیر نہیں گائے ہوگی۔۔۔۔گائے ۔۔۔۔گائے اور آکاش۔۔۔۔میرا تو مستشک پھٹا جا رہا ہے۔''23ؔ

اس اقتباس میں علاماتی اور استعاراتی انداز میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح دل من شہر میں طاقت ورلوگ مجبور و بے کس پر ظلم کرتے تھے عدل و انصاف کا خاتمہ تھا۔ آسمان سے خون برسنے کا مطلب یہ ہے کہ شہر میں کسی طرح کا امن و امان نہیں تھا۔ اور عورتوں کی بے بسی اور مجبوریوں کو بھی اس ناول میں علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

''شاید پکشی ہیں جو کھلے آکاش میں آزادی سے اڑ رہے ہیں۔۔۔۔آزادی اور میں؟ میں آزاد نہیں ہوں۔۔۔۔ان پکشیوں کی صورتیں تو بڑی عجیب ہیں۔۔۔۔نہیں نہیں یہ پکشی نہیں ہو سکتے ان کے چہرے تو انسانوں جیسے ہیں۔۔۔۔''24ؔ

دیوانئ کے دماغ میں یہ بات آتی ہے کہ عورتوں کو اس دنیا میں اتنی آزادی نہیں ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کہیں آ جا سکیں۔ پرندوں کے پر سے خون بہنا انسانی درندوں کی علامت ہے جو عورتوں کو اپنی ہوس کا شکار بناتے ہیں۔ یہ ناول تانیثیت اور قدیم تہذیب و تمدن کے اردگرد گھومتا ہوا نظر آتا ہے۔

نظریاتی سطح پر یہ ایک مابعد جدید ناول ہے جس کے اندر ماضی کے اقدار کے ساتھ لامرکزیت اور

مہا بیانیہ کی تردید ملتی ہے۔اس ناول میں جو کردار ہیں ان کو مصنف نے کسی نظریہ کا علمبردار نہیں بنایا ہے۔ ناول کا کردار کشال ہو یا سرال ان کے اندر خود مختاری کی صفت پنہاں ہے جس کی بنا پر یہ کردار مختلف الجہات افعال و اعمال میں رچے بسے ہیں۔ناول کی مرکزی کردار دیوانئ جس کے تانیثی مسائل کو ناول میں پیش کیا گیا ہے یہ بھی خصوصیت کا حامل ہے۔اس لحاظ سے بھی یہ ناول مابعد جدید کے زمرے میں آتا ہے۔کیوں کہ مابعد جدید رجحان نے تانیثی مسائل کو بھی اہمیت حاصل ہے۔جس کو سماج حاشیائی چیز سمجھتا تھا مابعد جدید رجحان میں اس کو فوقیت دی ہے۔یہ ساری چیزیں اس ناول میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

''دل من'' کے کرداروں کا تعارف:

''دل من'' کے کردار جیتے جاگتے کردار ہیں۔اس ناول کا کوئی بھی کردار ڈمی کی صورت میں نہیں ہے بلکہ سارے کردار حساس و فعال ہیں۔

دیوانئ:

دیوانئ ناول ''دل من'' کا مرکزی کردار ہے۔اسی نسوانی کردار کے اردگرد پوری کہانی گھومتی ہے۔ ناول میں دیوانئ ایک ایسی لڑکی ہے جس کے ماں باپ مر گئے ہوتے ہیں۔دیوانئ کا ایک بھائی متھو ہے جو آپس میں شادی کرنا چاہتے تھے۔لیکن راجا کشال کی نظر جب اس پہ پڑتی ہے تو سندرتا پر راجا کشال فریفتہ ہو جاتا ہے اور اس کا جنسی حق جبراً حاصل کرتا ہے۔اس استحصال کے بدلے میں دیوانئ کے اندر احتجاج اور بغاوت کا جذبہ پھوٹ پڑتا ہے۔کشال سے انتقام کے لیے اپنے بیٹے سرال کو استعمال کرتی ہے اور اس کا قتل کرواتی ہے۔

مہرشی:

مہرشی ایک سنت اور جڑی بوٹیوں کے معلم تھے۔ ہندوستانی دیو مالا کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا رشیوں اور منیوں سے متعلق کئی کہانیاں ہمیں فراہم ہوں گی۔دراصل ہندوستان کی قدیم تہذیب میں رشیوں کی بڑی اہمیت رہی ہے۔اس ناول میں مہرشی ایک ایسا کردار ہے کہ جب دیوانئ کو شہر بدر کیا جاتا

ہے تو یہ کردار (مہرشی) اس کو اپنی کٹیا میں لاتے ہیں اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری لیتے ہیں۔ انھیں دیوانئ اپنے باپ کے برابر سمجھتی ہے۔ مہرشی مختلف جڑی بوٹیوں کے متعلق اسے علم بھی دیتے ہیں۔ مہرشی کے کئی شاگرد ہوتے ہیں جو جڑی بوٹیوں پہ تحقیق کرتے ہیں۔

کشال:

کشال دل من کا نگر پالک ہے۔ ناول میں یہ ایک منفی کردار ہے جسے ویلن کہہ سکتے ہیں۔ یہ سرال کی بیوی کیتی کا باپ ہے۔ ساتھ ہی سرال کی ماں کا مجرم ہے۔ کشال کو ناول میں ایک ویلن کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو کہ ظالم و جابر بادشاہ ہے۔ یہ کردار عیاشی اور شراب نوشی میں مست رہتا ہے۔

سرال:

سرال دیوانئ بیٹا ہے۔ اس کو دیو پتر بھی کہا جاتا ہے اور یہ راجہ کشال کے قتل کے بعد شہر دل من کا بادشاہ بنتا ہے۔

کیتی:

یہ راجا کشال کی بیٹی ہے اور سرال کی بیوی ہے۔ یہ بہت ہی چالاک اور شاطرانہ ذہن رکھنے والی لڑکی ہے۔ ساتھ ہی اس کے اندر شاہی گھرانے کے تمام صفات مضمر ہیں۔ اور یہی دیوانئ کو اس کے بیٹے سرال کے ذریعے دوبارہ شہر بدر کرواتی ہے۔

تارکی:

کملانگر کے بادشاہ کوشک نار کی لڑکی ہے اور سرال کی بیوی بھی ہے۔ اس کے اندر جذباتی پہلو بھی ہیں جس کی بنا پر سرال اس سے متنفر بھی ہو جاتا ہے۔

گاگنی:

یہ راجا کشال کی بیوی ہے اور کیتی کی ماں، ایک ضمنی کردار ہے۔

متھو:

دیوانئ کا بھائی ہے۔ جو راجا کشال کے باغیچے میں باغبانی کرتا ہے اور اپنی بہن دیوانئ سے شادی بھی کرنا چاہتا ہے۔ پر دونوں میں شادی نہیں ہوتی۔

سوریم:

یہ دیوانئ کا عاشق تھا جو دیوانئ کی دیکھ ریکھ کرتا تھا لیکن اس کی شادی دیوانئ سے نہ ہوئی کیونکہ دیوانئ کے دل میں ایک ہی خواہش تھی کشال سے بدلہ لینا۔ اس خواہش کے سبب وہ سوریم کو اپنا نہ سکی۔ حالانکہ سوریم سے دیوانئ بھی پیار کرتی تھی۔ دیوانئ نے جب سوریم کو نہیں اپنایا تو اس نے خودکشی کر لی۔ ان کرداروں کے علاوہ ناول کے اور دوسرے ضمنی کردار ہیں جو ناول کو آگے بڑھانے میں ثابت ہوتے ہیں۔

ناول عزازیل کا جائزہ:

انسانی دنیا سے قبل ماورائی دنیا کے واقعات و حادثات کو یعقوب یاور نے ناول ''عزازیل' میں پیش کیا ہے یہ ناول عزازیل کے سوانح پر مبنی ہے۔ اردو ادب میں اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے اور اس کے بارے میں معتبر مواد بھی کم دستیاب ہیں۔ جو کچھ مواد ملتے ہیں وہ بائبل، انجیل، تورات اور قرآن قریم و احادیث رسول میں سے ہیں۔ عزازیل (ابلیس) کے بارے میں تفصیلی معلومات انگریزی مصنف ڈینکن (Erik Von Deniken) کی کتابوں میں موجود ہے۔ اس نے اس کی تحقیق میں اپنی پوری عمر صرف کر دی۔ یعقوب یاور نے ناول عزازیل کو لکھنے میں اس کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ عزازیل پر لکھنے والوں پر اگر نگاہ ڈالیں تو فوراً ہماری توجہ ملٹن اور اقبال کی طرف بھی جاتی ہے۔ جنھوں نے اس منفی کردار کے مثبت اور منفی رویے کو پیش کیا ہے۔ یعقوب یاور لکھتے ہیں:

> ''جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے، یہ ناول عزازیل کی سوانح حیات پر مبنی ہے۔ ہر باشعور قاری جانتا ہے کہ اس تعلق سے ہمارے پاس معتبر مواد برائے نام ہے۔ تھوڑا بہت جو مواد ملتا ہے وہ بائبل (انجیل و توریت کا مجموعہ) اور قرآن کریم میں ہے اور کسی

ناول کی تخلیق کے لیے یہ مواد بہر حال ناکافی ہے۔ادب کی دنیا میں عزازیل کا کردار پہلے بھی کچھ لکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا رہا ہے۔ملٹن اور اقبال کے نام فوری طور سے ذہن میں آتے ہیں۔جنھوں نے اس منفی کردار کے مثبت،مفید اور کارآمد پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے یہ کوشش بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔''

25

جان ملٹن نے اس موضوع پر جو نظم لکھی ہے وہ''paradies lost'' ہے اس نے 1639ء میں یہ بات سوچی تھی کہ دنیا کے وجود پر میں کچھ لکھوں گا لیکن یہ نظم لکھنا 1658ء میں شروع کیا اور 1663ء میں پائے تکمیل کو پہنچایا۔ملٹن نے اس کے اندر جو کردار بنایا ہے اس میں میکائیل،اعزازیل،آدم اور حوا ہیں۔ملٹن نے اپنی اس نظم سے یہ باور کرانا چاہا ہے کہ اللہ نے جب حضرت آدم کو بنایا اور ان کے ساتھ ان کی بیوی حضرت حوا کو بنایا اور جنت میں ایک پھل کھانے سے منع کیا تو عزازیل (ابلیس) جو ان کے بنانے کا منکر تھا۔اس نے ان دونوں کو بہکایا اور اللہ کے منع کیے ہوئے پھل کو کھلانے میں کامیاب ہو گیا جس کی بنا پر اللہ نے انہیں دنیا میں پھینک دیا۔ملٹن نے یہ نظم عیسائی عقیدے کے تحت لکھا ہے۔آدم اور حوا کو اللہ کی اولاد قرار دیا ہے۔ملٹن کی یہ نظم بہت مشہور ہوئی۔علامہ اقبال نے اپنی نظم''ابلیس کی مجلس شعری'' میں ابلیس کے فعال کردار کو پیش کیا ہے۔اس میں ابلیس اور اس کے مشیران پر تبصرہ ہے۔ابلیس کا تعارف اور اس کے متحرک افعال کو علامہ اقبال نے اپنی نظم میں بیان کیا ہے۔

ہے مری جرات سے مشت خاک میں ذوق نمو
میرے فتنے جامہ عقل و خرد کا تارو پو
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزم خیرو شر
کون طوفاں کے تھپیڑے کھا رہا ہے میں کہ تو
خضر بھی بے دست و پا، الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفان یم بہ یم ، دریا بہ دریا، جو بہ جو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے

قصہ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو
میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو

علامہ اقبال نے ابلیس کی افعال واوصاف کا تذکرہ اپنے اشعار میں اس طرح سے کیا ہے کہ ابلیس اللہ کی طرف سے پہلا نافرمان ومردود ہے لیکن اس نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا کہ وہ آدم خاکی کو برائی کی طرف ہمیشہ مائل کرے گا اور وہ اس کام میں لگا ہے۔ انسان جس نے اللہ سے وعدہ کیا ہے کہ ہم تیری عبادت کریں گے پر وہ اپنے وعدے کو بھول گیا ہے۔ اس ناول میں عزازیل کے مختلف اوقات میں اللہ سے نافرمانی کے سبب اسے جنت سے نکالنا اور دنیا میں بھیجنا، ان سب کا ذکر ہے۔ یعقوب یاور اپنے ناول کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سب سے پہلے میں اس بات کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ پیش نظر تحریر ایک ادبی ناول ہے۔ جہاں مجاز ہمیشہ حقیقت پر سبقت رکھتا ہے اسے مذہبی تاریخی یا تحقیقی نقطہ نظر سے نہیں پڑھا جانا چاہیے۔ اس میں بیان کردہ واقعات تخیل کی رہنمائی میں وجود پذیر ہوئے ہیں۔ ہماری دنیا کے معلوم یا نامعلوم حقائق سے ان کا کوئی علاقہ نہیں۔ پھر بھی اگر کسی کو ایسی مطابقت کا احساس ہو تو یہ محض اتفاق ہوگا۔''26

ناول ''عزازیل''، جو ابلیس کی سوانح پر مبنی ہے جس میں ناول نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسان ہو یا کوئی بھی مخلوق اگر اس کے اندر علم ہے اور وہ اس علم کی بنا پر اخلاقیات کو ترک کر دیتا ہے تو اس کا انجام تباہی کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتا، چاہے وہ علم کے کسی بھی درجے کو پہنچ جائے۔ آخر میں اس کو مایوسی اور ناکامی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ناول ''عزازیل'' کا یہی مرکزی موضوع ہے کہ اگر کسی بھی مخلوق کو اللہ نے علم دیا ہے اور علم میں وہ باکمال ہے لیکن اگر اس کے اندر حرص ولالچ گھمنڈ آجائے تو پھر اس کا انجام تباہی ہوتا ہے۔ یعقوب یاور نے اس ناول کو لکھنے کی وجہ یوں بتایا ہے:

''اس انوکھے ناول کو لکھنے کے پیچھے بنیادی طور پر جو خواہش کارفرما رہی وہ یہ تھی کہ میں

شدت کے ساتھ اس حقیقت کو ابھار سکوں کہ نافرمانی اور بے راہ روی کو جب علم کی سرپرستی حاصل ہو جاتی ہے، جب علم اپنے فرائض منصبی سے پہلو تہی کرتے ہوئے زندگی کی فوری تقاضوں کی تکمیل میں مصروف ہو جاتا ہے۔ جب علم کو محض سود و زیاں کی میزان میں رکھ دیا جاتا ہے، جب علم کا رشتہ اخلاقیات سے منقطع ہو کر غیر جانب داری اور شر کا فرماں بردار ہو جاتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ تباہی ہی ہوتا ہے۔ ہم سب بھی علم کی ارزانی کے اس دور میں جی رہے ہیں جہاں راستی اور گمراہی میں کوئی معنوی فرق باقی نہیں رہا ہے۔ اگر یہ ناول اپنے کسی قاری کو محض یہ احساس دلانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو میں اسے اپنی کاوش کا سب سے قیمتی صلہ سمجھوں گا۔'' 27ے

ناول عزازیل کے اندر مصنف نے عزازیل کے بارے میں تفصیل سے ہر ایک پہلو کو اجگر کیا ہے۔ اس ناول میں یہ بتایا گیا ہے کہ عزازیل (ابلیس) اہرمن سے عزازیل کیسے بنتا ہے اور پھر عزازیل سے ابلیس کیسے بنتا ہے۔ اور ان تمام مدتوں میں اللہ نے اسے علم سے مالا مال کیا تھا لیکن اس نے اپنے علم سے ناجائز مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ جس میں وہ کبھی کامیاب نہ ہوا۔ کیوں کہ اس کے علم نے اپنے فرائض منصبی سے پہلو تہی کر لیا تھا۔ اور وہ اپنے علم کے بدولت ہر وہ چیز حاصل کرنا چاہتا تھا جو اس سے اوپر کی تھی۔ عزازیل کے اندر اپنے علم کے بدولت گھمنڈ، حسد، جلن، بغض وعناد راہ پالی تھی۔ جس کی بنا پر وہ کبھی بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ حالانکہ اس کے اندر جہاں برائی تھی وہیں حد سے زیادہ عبادت گزاری بھی تھی۔

ناول میں انسانی زندگی سے پہلے جنوں کی آبادی کو دکھایا گیا ہے۔ اور جنوں کی آبادی آسمان سے زمین پر کیسے آئی۔ اس کو بیان کیا گیا ہے۔ اور آدم کو سجدہ کرنے سے پہلے ابلیس نے کتنے سجدے کا انکار کیا، کس طرح جنوں کی دنیا میں کئی بار پیدا ہوا اور پھر کو خود کو موت کے حوالے بھی کیا۔

ناول میں اہرمن ابلیس کا سب سے پہلا نام ہے۔ اہرمن فرشتوں کا بادشاہ تھا وہ ہمیشہ اللہ کی عبادت میں لگا رہتا تھا۔ سارے فرشتے اس سے علم حاصل کرتے تھے۔ یہ فرشتوں میں سب سے ممتاز اور اعلیٰ

تھا۔اور اسے یہ احساس بھی رہتا تھا کہ میں سب سے اعلیٰ اور ارفع ہوں۔اور اللہ نے اسے اپنے قرب میں جگہ بھی دی تھی اور اپنے عرش کے قریب اس کی کرسی کو بھی رکھوائی تھی۔بس ایک عرش کی طرف اشارہ کیا تھا کہ یہ عرش تمہاری جگہ نہیں ہے۔عزازیل بہت خوش تھا اور اللہ کی عبادت میں مصروف تھا لیکن جب اللہ نے اس کے سامنے ایک مخلوق بنانی چاہی تو عزازیل ایک دم سے تلملا اٹھا اور اس کے دل میں یہ بات آئی کہ اللہ کو کوئی اور مخلوق بنانے کی کیا ضرورت ہے اور وہ دل میں سوچنے لگا کہ کون سی ایسی حکمت اپنائی جائے جس سے اللہ کا یہ فعل رک جائے لیکن وہ منشائے خداوندی کو سمجھنے سے قاصر تھا اسے یہ سب کچھ ایک بے مقصد کھیل کی طرح لگ رہا تھا اس کے دماغ میں یہ بات سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آخر یہ کیوں ہو رہا ہے۔

ابلیس ایک عالم تھا وہ جانتا تھا کہ ہر زندگی کے بعد موت آتی ہے اور ہر بار موت کے بعد دو مختلف سمتوں میں سفر ہوتا ہے سزا یا جزا۔یعنی عذاب کا گھر یا خوشی کا گھر۔ پھر اللہ کو نئی مخلوق بنانے کی کیا ضرورت ہے۔اسی غور وفکر میں عزازیل تھا کہ عرش اعظم پر عظیم الشان اجتماع کا انعقاد کیا گیا اس میں تمام ملائک اور مقربین خدا شامل ہوئے پھر عرش پر خدائے وند تعالی جلوہ افروز ہوا۔اور ایک نمایا تخت پر سورج اور مختلف آتشیں سیاروں کے عناصر سے ایک آتشی پتلا بنایا گیا۔جس کا نام طارہ نوث تھا اس کا رنگ سفید، چہرے پر دو آنکھیں ، دو کان ایک منہ ہاتھ جو کبھی دو نظر آتے اور کبھی دو سے زائد۔اور دو پاؤں اسے خود اللہ نے بنایا تھا اس لیے اسے عظیم المرتبت قرار دیا گیا تھا۔ اللہ نے تمام فرشتوں اور موجودہ تمام مخلوق کو حکم دیا کہ اس کے سامنے سر تسلیم خم کریں۔تمام فرشتوں نے اس کے سامنے سجدہ کیا لیکن عزازیل (ابلیس) جو اس وقت اہرمن تھا اس نے سجدہ نہیں کیا۔ یہ فرشتوں میں سے نہیں تھا لیکن پھر بھی اللہ کا مقرب بندہ تھا۔ناول کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ’’ابھی اس اجتماع میں آنے والوں کا سلسلہ جاری تھا ملائکہ کے آخری گروہ کے آجانے کے بعد شاہ ملائک اہرمن جو ملائک میں سے نہ تھا نہایت تزک واحتشام کے ساتھ آیا اور اپنے مقررہ نشست پر بیٹھ گیا اس کا تخت، تختِ خداوندی سے قریب تھا۔اسے خدا کے بائیں طرف جگہ دی گئی تھی۔ دائیں طرف چار تخت تھے جن پر خدا

کے مقربین خاص جلوہ افروز تھے۔ خداوند کائنات، یزدان قادر کی آمد کے اعلان کے ساتھ ہی سارے موجود لوگ ایستادہ ہو گئے۔ اور اس میدان میں داخل ہوتے ہی نظریں اٹھائے بغیر ہر شخص سجدے میں گر گیا، کہ یہی حکم خداوندی تھا۔ اسی دوران یزدان عالم نے تخت بلند پر قدم رکھا اور لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا اب تمام لوگ اس کے اگلے حکم کے منتظر تھے۔'' 28

تمام ملائک اور مخلوق نے آتشی پتلے طارہ نوث کا سجدہ کیا لیکن اہرمن نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور اللہ نے اس سے کہا کہ تم میرے بنائے ہوئے آتشی پتلے کے سامنے سجدہ ریز کیوں نہیں ہو رہے ہو۔ اہرمن نے وہی جواب دیا جو آخر میں ابلیس بننے پر آدم کے وقت دیا۔ لیکن پھر بھی اسے اس بات کا یقین تھا کہ اللہ اسے اپنا مقرب مانتا ہے اس نے اللہ سے کہا کہ تو ماضی اور مستقبل دونوں کا علم رکھتا ہے تو مجھے اس آتشی پتلے کے سامنے جھکنے سے بچالے۔ تیرا اکرام الطاف بہت وسیع ہے۔

ناول نگار نے یہاں اپنے ناول لکھنے کے اصل مقصد کو اہرمن کے ذریعے سامنے رکھا ہے اور یہ بتانے میں کافی حد تک کامیاب ہوئے ہیں کہ جو علم اخلاقیات کا دامن چھوڑ دے، تکبر کا چولا پہن لے تو اس کا انجام تباہی ہی ہے۔ اہرمن نے سجدے سے بچنے کے لیے اللہ سے التجا کی تو اللہ نے اس کے کبر کو اس کے سامنے بیان کیا اور کہا کہ تم میرے بنائے گئے پتلے (طارہ نوث) کو سجدہ کرو۔ لیکن اہرمن نے اپنے علم اور مقربِ خدا ہونے کی وجہ سے سجدے سے انکار کیا جس کی بنا پر اس کے حصے میں اللہ کا قہر آیا:

''تیری اس درخواست میں تیرے تکبر کی بو آتی ہے تیرے حق میں یہی بہتر ہوگا کہ تو میرے حکم کی تکمیل میں طارہ نوث کے سامنے سرنگوں ہو جا ورنہ تیرا نام ان نافرمانوں میں شامل ہو جائے گا۔ جو قہر خداوندی کے سزاوار ٹھہرے ہیں۔۔۔ ایسی ذلت کے مقابلے مجھے نافرمانوں میں شامل ہونا گوارہ ہے۔ اہرمن نے کہا۔ میں اس وجودنو کے سامنے سرنگوں ہونے سے انکار کرتا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے اہرمن کی آواز کپکپا رہی تھی، ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی قوت اسے اس نافرمانی پر مجبور کر رہی ہے۔ افسوس کہ تو نے ہمارے الطاف وعنایات، اکرام ونوازشات کی مطلق پروا نہ کی اور نافرمانی کے

مرتکب ہوئے۔اسی لمحے سے تو مردود قرار پایا۔اور تیرے حق میں تمام اعلیٰ و ارفع
مدارج و مراتب سے متعلق احکامات مسترد کیے جاتے ہیں۔''29؎

اہرمن اپنے علم اور نیکی کے گھمنڈ میں اللہ کا منکر ہوا اس کے علم نے اسے نافرمانوں میں شامل کر دیا۔مذکورہ بالا عبارتوں سے واضح ہوتا ہے کہ جناتوں کی دنیا ویسے ہی آباد ہوئی جیسے انسانوں کی۔حالانکہ یہ ناول کا زاویہ ہے اس پر تصدیق اور تکذیب دونوں نہیں کر سکتے ہیں کیوں کہ ناول نگار نے شروع میں ہی بتا دیا ہے کہ ناول لکھنے کے لیے جو مواد ملے ہیں وہ یا تو بائبل سے ہیں یا پھر اسلامی کتابوں سے۔لیکن اس میں جو کچھ بھی مواد ملے ہیں کم تھے اور اس کا استناد بھی اس طرح نہیں ہے کہ اس کے ماننے کی تلقین کریں کیونکہ یہ ناول ہے اور اس میں ناول کے فن کو برتا گیا ہے۔اور ناول کو بنانے میں واقعات کو بھی سنوارا گیا ہے۔

اہرمن راندۂ درگاہ ہوگیا۔اس کے بدن سے جنت کے لباس چھین لیے گئے وہ برہنہ کھڑا تھا اور طارہ نوث کے وجود میں داخل ہوگیا۔طارہ نوث کے سکون کے لیے اللہ نے ایوات کو وجود میں لایا جس طرح حضرت آدم کے لیے حوا کو بنایا۔اہرمن طارہ نوث کے جسم سے ایوات کے وجود میں داخل ہوگیا۔اور ایوات کو بہلایا پھسلایا اور ایوات کو عبادتِ الٰہی سے دور رکھنے کی کوشش کیا اور اللہ کی نافرمانی کروادی۔اللہ کے حکم عدولی کی بنا پر طارہ نوث اور ایوات کو اللہ نے اردبان زمین پر ڈھکیل دیا۔طارہ نوث اور ایوات کی پہلی اولاد اہرمن (عزازیل) رامن بن کے ہوا اور لوگوں کو بہکانے میں لگ گیا۔اس زندگی میں اس نے پہلے اپنی ماں ایوات کو برائی کی طرف راغب کیا پھر اپنے بھائی اور بہن کو قتل کیا جس کا نام طولان اور لامس تھا اور برائی کو پھیلانے میں کامیاب رہا۔ہر طرف برائی کا پہرہ تھا۔اس وجہ سے اس قوم پر آخر میں اللہ کا عذاب آیا اور نوح کے عذاب کی طرح عذاب تھا۔اب رامن (عزازیل) نے اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیا۔اللہ نے اس کو یہ قوت دی رکھی تھی جب چاہے اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دے۔ناول نگار نے اس کو اس طرح بیان کیا ہے:

''یزدان کائنات نے اہرمن کی طلب پر اسے سرزمین اردبان پر سات بار پیدا ہونے
کی اجازت دی تھی،اسے اپنی موت پر جزوی اختیار بھی دیا گیا،اور اپنی پیدائش کے

لیے مناسب جگہ کے انتخاب کا حق بھی۔ اس کے پاس کچھ خصوصیات اور بھی تھیں۔ ساتھ ہی کچھ پابندیاں بھی۔ مثلاً ہر بار اس کی مجموعی عمر اس کے سابقہ عمر سے زیادہ نہ ہوگی۔ ہر بار اس کے پردہ خفا میں جانے کا وقفہ اس کی زندگی کے وقفے سے کم ہوگا۔ ہر بار اس کے مزاج میں شر کا کچھ حصہ کم ہوگا اور خیر کا حصہ بڑھ جائے گا۔ ہر بار اس کے والدین اور مقام ورود مختلف ہوں گے۔ ہر بار اس کی ذہانت میں اضافہ ہوگا، ہر بار سابقہ علم بھی اس کے ساتھ رہے گا، اسے کسی بھی چیز کو دو بار جاننے کی ضرورت نہ ہوگی۔ ہر بار اسے اپنا ظاہری حلیہ بدلنا ہوگا۔ ہر بار اس کی شناخت ایک نئی شخصیت اور ایک نئے نام سے ہوگی۔ ہر بار اس کے اقتدار اور اثر و رسوخ میں اضافہ ہوگا۔'' 30

غراموت کی حیثیت سے جب اس نے جنم لیا تو وہ شر کو زیادہ نہ بڑھا سکا۔ جس کی بنا پر اس نے سوچا کہ اب ہمیں مر جانا چاہیے۔ اور اس کے اندر کی شر کمزور ہونے لگی تھی۔ شرلات کی حیثیت سے جب پیدا ہوا تو اس نے قتل و غارت گری کو عام کیا اس زمانے میں کچھ زیادہ برائی پنپی لیکن پوری طرح وہ لوگوں میں برائی نہ پھیلا پایا اور خود کو موت کے حوالے کر دیا۔ چوتھی بار عورت کی شکل میں اس نے تلویث نام سے جنم لیا۔ اس بار اس نے لوگوں کو خدا پرستی سے دور کر دیا تھا اسے خوشی تھی کہ ہم اپنے کام کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ اس زمانے جب لوگوں کو دکھانے کے لیے وہ اللہ کی عبادت کرنے لگا تھا تو اس کا دل خدا کی طرف مائل ہونے لگا۔ تو اسے احساس ہوا کہ اب مجھے مر جانا چاہیے۔

ناول نگار نے عزازیل کے کردار کے چھ ناموں میں تلویث کو اپنے مقصد میں کچھ حد تک کامیاب دکھایا ہے شاید ان کے ذہن میں یہ بات ہو کہ عورت لوگوں کو مردوں کے مناسبت سے زیادہ گمراہ کر سکتی ہے ناول کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''اس بار اس نے جنس مخالف کو اپنے خیالات کی ترویج کا آلہ بنایا تھا۔ اور اس سے اسے زبردست کامیابی ہاتھ لگی تھی اپنے اس جنم سے وہ اتنا خوش تھا کہ اس کی سابقہ ناکامیوں کی کوفت بھی دور ہوگئی تھی۔ عورت نے اپنے حسن و جمال، اور ناز و انداز کا ایسا عریاں اور برملا مظاہرہ کیا کہ جنوں کی ساری ذہانت اور قوتِ فیصلہ اس ایک

اشارے کے سامنے ہیچ ٹھہری۔اس نے وہ مرتبہ حاصل کیا کہ ہر جن کا مقصود آخر بن
گئی۔ سچ پوچھیے تو یہ عہد صنف لاغر کی صنف قوی پر برتری کا عہد تھا۔تلویث خوش تھا
کہ اس نے اردبان کی پچاس فیصد آبادی کو اپنا شاگرد اور باقی میں سے اکثریت کو اپنا
ہم نوا بنا لینے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ارض اردبان پر اس بار جو نمایاں تبدیلی وہ
دیکھ رہا تھا وہ یہ تھی کہ اب لوگ چھوٹی چھوٹی مملکتوں سے اکتا چکے تھے اور اتحاد قائم
کر کے نسبتاً بڑی مملکتوں کی تعمیر کر رہے تھے۔اس عمل کو آگے بڑھانے میں سب لوگ
بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار تھے۔جانوں کا زیاں ہو رہا تھا۔تلویث کو اس
سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ انجام کے اعتبار سے دونوں طریق کار یکساں تھے، البتہ
اب نئی بات یہ دیکھنے میں آرہی تھی کہ شاہ مملکت کا تقرر عام لوگوں کی مرضی اور
مشورے سے ہونے لگا تھا۔ساری دنیا میں ایسے عوامی نظام کی حمایت میں نعرے
لگائے جا رہے تھے اور اس کی اہمیت اور افادیت کے بلند بانگ دعوے ہو رہے تھے۔
لیکن یہ نعرے کتنے کھوکھلے تھے اور اس کے پیچھے کیسے کیسے سازشی ذہن کارفرما تھے۔
اس کے بارے میں بھلا تلویث سے بہتر کون جان سکتا تھا۔'' 31

جب اس نے رون نام سے جنم لیا تو اس وقت ارض اردبان پر دو عظیم مملکتیں جو آپس میں ٹکرانے کی درپے تھیں اس خدشے سے مصلحتاً اہرمن نے اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیا۔

شر موت کے نام سے عزازیل ایسے گھر میں جنم لیا جو بادشاہ وقت بوش کا قریبی تھا۔اہرمن کے دل میں یہ بات آئی کہ جب ہم حاکم ہوں گے تبھی اپنے مقصد کو پورا کر پائیں گے۔لیکن یہ خواہش اہرمن کی پوری نہ ہو پائی۔ چنانچہ بوش اور دوسرے بادشاہ گارباف میں لڑائی ہوئی بوش نے گارباف پر فتح حاصل کی۔ گارباف کے افراد خاندان پہاڑی کے غار میں چھپ کر اپنی جان بچائی ان بچنے والوں میں گارباف کا بیٹا شاطون تھا۔اردبان پر شاشین اعظم کا حکم چلتا تھا۔ بوش نے اسی کو اپنا ولی عہد بنا رکھا تھا۔اس لیے اب اہرمن کو اپنے مقصد کے لیے نئی چال چلنی پڑی اور اس نے موت کا دامن تھاما۔

شاشین کے گھر میں تبلیث کی کوکھ میں قیام کیا اور عزازیل کی حیثیت سے جنم لیا۔عزازیل اپنے

والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔اس لیے اس کی ولی عہد میں کوئی جھگڑا نہیں تھا۔اس بار عزازیل اور بار سے الگ تھا برائیوں کی طرف لوگوں کو مائل نہیں کرتا تھا۔لیکن بڑا بننے کا خواب اور گھمنڈ اس کے اندر اب بھی موجود تھا جس میں وہ کامیاب نہ ہوسکا۔کیوں کہ گارباف کا لڑکا شاطون اعظم بڑا ہوا تو اس نے تبلیث اور شاشین کا قتل کر کے حاکم بن گیا۔عزازیل کے اندر اس بار پہلے جیسی برائی نہیں تھی اردبان میں اس کا اچھا خاصا مقام بن گیا تھا۔لوگ عزازیل کو عزازیل مقدس کے نام سے پکارتے تھے۔عزازیل لوگوں کو خدا کی طرف راغب ہونے کے لیے تلقین کرتا تھا۔خود خدا کی عبادت و تسبیح میں مشغول رہتا تھا لیکن ارض اردبان پر برائی زیادہ پھیل گئی تھی۔جس کی بنا پر اللہ کے چھوٹے چھوٹے عذاب ظاہر ہو رہے تھے۔اردبان کے لوگ پریشان تھے۔عزازیل اپنے دوست جبرائیل سے ملا تو پتا چلا کہ اب اردبان ختم ہونے والا ہے۔تو اس نے اپنی ریاضت وعبادت کا حوالہ دیا اور جبرائیل سے یہ التماس کیا کہ اللہ سے قیامت کو رکوا دو اور ایسا ہی ہوا۔کچھ دنوں تک اللہ کی طرف سے اہل اردبان کو مہلت ملی اور اپنی زندگی بسر کرنے لگی کچھ دنوں کے بعد عزازیل اور شاطون میں بغاوت ہوئی لیکن بعد میں یہ حل ہوگئی۔لیکن عزازیل کے اندر وہ ازلی صفت موجود تھی اور سب سے بڑا بننے کا خواب اس کے اندر پنپ رہا تھا۔لیکن عزازیل کو کبھی حاکم بننے کا وقت نہیں ملا کیوں کہ ارض اردبان پر برائیوں زیادہ پھیل چکی تھی جس کی بنا پر اللہ اس زمین کو ختم کرنے والا تھا اور وہاں کے لوگوں میں اللہ کی طرف سے صرف عزازیل کو معافی ملی۔پورے اردبان کو اللہ نے ہلاک کر دیا۔اور اردبان پر موت کا سناٹا طاری ہوگیا۔پھر عزازیل کو جبرائیل کے ذریعے سے اللہ نے آسمان پر بلایا اور اس کے کھوئے ہوئے وقار کو واپس دے دیا گیا اور معلم ملائک کی حیثیت سے اللہ کی قربت میں رہنے لگا۔وہ ہر وقت اللہ کی عبادت میں مصروف رہنے لگا۔فرشتوں کو اس کی عبادت پر رشک ہوتا تھا۔اس کی عبادت اللہ کے یہاں افضل تھی کیوں کہ وہ اپنے شر کو شکست دے کر اس مرحلے تک پہنچا تھا۔فرشتے خوشی کے ساتھ اس کے علم سے مستفید ہو رہے تھے۔اور عزازیل کو اپنا رہبر مان رہے تھے۔لیکن عزازیل کی جو ازلی صفت تھی وہ ابھی تک گئی نہیں تھی۔ایک دن اس نے فرشتوں سے سوال کیا کہ تم عزازیل سے محبت کرتے ہو تو سب نے کہا کہ ہاں اور پھر خدا کے

بارے میں پوچھا تو فرشتوں نے کہا کہ ہم خدا سے بھی محبت کرتے ہیں۔ پھر عزازیل نے فرشتوں سے پوچھا کہ ایک طرف خدا ہو اور دوسری طرف تمھارا معلم عزازیل ہو تو فرشتوں نے کہا ہم خدا اور معلم کو ایک ہی طرف دیکھتے ہیں۔ آخر میں فرشتوں نے کہا کہ خدا ہمارے لیے بڑا ہے۔ عزازیل کے اس مکالمے میں بھی وہ کبر ہے جو اسے اس کے علم اور عبادت کے بل بوتے ملی ہوئی تھی۔ اسی نے اسے تباہ کیا۔ پھر آخری مرحلہ ایک نئے سجدے کا آتا ہے۔

اس بار اللہ رب العالمین نے دنیا کے الگ الگ حصوں سے مٹی لی اور اس سے ایک پتلا تیار کیا۔ پھر اس کے بعد تمام فرشتوں کو اکٹھا کیا اس میں عزازیل بھی تھا۔ اللہ نے اس مٹی کے پتلے میں روح ڈالی اور اس کا نام آدم رکھا۔ تمام فرشتوں سے کہا کہ تم سب اس پتلے کے سامنے سجدہ کرو تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔ عزازیل نے اللہ سے کہا کہ ہم آدم سے افضل ہیں یہ مٹی کا پتلا ہمارے مقابل میں کم تر ہے۔ جو ہم جانتے ہیں وہ یہ نہیں جانتا۔ اللہ نے حضرت آدم کو بہت ساری چیزوں کا علم دے دیا تھا جو فرشتوں کو اور عزازیل کو بھی معلوم نہیں تھا لیکن عزازیل آدم کے علم سے متاثر نہ ہوا بلکہ یہ کہا کہ میرا علم آدم کے علم سے بہتر ہے۔ دراصل عزازیل کی بوکھلاہٹ اس بات پر تھی کہ اللہ نے حضرت آدم کو اپنے تمام مخلوقات میں سب سے افضل قرار دیا تھا جو کہ عزازیل کے خلاف تھا۔ اس طرح پھر عزازیل نے آدم کا سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اللہ کی نافرمانی کر کے وہ عزازیل سے ابلیس بن گیا۔ اس نافرمانی کے عوض اس سے جنت کی وہ ساری نعمتیں چھین لی گئیں جو اللہ کی طرف سے اسے ملی تھیں پھر اس نے اس وقت وہی چاہا جو طارہ نوث کے ساتھ کیا تھا۔ کہ وہ آدم کے جسم میں داخل ہو جائے لیکن وہ حضرت آدم کے جسم میں داخل نہ ہو سکا۔ پر اپنے شر کا ایک جز حضرت آدم کے اندر داخل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن جنت میں داخل ہونے سے پہلے حضرت آدم کی تلاشی لی گئی تو اس جز کو نکال دیا گیا اور جنت کے کسی گوشے میں دفن کر دیا گیا۔ اور ابلیس کو پھر راندۂ درگاہ کر دیا گیا۔ لیکن اس کی چار شرطیں اللہ نے مان لی تھی۔ پہلی یہ کہ جب تک اولاد آدم میں سے کوئی بھی زندہ رہے گا تو وہ بھی رہے گا۔ دوسرا، بلا تخصیص ہر کسی کو گمراہ کر سکے گا۔ تیسرا یہ کہ اس کی اولاد کثرت سے ہوگی۔ چوتھا یہ کہ

عزازیل اپنا حلیہ اور اپنی شکل اپنی مرضی کے مطابق بدل لے گا۔

حضرت آدم کو اللہ نے جنت میں داخل کر دیا۔ اور حضرت آدم خوش رہتے تھے لیکن رفتہ رفتہ انہیں تنہائی کا احساس ہونے لگا تو خدا نے ان کی تنہائی کو دور کرنے کے لیے ان کے پاکیزہ وجود سے حوا کو وجود میں لایا ہمدم کے ملنے سے آدم بہت خوش ہوئے۔ جنت میں داخل ہونے کے وقت ہی آدم کو متنبہ کیا گیا تھا کہ وہ جنت کے ہر چیز کو اپنے تصرف میں لا سکتے ہیں لیکن نخل ممنوعہ کے قریب نہیں جانا ہے جو ابلیس کے ناجائز علم و شر کے مدفن پر اگ آیا تھا۔

آدم اور حوا دونوں جنت میں اللہ کی نعمتوں کے ساتھ خوش تھے۔ دونوں جنت میں ادھر ادھر گھومتے لیکن دونوں کو اس بات کا لحاظ تھا کہ شجر ممنوعہ سے دور رہیں تاکہ اللہ کی خوشنودی ہمیشہ حاصل رہے۔ لیکن جب کبھی آدم اس شجر ممنوعہ سے دور رہنے اور اس کا پھل چکھنے سے گریز کی بات کرتے تھے تو حوا کو بڑا عجیب لگتا تھا وہ آدم سے اس کا سبب پوچھتی تھیں تو کچھ نہیں بتاتے تھے کیوں کہ آدم کو خود ہی نہیں پتا تھا تو وہ کیا بتاتے۔ بس یہ کہہ دیتے تھے کہ یہ اللہ کی مرضی ہے لیکن اس سے حوا کی تسلی نہ ہوتی تھی۔ اسی دوران ابلیس بھی جنت میں کسی طرح داخل ہو گیا اس کے اندر حسد اور کبر سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اس نے اپنے دل میں سوچا کہ ان ہی کی وجہ سے مجھے جنت سے نکالا گیا ہے اور ان ہی کی وجہ سے مجھے اللہ کی نافرمانی کرنی پڑی۔ اس لیے وہ آدم اور حوا کی نگرانی کر کے ان کی گمراہی کے امکانات تلاش کرنے لگا۔ اس نے آدم کے مقابل میں حوا کو گمراہ کرنا آسان سمجھا چنانچہ وہ ایک بزرگ کی شکل میں حوا کے سامنے آیا اور کہا کہ خدا کو ناراض کئے بغیر اس شجر ممنوعہ کے پھل کو کھا سکتی ہو۔ اس پھل کے کھانے والے کے درجات بلند ہو جاتے ہیں۔ اور اس کا علم بڑھ جاتا ہے۔ اب حوا نے حضرت آدم کو بہلایا پھسلایا جس کی بنا پر وہ دونوں اس پھل کو چکھے جس کی اللہ کی طرف سے ممانعت تھی۔ اس طرح سے ابلیس نے اپنے شر سے دنیا کے پہلے مرد اور عورت کو اللہ کا نافرمان بنا دیا۔ حضرت آدم کے ساتھ وہی ہوا جو طارہ نوث اور رایوات کے ساتھ ہوا تھا۔ جنت کی ساری چیزیں ان سے چھن گئی پھل کھاتے ہی ان کا جسم برہنہ ہو گیا انھوں نے انجیر کے پتے سے اپنی جنسی اعضاء کو چھپایا اور بہت ہی مغموم ہو گئے

اور پھر اللہ نے انھیں زمین پر اتار دیا۔ آدم کو زمین پے آنے کا غم اتنا نہیں تھا جتنا کہ اللہ کی ناراضگی کا غم تھا وہ ہمہ وقت توبہ واستغفار میں مصروف رہنے لگے۔ تا کہ اللہ کا رحم ان پہ نازل ہو۔ آدم اور حوا دونوں زمین پر ایک دوسرے کو تلاش رہے تھے کیوں کہ دونوں الگ الگ جگہ پر اتارے گئے تھے۔ آخر میں دونوں ملے اور خوش ہوئے۔ ابلیس نے بھی زمین کو اپنا دائمی جگہ بنالیا اور قیامت تک یہی اس کا میدان عمل ہوگا۔ اور انسان کو قیامت تک شر کی طرف راغب کرے گا۔ ابلیس اپنے کام میں مشغول ہے۔ حضرت آدم اور حوا نے استغفار کیا اللہ نے انھیں معاف بھی کر دیا۔ آدم اور حوا نے جنت میں جس پیڑ کا پھل کھایا تھا۔ اس کے بارے میں لوگوں کے مختلف خیال ہیں۔ کسی کے خیال میں یہ گندم کا پھل تھا تو کسی نے اس سے مراد یہ لیا ہے کہ آدم اور حوا کو ایک دوسرے سے مباشرت کے لیے روکا گیا تھا۔ اور ایک دوسرے کو پیڑ سے تعبیر کیا گیا تھا۔ لیکن اگر اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو قرآن میں اللہ رب العالمین نے یہ کہا ہے کہ آدم اور حوا تم دونوں اس درخت کے قریب مت جانا اور اگر ایسا کئے تو تم دونوں ہمارے نافرمانوں میں سے ہو جاؤ گے۔ لیکن قرآن میں اللہ نے اس پیڑ کی وضاحت نہیں کی ہے کہ وہ کس کا پیڑ تھا اور آدم اور حوا نے کون سا پھل کھایا تھا۔ لیکن کچھ مفسروں نے اسرائیلی روایتوں کے سہارے سے یہ بتایا ہے کہ گیہوں کا پھل تھا اور کچھ نے توقف اختیار کیا ہے۔

اس ناول کے زاویے سے دیکھا جائے تو وہ شجر ممنوعہ برائی کا پیڑ تھا جو کہ ابلیس کے شر کی جگہ پہ جنت میں اگ آیا تھا۔ کیوں کہ ابلیس کا کوئی بھی جز حضرت آدم میں داخل نہیں ہو پایا تھا اس لیے ابلیس نے بہلا پھسلا کے اپنے شر کے جز کو اس پھل کے ذریعے سے حضرت آدم اور حوا میں داخل کیا۔ جس کو ناول کے مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھ سکتے ہیں:

> ''جنت میں جانے سے پہلے خدا نے آدم کو متنبہ کیا کہ وہ جنت کے ہر چیز کو اپنے تصرف میں لا سکتا ہے لیکن اسے اس نخل ممنوعہ کے قریب نہیں جانا چاہیے۔ جو ابلیس کے ناجائز علم کے مدفن پر اگ آیا تھا۔ اس کی تاکید کی گئی کہ اس پودے کا پھل اس کے لیے ضرر رساں ہے۔ آدم نے شجر ممنوعہ سے دور رہنے کا وعدہ کیا اور اس کے ساتھ ہی اسے جنت میں داخل کر دیا گیا۔ جنت کا ماحول بڑا خوش گوار اور مناظر بڑے دلفریب

تھے۔خوبصورت عمارتیں تھیں۔انواع واقسام کے درخت تھے جن میں پھل اور میوہ جات لدے ہوئے تھے۔چشمے اور نہریں تھیں جن میں لطیف ولذیذ مشروبات بہہ رہے تھے۔آدم ان چیزوں کو دیکھ کر خوش تھا اور خدا کی ان فراواں نعمتوں پر اس کا سجدہ بجالاتا تھا۔لیکن رفتہ رفتہ اسے یہاں پر تنہائی کا احساس ہونے لگا۔اس نے خدا سے دعا کی اور اس کے پاکیزہ وجود سے اس کے لیے ایک رفیق کی پیدائش ہوئی، جسے حوا کا نام دیا گیا۔ایک ہمدم کے ملنے سے آدم بہت خوش تھا۔وہ دونوں جنت میں ادھر ادھر گھومتے۔البتہ اس بات کا لحاظ رکھتے کہ اس شجر ممنوعہ سے دور رہیں تاکہ انھیں خدا کی خوشنودی حاصل رہے۔'' 32

ناول کے اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مصنف نے عزازیل کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے بہت محنت کی ہے اور مواد کے دستیابی کی خاطر اسلامی اور دیگر اسرائیلی روایات کا بھر پور مطالعہ کیا ہے۔شجر ممنوعہ کے پھل کے بارے میں الگ الگ اسلامی رسرچ اسکالروں نے اپنی اپنی رائے رکھی ہے لیکن اس ناول میں کچھ الگ ہی زاویے کو پیش کیا گیا ہے جو مندرجہ بالا سطروں میں موجود ہے حالانکہ یہ ناول ہے کوئی تحقیق شدہ کتاب نہیں پھر بھی ناول میں اسلامی واسرائیلی مراجع ومصادر سے استفادہ کیا گیا ہے۔حدیث میں آتا ہے کہ'' شیطان انسان کے جسم میں ایسے ہی دوڑتا ہے جیسے خون''۔پھر یہ سوال اُٹھتا ہے کہ آخر انسان کے جسم میں شیطان کیسے داخل ہوا جب حضرت آدم کو اللہ نے جنت میں داخل کیا تو ابلیس ان کے جسم میں داخل ہونا چاہا لیکن وہ اس میں ناکام رہا پھر کس طرح انسان کے جسم میں شیطان خون کی طرح دوڑتا ہے۔تو اس ناول میں اس شوشہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ آدم وحوا نے جو پھل کھایا تھا وہ شیطان کے شر کی جگہ پر اگنے والے پیڑ کا پھل تھا۔اس پھل میں شیطان کے شر کا اثر موجود تھا اس طرح سے شیطان کا شر آدم کے ذریعے سے پوری بنی نوع انسان میں پہنچا۔وہی شیطان کا شر قیامت تک انسانوں کے جسم میں خون کے ساتھ دوڑتا رہے گا۔کیونکہ تمام انسان حضرت آدم اور حوا کی اولاد ہیں۔میں نے کچھ اسلامی کتابوں اور احادیث کا مطالعہ کیا لیکن اتنی تطبیق شدہ بات سامنے نہ آئی تھی۔ابلیس حضرت آدم

وحوا کو پھل کھلانے سے بیک وقت دو چیزوں میں کامیاب ہوا۔ ایک یہ کہ اس پھل کے کھانے سے پہلے حضرت آدم اور حوا نے اللہ کی نافرمانی کی اور دوسرا یہ کہ اپنے شر کو حضرت آدم اور حوا کے جسم میں داخل کرنے میں ابلیس کامیاب ہو گیا۔ اللہ رب العالمین نے شاید اسی وجہ حضرت آدم اور حوا کو اس پھل کو کھانے سے منع کیا تھا۔

یعقوب یاور نے ابلیس کی حیات پر مبنی یہ سوانحی ناول لکھا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ابلیس اہرمن سے عزازیل کیسے ہوا اور عزازیل سے ابلیس کیسے ہوا۔ ناول میں جو فروعی واقعات ہوتے ہیں وہ مرکزی موضوع کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس ناول میں فروعی واقعے کے طور پر ''اردبان'' میں لوگوں کی قسموں اور ان کے رہن سہن کے طریقوں کو بتایا گیا ہے جس میں تین طرح کے لوگ ہوتے ہیں پہلا نوشی، دوسرا شینانی، تیسرا تکاشی، اور ان کے الگ الگ صفات کو بیان کیا گیا ہے۔ نوشی جو خدا کی فطری مخلوق تھی ان کا قد لمبا چھوٹے سر اور بڑی بڑی آنکھیں اور مونچھیں تھیں۔ ان کے سر بالوں سے عاری تھے۔ متناسب پاؤں اور جسم تھے۔ شینانی جن کے سروں کا مغز نکال کر ان میں مصنوعی اذہان لگا دیے گئے تھے۔ یہ لوگ بلا کے ذہین ہوتے تھے۔ ان کے سروں پر دو سینگ ہوتی تھی اور یہ ان کی پہچان تھی باقی جسم نوشینوں کی طرح تھا۔ تکاشی یہ مکمل طور پر مصنوعی تھے۔ یہ نوشی اور شینانی کے محتاج تھے۔ ناول میں ان کے رہنے سہنے اور طور طریقے کو بیان کیا گیا ہے۔ جو کہ ناول کے مرکزی مسئلہ کو آگے بڑھاتا ہے۔

فروعی مسائل میں قاری کی دلچسپی کے خاطر ناول نگار نے اس ناول میں عشقیہ رمزات کو بھی بیان کیا ہے۔ عزازیل جب جوان ہوا تو اس کی ملاقات تلبانیخ سے ہوئی جو اس کی محبوبہ تھی اور شاطون اعظم کی بہن تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے عشق کرتے تھے اور ساتھ ہی اپنے جنسی خواہشات کی تکمیل بھی۔ مصنف نے اس کو اس طرح لکھا ہے:

> ''اس کی جنسی طلب عزازیل کی روحانی قوت کی طلب گار تھی۔ اس کی تسکین کا سامان فراہم کرنے کے بعد وہ اس کی کنیز بھی بننے کو تیار تھی۔ عزازیل جانتا تھا کہ اس کی جنسی تسکین کے لیے ایک طویل جنسی اختلاط درکار ہے۔ بس یہی سبب تھا کہ وہ اس کی

خواہش کو ہمیشہ ٹال جاتا تھا۔ ہاں وقتاً فوقتاً وہ اس کے ساتھ ہم بستری میں کوئی قباحت نہ سمجھتا تھا۔ تلبانیخ اپنی اس تشنگی اور اس کی تکمیل کی جائز ناجائز کوششوں کی وجہ سے بدنام تھی۔'' 33؎

ناول میں اہرمن نے الگ الگ زمانے میں سات بار جنم لیا۔ کبھی غراموت کے نام سے کبھی شرلات، کبھی تلویث کبھی رون کبھی شرموت اور آخر میں ساتویں بار عزازیل کی حیثیت سے۔ اس کے علاوہ اور دوسرے بھی مسائل و واقعات ہیں جو ناول کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں جیسے عزازیل کا اللہ کی کثرت سے عبادت کرنا، یا پھر رامن، شرلاموت، غراموت، تلویث، رون، شرموت کے وقت شر پھیلانے کے افعال وغیرہ۔ اور جس جس بطن سے اہرمن کئی بار جنم لیا اس کی ماں اور باپ کے حالات کا ذکر بھی ناول میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ ناول ابلیس کی سوانح کے پیچھے عہد حاضر کے سماجی و اخلاقی منظر نامے کو پیش کرتا ہے۔ جس میں آج کا انسان خود کو خدا مان بیٹھا ہے۔ اسے اپنے سوا سب حقیر معلوم ہوتے ہیں۔ غرور و گھمنڈ رشتے کی پامالی، سماج کا حصہ بن چکا ہے۔ اشارۃً اس ناول میں ان چیزوں کو بیان کیا گیا ہے۔

ناول عزازیل کے کرداروں کا تعارف:

اہرمن یہ ابلیس کا پہلا نام تھا جب وہ اللہ کے دربار میں جنوں کی آبادی سے پہلے تھا۔ اور وہ اللہ کی عبادت میں مشغول شاہِ ملائک تھا۔

رامن:

جب اس نے عرش پر طارہ نوث کا سجدہ نہیں کیا تو اللہ کی نافرمانی کے عوض اسے جنت سے نکالا گیا اور وہ طارہ نوث کے جسم میں داخل ہو کے ان کی شریک حیات (ایوات) کے بطن سے رامن کے نام سے پیدا ہوا۔ برائی کو پھیلانے والا یہ پہلا فرد تھا۔

غراموت:

رامن کے بعد جب اس نے دوسرا جنم لیا تو اس کا نام غراموت تھا۔ اور اس کے والد کا نام سموک

اور والدہ کا نام اندارہ تھا۔

شرلات:

غراموت کے بعد ابلیس نے شرلات کے نام سے جنم لیا۔ اس کے والد کا نام غساق اور ماں کا نام تلموث تھا۔

تلویث:

اہرمن نے چوتھی بار تلویث کے نام سے عورت کی شکل میں ایک تاجر کے گھر میں جنم لیا۔ جو برائی کو پھیلانے میں کافی حد تک کامیاب ہوا۔

رون:

اہرمن نے پانچویں بار رون کی حیثیت سے جنم لیا۔ اس کے والد کا نام دولاس اور ماں کا نام لاسیب تھا۔ چھٹی بار اہرمن نے شرموت کے نام سے جنم لیا۔ اس بار اس کے والد کا نام بشت مین اور ماں کا نام ترانم تھا۔

عزازیل:

ساتویں بار اہرمن نے عزازیل کی حیثیت سے جنم لیا۔ اس بار وہ شر کا سربراہ نہیں تھا لیکن کبر اس کے اندر ضرور تھا۔ اس بار اس کے باپ کا نام شاسین اور ماں کا نام تبلیث تھا۔

تلبانیخ:

یہ عزازیل کی محبوبہ اور شاطونِ اعظم کی بہن ہے۔ جو عزازیل کی ہمہ وقت مدد کرتی تھی اس کے اندر بھی روحانی طاقت تھی۔

شاطونِ اعظم:

جس نے ابلیس کے والدین کا قتل کر کے اردبان کا حاکم اپنے آپ کو مقرر کیا تھا۔ گارباف نامی

کردار کالڑ کا تھا۔

بوش:

یہ اردبان کا حاکم تھا جس نے گارباف کے خاندان کو شکست دی تھی۔اور اردبان کا حاکم بننے کے بعد عزازیل کے والد کو اپنا جانشین بنایا۔

طارہ نوث:

یہ اللہ رب العالمین کا بنایا ہوا آتشی پتلا جس میں اللہ نے روح پھونکی اور اہرمن کو اس کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیا لیکن اس نے انکار کر دیا پھر طارہ نوث سے اہرمن نے اللہ کی نافرمانی کروائی جس کی بنا پر طارہ نوث کو اردبان زمین پر اتار دیا گیا۔ یہ جناتوں میں سے پہلے جن تھے جس کو ابوالجن کہا جاتا تھا یا ابو العجائب کہا جاتا تھا۔

بوتار: یہ اردبان کا ایک سینانی جنات تھا۔جس نے خامی سیارے کی تلاش کی اور وہ وہاں کا مجازی خدا بھی تھا وہ ابلیس کی مدد کر کے شاطونِ اعظم کی حکومت کو گرانا بھی چاہتا تھا۔

مندرجہ بالا کرداروں کے علاوہ ناول میں اور بھی کردار ہیں جو کہ بہت ہی مشہور و معروف ہیں جیسے جبرائیل، حضرت آدم، حوا، میکائل، اسرافیل وغیرہ۔جس کا تعارف کرانا ضروری نہیں ہے۔

ناول جہاد:

ناول جہاد گجرات میں مسلمانوں کے قتل عام کے بعد ملک کے دوسرے جگہوں پر جو واقعات و حادثات رونما ہو رہے تھے اسی پر منحصر ہے۔سن 2000 میں گودھرا کانڈ واقع ہوا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ٹرین سابرمتی ایکسپریس کو کچھ فسادیوں نے جلا دیا۔جس کے کچھ ڈبوں میں سادھو سفر کر رہے تھے۔اور یہ گھنونا کام مسلمانوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے لیکن یہ تحقیق کا مسئلہ ہے کہ آگ زنی کس نے کی تھی۔اس کا کوئی پختہ ثبوت نہ تو سرکاری محکمہ کے پاس ہے اور نہ ہی عام لوگوں کے پاس ہے۔ گجرات میں مسلمانوں کے

قتل عام کا یہی سبب تھا۔جس میں ہزاروں کی تعداد میں مسلمانوں کو مارا گیا اور مسلم عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔مکانوں اور گھروں کو جلا دیا گیا۔اس ناول کے لکھنے کا پس منظر بھی یہی ہے۔عصرِ حاضر میں فرقا وارانہ فساد، دہشت گردی، تعصب پرستی، منافرت عام ہوچکی ہے اور مسلمانوں کے بارے میں ملک اور بیرون ملک میں بہت ساری غلط فہمیاں بھی پھیل رہی ہیں جس سے مسلمانوں کی اصل شبیہ غائب ہورہی ہے۔جس میں میڈیا اور اسلام مخالف رہنماؤں حکمرانوں سیاست دانوں اور مذہبی پیشواؤں کا ہاتھ ہے۔یعقوب یاور نے اس ناول میں انھیں تمام چیزوں کو موضوع بنایا ہے۔یہ ناول موجودہ دور میں مسلمانوں کی جو حالت ہے اس کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ہندوستان میں مذہبی تصادمات کے ذریعے جو منافرت وفساد پھیل رہے ہیں جس سے نہ صرف ملک بلکہ پوری انسانیت کو خطرہ ہے۔ان چیزوں کا بیان ناول نگار نے بڑی جرات مندی اور سیلقہ مندی سے کیا ہے۔مسلمانوں میں فرقہ بندی اور مسلکی اختلاف کی بنا پر جو باہمی نا اتفاقی اور منافرت ہے اس سے مسلمان پوری دنیا میں کئی زاویوں سے ذہنی انتشار اور اذیت کے شکار ہیں۔اس ناول کے واقعات وکردار میں یہ چیزیں پوری طرح مضمر ہیں۔مسلمانوں کی کمزوریوں کے ساتھ ان کا حل اس ناول میں تلاشنے کی کوشش کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ مسلمانوں کو مسلکی اختلاف سے اوپر اٹھ کر سوچنا ہوگا اور اتحاد واتفاق قائم کرنا ہوگا تبھی مسلمان اپنے حق کے لیے بہتر طریقے سے آواز اٹھا سکیں گے اور دنیا میں اپنے استحکام کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے حق کی لڑائی لڑ سکیں گے۔اپنے خلاف غیروں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کر پائیں گے۔اس ناول میں یہ بات واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ موجود ہ دور میں مسلمانوں سے متعلق غلط فہمیوں کے ساتھ اسلامی اصطلاحات کو بھی بدنام کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ان اصطلاحوں میں جہاد پر زیادہ زور دیا جارہا ہے۔جہاد جو حق وباطل اور اچھائی برائی کی جنگ کو کہا جاتا تھا اسے دہشت گردی کا متبادل بنا دیا گیا ہے۔اس میں میڈیا فرقہ پرست، سیاسی حکمرانوں کا زیادہ ہاتھ ہے۔یعقوب یاور اس ناول کے بارے میں کہتے ہیں:

''اس ناول کا مطالعہ کرتے وقت اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ وہ تمام خیالات جن سے اس ناول کا ہیولیٰ تیار ہوا ہے، ایک شخص کی انفرادی فکر کے نتائج ہیں۔کسی گروہ

> کے طے شدہ افکار ونظریات نہیں۔اس لیے ہر شخص کو ان سے اتفاق یا اختلاف کرنے کا پورا حق ہے۔ویسے بھی انفرادی خیال اکثر کسی نہ کسی ترمیم کا محتاج ہوتا ہے۔وقت کے ساتھ ساتھ اکثر اس کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔اس لیے اسے حرف آخر بہر حال نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔''34

ناول جہاد کی کہانی کچھ اس طرح سے ہے کہ یو پی کے ضلع فتح پور کے ایک گاؤں کوٹ میں گجرات میں ہو رہے فساد کی خبریں لوگ ریڈیو پر سن رہے تھے۔اس گاؤں کے مسلمان ڈرے سہمے تھے۔ناول ''جہاد'' کا ایک مرکزی کردار مسعود خاں جو ایک یتیم لڑکا ہے۔اس خبر کو سن کر جذبات میں آجاتا ہے اور کہتا ہے کہ اب ہم مسلمانوں کو گھر میں بیٹھ کر کوئی کامیابی نہیں مل سکتی ہے۔ہمیں گاؤں سے باہر نکلنا پڑے گا اور مسلمانوں پر ہو رہے ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کرنی ہوگی۔مسلمانوں کی مدد کرنی پڑے گی۔جو لوگ مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھا رہے ہیں ان کو سبق بھی سکھانا پڑے گا۔وہ گھر چھوڑ کر شہر کی جانب نکل جاتا ہے۔لیکن کانپور پہنچنے کے بعد اس کو کھانے پینے کا مسئلہ درپیش آتا ہے۔وہ کانپور شہر میں بھوکا پیاسا کئی دنوں تک رہتا ہے۔کئی جگہ کام کی تلاش میں جاتا ہے پر اسے کام نہیں ملتا ہے۔ایک ہوٹل میں اس کی ملاقات مہیش رائے نامی ایک آدمی سے ہوتی ہے۔جس نے اسے کھانا کھلایا اور اپنے تمباکو کے کارخانے میں نوکری بھی دی۔مسعود ہندوؤں سے بدلا لینے کے لیے گھر چھوڑ کر بھاگا تھا اور ایسا ہوا کہ برے وقت پر ایک ہندو ہی اس کے کام آیا۔اور اس کے لیے نوکری، رہائش اور کھانے پینے کا انتظام بھی کیا۔مسعود دل میں سوچ رہا تھا کہ کچھ دن مہیش رائے کے یہاں کام کرنے کے بعد نوکری چھوڑ دے گا اور مسلمانوں کی مدد کے لیے نکل پڑے گا۔وہیں اس کے دل میں یہ بھی خیال آیا کہ سارے ہندو ایک جیسے نہیں ہوتے ہیں جو مسلمانوں کی بستیوں کو جلاتے ہیں اور ان کا قتل عام کرتے ہیں۔مجھے کچھ ایسا کام کرنا ہوگا کہ فسادی جڑ سے ختم ہوجائیں اور ہندو مسلمان کا باہمی اتحاد بحال ہوجائے۔مسعود خاں اب مستقل طور پر مہیش رائے کے یہاں کام کرنے لگا۔پھر مہیش رائے کے کارخانے پر فسادیوں نے گولاباری کی جس میں مہیش رائے مارے گئے۔پھر مسعود نے کاٹن میل میں سپروائزر کی حیثیت سے کام کیا کانپور یونی ورسٹی سے پرائیویٹ بی اے کی تعلیم بھی حاصل کی اور کانپور کے ایک فلیٹ میں رہنے لگا

اسی فلیٹ میں اس کی ملاقات آصفہ شبیر سے ہوتی ہے۔آصفہ کے ذریعے وہ حرکت البشر نامی ایک تنظیم میں منسلک ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی تنظیم ہے جو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے ساتھ انھیں عزت ووقار سے جینے کے وسائل فراہم کرتی ہے۔اس تنظیم کے امیر احمد عبداللہ الہندی تھے۔ یہ تحریک ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی تھی۔اس کے کارکنوں کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ یہ تحریک چار شعبوں پر منقسم تھی پہلا شعبہ معاشی مشیر کا تھا، دوسرا شعبہ فکری مشیر کا تھا، تیسرا شعبہ عملی مشیر کا تھا اور چوتھا شعبہ خفیہ سرگرمیوں کا تھا۔ ان سب شعبوں کے الگ الگ نعرے تھے۔اللہ رحیم، اللہ حافظ، اللہ قہار، اللہ جلیل۔مسعود خاں اس تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد کئی فساد کو روکنے میں کامیاب ہوا، الگ الگ شہروں میں بم وغیرہ رکھے گئے تھے جس کو مسعود خان نے پھوٹنے سے پہلے ہی اپنی چالاکی و ہوشیاری سے ختم کردیا۔جس کے عوض فساد نہ ہو پایا اور ہندو مسلمان میں لڑائی نہیں ہوئی۔لیکن کانپور میں ایک بم دھماکا ہوا جس میں مسعود خاں کو مسلمان ہونے کے ناطے گرفتار کرلیا جاتا ہے۔حالانکہ وہ مجرم نہیں تھا۔لیکن ہندوؤں نے مل کر اس کی ضمانت کرائی۔مسعود خاں حرکت البشر سے وابستہ ہوکر خدام ملک وملت کے نام کی ایک الگ تنظیم قائم کی۔جس کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد قائم کرنا تھا۔کمبھ کے میلے میں اس نے بلاتفریق و مذہب میلے میں آنے والوں کی خوب خدمت کی، ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں قریب لانے کی ہر ممکن کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہوا۔ اس کو حکومت کی جانب سے اس کی خدمت کے عوض ایوارڈ بھی ملا۔

مرکزی کردار مسعود خاں اور اس کے دوست ضرغام حیدر اور عبدالرحمٰن جیسے اور لوگ حرکت البشر سے جڑنے کے بعد الگ الگ شہروں میں جیسے کانپور، لکھنؤ، بنارس، بھوپال، حیدرآباد وغیرہ میں فساد کو ہونے سے روکا۔ یہ لوگ جہاں فساد ہونے کا خدشہ ہوتا بم وغیرہ رکھنے کے امکانات ہوتے وہاں پہلے ہی پہنچ جاتے تھے اگر بم رکھ دیا گیا ہوتا تو اس کو پھوٹنے سے پہلے زائل کردیتے تھے۔اس طرح ان لوگوں نے پورے ملک میں ہندو مسلم کو قریب لانے کی کوشش کی۔اور کچھ حد تک کامیاب بھی ہوئے۔لیکن اس دوران ان تمام لوگوں کو بہت ساری تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا۔''خدام قوم وملت'' نام سے مسعود خاں نے جو تنظیم قائم کی تھی۔اس

میں آصفہ شبیر بھی آ گئی۔آصفہ شبیر اور مسعود خاں کے میل جول کو ناول میں کچھ دلی لگاؤ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔آخر میں آصفہ شبیر اور مسعود خاں کی شادی ہو جاتی ہے۔مسعود خاں اور آصفہ شبیر گاؤں کوٹ واپس آتے ہیں۔گاؤں کے لوگ مسعود کے کام اور ایوارڈ سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ان ہی واقعات پر ناول جہاد کا انحصار ہے۔ناول جہاد کا پلاٹ منضبط اور مربوط ہے۔اس ناول کے واقعات الگ الگ شہروں کے ہیں۔ جس کو یعقوب یاور نے حصہ وار لکھا ہے اور اس کے اعداد بھی مقرر کیے ہیں۔ڈاکٹر احمد صغیر اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''یعقوب یاور کا ناول جہاد اس معنی میں اہم ناول ہے کہ اس میں عصری مسائل کو اٹھایا گیا ہے۔اس موضوع پر ناول لکھنا بہت جرات کا کام ہے۔کیوں کہ اکثر لوگ کردار کے ساتھ یا موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کر پاتے ہیں لیکن یعقوب یاور نے بہت سنبھل سنبھل کر،سوچ سمجھ کر قلم اٹھایا ہے تا کہ کسی کے عقیدے کو ٹھیس نہ پہنچے اور کسی کے جذبات مجروح نہ ہوں۔۔۔۔یقیناً ہم اس ناول کو اہم ناول کہہ سکتے ہیں لیکن صد افسوس کی فکشن کے ناقدین اس ناول پر لکھنے کی ہمت نہیں کر پا رہے ہیں۔''35

ناول جہاد ایک ایسا ناول ہے جس میں حقیقت پسندی ہے اور عصری مسائل کا بیان اس طرح سے کیا گیا ہے کہ اس میں کسی کی طرفداری اور جانبداریت نہیں ہے۔غیر جانبدار ہو کر ناول نگار نے عصرِ حاضر کے المیے کو ناول کے فن میں پرویا ہے۔جس میں مسلمانوں کے مسائل کے ساتھ ملک ہندوستان میں ان پر جو مظالم ڈھائے جاتے ہیں اس کا بیان بڑی ہنرمندی سے کیا گیا ہے۔اس ناول میں ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے بحث کیا گیا ہے۔اور ہندو اس ناول میں ضمناً موجود ہیں۔

ناول جہاد کے کرداروں کا تعارف:

مسعود خاں:

یہ ناول جہاد کا مرکزی کردار ہے جو گاؤں کوٹ کا رہنے والا کم پڑھا لکھا یتیم لڑکا ہے۔اس کردار نے

ہندو مسلم اتحاد کو قائم کرنے میں بڑی محنت و مشقت کی۔ یہ مرکزی کردار جب گجرات میں فساد ہوا تو اس کی خبر سن کر جذبات میں آ جاتا ہے اور مسلمانوں کا بدلہ لینے کے لیے گھر سے شہر کی جانب نکلتا ہے لیکن شہر پہنچنے کے بعد اس کے سارے نظریے تبدیل ہو جاتے ہیں اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوشاں ہو جاتا ہے۔

حافظ عبد الصمد:

یہ گاؤں کوٹ کے مسجد کے امام ہیں گجرات میں جب فساد ہوا تو گاؤں کے لوگ خبر سن کر بے چینی کے شکار ہو جاتے ہیں تو یہ لوگوں کو سمجھاتے ہیں۔

مہیش رائے:

مہیش رائے کانپور میں ایک تمباکو کارخانے کے مالک ہیں۔ مسعود خاں گھر چھوڑ کر جب باہر جاتا ہے اور اسے کوئی روزی روٹی نہیں ملتی ہے تو اس کو یہ اپنے کارخانے میں نوکری دیتے ہیں جس سے مرکزی کردار مسعود خاں کا جذباتی رویہ بدل جاتا ہے۔

آصفہ شبیر:

یہ وہ کردار ہے جو حرکت البشر نامی تنظیم سے منسلک ہوتی ہے اور مسعود خاں کو اس تنظیم کا رکن بناتی ہے بعد میں یہ مسعود خاں سے شادی بھی کرتی ہے۔

احمد عبد اللہ الہندی:

یہ حرکت البشر تنظیم کے سربراہ ہیں اور مسلم نوجوانوں کو اس طرف مائل کرتے ہیں کہ کس طرح سے ہندو مسلم قوم میں اتحاد پیدا کی جائے اس کے لیے یہ انتھک محنت کرتے ہیں۔

ضرغام حیدر و عبد الرحمان:

یہ دونوں کردار مسعود خاں کے دوست ہیں کانپور یونی ورسٹی کے طالب علم ہیں جہاں جہاں فساد

ہونے کے آثار ہوتے ہیں اس کو روکنے اور ہندو مسلم اتحاد برقرار رکھنے کے لیے یہ مسعود خاں کا ساتھ دیتے ہیں اور خود الگ الگ شہروں میں بم دھماکے وفساد کو روکتے ہیں۔

ان کرداروں کے علاوہ اور ذیلی کردار ہیں جو ناول جہاد کے واقعات کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

فنی جائزہ

پلاٹ:

ناول کی پیشکش میں پلاٹ کی بہت اہمیت ہے۔اسی کے سہارے ناول کا تانا بانا بنا جاتا ہے اور یہی ناول کے تاثیر کو قائم رکھتا ہے۔ پلاٹ ناول کے واقعات کے پورے ڈھانچے کو کہا جاتا ہے۔ پلاٹ کے لیے ضروری ہے کہ ناول کے واقعات میں منطقی ربط وضبط برقرار رہے۔اسی لیے ای.ایم فاسٹر نے لکھا ہے کہ:

''پلاٹ ناول کی ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے۔'' 36

پلاٹ قصے کو ترتیب دینے کا نام ہے۔ناول میں ایک کے بعد ایک واقعات پیش آتے ہیں جنھیں ناول نگار بڑے سلیقے کے ساتھ ایک لڑی میں پروتا ہے۔ پلاٹ کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ واقعات ایک دوسرے سے پیوست ہوتے ہیں تو پلاٹ مربوط کہلاتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو پلاٹ ڈھیلا کہلاتا ہے۔ناول کے پلاٹ کی تشکیل کا فن تعمیر کے فن کے مترادف ہے۔اچھے پلاٹ کے لیے فن پر مہارت کی ضرورت ہوتی ہے جس طرح معمار کو اچھی اور خوبصورت عمارت بنانے کے لیے اسے ہنر مندی درکار ہوتی ہے اسی طرح ایک ناول نگار ناول کے پلاٹ کے مختلف اجزاء کو خوبصورتی کے ساتھ ایک دوسرے سے آہنگ کرتا ہے۔ پلاٹ کے یہ اجزاء جتنے احتیاط سے فطری طور پر ایک دوسرے سے منسلک ہوں گے قصہ اتنا ہی موثر اور دلکش ہوگا۔ پلاٹ میں کیا ہوا کیسے ہوا، اور کیا ہوگا اور کیوں ہوا، اس طرح کے جتنے سوال نمایاں ہوں گے ناول کا پلاٹ اتنا ہی اثر انگیز ہوگا۔ پلاٹ واقعات کے پورے ڈھانچے کا نام ہے اچھے پلاٹ کے لیے ضروری ہے کہ واقعات کے درمیان منطقی ربط وضبط، تسلسل و ہم آہنگی برقرار رہے۔اسی بنا پر ناول کے مطالعہ میں دل چسپی اور تجسس

کی کیفیت برقرار رہتی ہے۔ یہ خیال درست ہے کہ ناول میں کردار زندگی ہے تو پلاٹ اس کی پیش کش۔احسن فاروقی اور نورالحسن ہاشمی نے اپنی کتاب ''ناول کیا ہے'' میں پلاٹ کی ترتیب و تنظیم پر اپنا اظہار اس طرح سے کیا ہے:

''پلاٹ بنانا ایک قسم کا فن تعمیر ہے اور اچھے پلاٹ والے ناول کا ہر حصہ اس طرح تعمیر ہوتا ہے جیسے کسی عمارت کے الگ الگ حصے۔۔۔۔پلاٹ میں قصہ نہایت سلیقے کے ساتھ ڈھلا ہوا ہونا چاہیے۔ضرورت سے زیادہ واقعات یا حرکات جو نفس قصہ سے کم تعلق رکھتے ہوں یک لخت چھانٹ دینا چاہیے۔پلاٹ بنانا ویسے ہی ہے جیسے کوئی بت تراش کچھ فنی قاعدوں کے مطابق کسی پتھر کی سل کو تراش کر ایک خوش نما بت بنائے مگر خوبی یہ کہ اس میں بناوٹ کا اثر نہ ہو جیسے کسی بت تراش کے بت کا اصل سے مطابق ہونا ضروری ہے ویسے ہی پلاٹ کا اصل قصے کے مطابق ہونا ضروری ہے۔''37

ایک کامیاب پلاٹ کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس میں واقعات کا تسلسل برقرار رہے جس سے قاری کی دلچسپی اور تجسس باقی رہتی ہے۔ایک کامیاب پلاٹ کی خصوصیت کے سلسلے میں وقار عظیم لکھتے ہیں:

''پلاٹ کی تاثیر اور کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس کا انجام موثر ہو، جو ناول نگار اپنے پلاٹ کا ڈھانچہ غور وفکر کے بعد مرتب کرتا ہے، اس کے مختلف اجزا میں صحیح ربط و تسلسل قائم رکھتا ہے اور پلاٹ کی اونچ نیچ، اتار چڑھاؤ اور پیچ وخم کے باوجود پڑھنے والے کے جذبات میں ہیجان و اضطراب اور امید بیم کی ملی جلی کیفیت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے، سوچی سمجھی منطق کا نتیجہ ہے کہ اس کا انجام خود بخود بہتر ہو۔''38

یعقوب یاور کے ناولوں کی فنی خوبیاں بھی ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتیں ہیں۔ان کے ناولوں کا پلاٹ مربوط اور منظّم ہے۔قصوں میں ربط و تسلسل برقرار ہے واقعات ایک دوسرے سے گتھے ہوئے ہیں۔ناول ''دل من'' کے پلاٹ میں ہم آہنگی اور تسلسل ہے جس سے قاری پر ناول کا پورا قصہ منکشف ہوجاتا

ہے۔ ناول دل من کی شروعات غروب آفتاب سے ہوتا ہے اور ناول کا اختتام چاروں طرف طوفان اور دریائے سندھ کے شوراور سورج کے غائب ہونے پر ہوتا ہے۔ناول میں جو کہانی پیش کی گئی ہے اس میں مرکزی کردار دیوانئ کے جنسی استحصال کے بعداس کوشہر دل من کے باہر پھینک دینے کا تذکرہ ہے اس کے بعد دیوانئ کوسادھومہرشی اپنی پناہ میں لیتے ہیں۔ پھراس کی حفاظت کے لیے اسے ایک شہر گملانگر بھیجا جاتا ہے۔گملانگر میں اس کو بچہ پیدا ہوتا ہے۔ بچے کو بڑے ہونے کے بعد تعلیم وتربیت کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ گملانگر کے بادشاہ کو اسی دوران بچی پیدا ہوئی جس کا نام تارکی ہے تعلیم وتربیت کے بعد دیوانئ کا لڑکا ''سرال''پیتیسی ملک کا محافظ بھی ہوتا ہے۔پھراس کے بعد تارکی سے اس کی شادی ہوتی ہے۔پھر دیوانئ اس سے دل من کے بادشاہ پر حملہ کرواتی ہے اور اپنا بدلہ لے لیتی ہے۔آخر میں جب سرال شہر دل من آتا ہے تو کشال کی لڑکی کیتی سے پیار کرکے شادی کرتا ہے۔ ناول کے آخر میں کیتی اپنے باپ کا بدلہ لینے کے لیے دیوانئ سے بدلہ لیتی ہےاورشازش کرکے دیوانئ کوقتل کے جرم میں پھنسادیتی ہےاور دیوانئ کوایک بار پھر دل من کے باہر پھینک دیاجاتا ہےجس کی بناپر دیوانئ بد دعا کرتی ہےاور پورے دل من میں زلزلہ برپا ہوجاتا ہے۔اورشہر دل من پر قیامت واقع ہوجاتا ہے۔ یہ اس ناول کا پلاٹ ہے جس کا ایک واقعہ دوسرے واقعے سے ملا ہے۔اس ناول کوعنوان کے تحت یعقوب یاور نے لکھا ہے۔ جیسے غروب آفتاب،طلوع سحر، دیوانئ، ہجرت، گومل کی وادی،سنتان پراپتی، دل من،معتوب بستی، تارکی، ہریوپیکا،اجنی شہر، پتری پال،نرتیہ، نیانگر پالک،سازش،آخری فیصلہ،اختتامیہ یہ سارے عنوان ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔

ناول''عزازیل''کوناول نگار نے تین باب میں لکھا ہے۔باب اول قیامت ہے۔باب دوم پیش ازیں اور باب سوم بعدازاں ہے۔ ہر باب میں ذیلی عنوان ہیں۔باب اول میں چھ عنوان ہیں۔1۔ہنگام لابد2۔اردبان،3۔عزازیل،4۔شاطونِ اعظم،5۔مشاورت،6۔میدانِ عمل۔باب دوم میں آٹھ ہیں۔ 1۔آفرینش،2۔طارہ نوث،3۔اہرمن،4۔مراجعت،5۔شاسین اورتلبیث،6۔تلبانخ،7۔پیش نظر، 8۔جبرائل۔باب سوم میں چھ عنوان ہیں۔1۔میزان،2۔معلم ملائک،3۔منشائے ربانی،4۔مسجودنو،5۔

انکار، 6۔اختتامیہ۔ باب دوم اور باب سوم کے سارے واقعات ایک کے بعد دیگرے پیش آتے ہیں۔ان میں تسلسل اور ربط پوری طرح برقرار ہے۔ باب اول کو مصنف نے توضیحاً پیش کیا ہے۔اس میں بھی دوسرے باب سے ربط ہے۔اس طرح سے ہم کہ سکتے ہیں کہ اس ناول کا بھی پلاٹ مربوط اور منظّم ہے۔

ناول جہاد 64 اجزا پر منحصر ہے۔اس ناول کا بھی پلاٹ دونوں ناول کی طرح مربوط ہے لیکن اس میں جو واقعات پیش کیے گئے ہیں وہ دونوں ناولوں کے واقعات سے مختلف ہیں۔اس میں گجرات فساد کے بعد ملک میں الگ الگ جگہ پر ہونے والے فرقہ ورانہ فساد کا ذکر ہے اور اس پر کچھ مسلم نوجوانوں کا ردعمل، ناول کا پلاٹ موضوع کی مناسبت سے ہے اس میں گجرات فساد کے زیراثر ملک کے دوسرے حصوں کے حالات کا بیان ہے اسی بنا پر ناول نگار نے کرداروں کے ساتھ جن واقعات کو جوڑا ہے وہ مختلف جگہوں اور شہروں کے ہیں۔اسی وجہ سے اس ناول کے پلاٹ میں کچھ بے ربطگی آ گئی ہے پر یہ واقعات کا تقاضہ تھا ویسے مجموعی طور پر اس کا بھی پلاٹ مربوط و منظّم ہے۔

کردار نگاری:

ناول میں مسلسل عمل ہوتا ہے یعنی واقعات پیش آتے ہیں۔ واقعات افراد کے بغیر رونما نہیں ہو سکتے اور انھیں افراد کو کردار کہتے ہیں اور کرداروں کی پیش کش کو کردار نگاری۔جس طرح ناول میں موضوع، پلاٹ کی اہمیت ہوتی ہے اسی طرح کردار نگاری کی بھی بہت اہمیت ہوتی ہے۔کیوں کہ انھیں کرداروں کے سہارے ناول کے واقعات آگے بڑھتے ہیں یا تو ناول بیانیہ طور پر آگے بڑھتا ہے یا پھر کرداروں کے مکالمے و افعال سے۔ یعقوب یاور کے تینوں ناولوں میں اکثر بیانیہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔لیکن ناول میں کردار نگاری، مکالمہ نگاری، منظر نگاری، بدرجہ اتم موجود ہے۔ یعقوب یاور کے ناولوں کے کردار ایسے ہیں جو واقعات و ماحول کے مناسب ہیں۔ جیسے ''دل من'' کے کردار جس میں مصنف نے سندھ کی تہذیب اور اس کے واقعات و حادثات کو پیش کیا ہے۔اسی مناسبت سے مصنف نے ایسے کردار منتخب کیے ہیں جو اس سماج سے میل کھاتے ہیں۔موہن جوداڑو کا زمانہ کیونکہ آریہ کے زمانے سے پہلے کا تھا اور ایسا مانا جاتا ہے کہ آریہ کی

زبان ویدک سنسکرت تھی اس لیے اس سے پہلے ہوسکتا ہے کہ سنسکرت کے آثار رہے ہوں۔اسی سبب سے ناول نگار نے کرداروں کے نام بھی ویسے ہی رکھے ہیں۔جیسے دیوانئ، سرال، شانو مگم، مہرشی، تارکی، کیتی، مسا کا وغیرہ۔اس ناول کے کرداروں میں وہ حرکات و جذبات موجود ہیں جو ایک ''مکمل'' کرداروں میں ہوتے ہیں۔یعقوب یاور نے اپنے ناولوں میں اکثر چپٹے کرداروں سے گریز کیا ہے۔ان کے کرداروں میں غم غصہ،خوشی، اچھائی، برائی ساری چیزیں مدغم ہیں۔

ناول میں دیوانئ جو کہ مرکزی کردار ہے۔کشال کے ذریعے جب جنسی استحصال ہوتا ہے تو اس کے اندر احتجاج اور بغاوت کا جزبہ بلند ہوتا ہے وہ ٹھان لیتی ہے کہ ہر مرد ذات سے اپنا بدلہ لوں گی۔اس کے لیے چاہے جو حربہ اختیار کرنا پڑے۔دیوانئ کو ناول میں مضبوط اور چالاک کردار دکھایا گیا ہے۔جس وقت دیوانئ نے پہلا قتل مسا کا نامی آدمی کا کیا وہ مندرجہ ذیل اقتباس میں موجود ہے۔اوراس سے پتا لگایا جاسکتا ہے کہ دیوانئ کے اندر یعقوب یاور نے کس طرح کی صفت کوڈالا ہے۔اور جو واقعہ کے حساب سے مناسب بھی ہے۔کردارنگاری کے توسط سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''دیوانئ نے محبت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ نہال ہوگیا۔اپنی بیتابی پر اسے قابو نہیں تھا۔دوسرے ہی پل وہ دیوانئ سے لپٹ گیا۔دیوانئ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔وہ بستر پر گر پڑی۔لیکن اس نے خود کو سنبھالا اور بولی مسا کا اتنی جلدی بھی کیا ہے،ابھی رات ہی کتنی ہوئی ہے۔''
>
> ''تم ٹھیک کہتی ہو دیوانئ، پرنتو میں اپنے ویاکل من کا کیا کروں، برسوں پرتیکشا کی ہے تمھاری اب تم ملی ہوتو دھیر یہ نہیں آتا۔''
>
> ''تو ٹھیک ہے دیوانئ نے کہا۔
>
> یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔چراغ گل کیا اور پلٹی تو اس کا محافظ خنجر اس کے ہاتھ میں تھا۔مسا کا اندھیرے میں دیکھ بھی نہیں پایا اور ایک ہی لمحے میں تیز دھار والا یہ خنجر اس کے سینے میں بائیں طرف پیوست ہو چکا تھا۔'' 39

''دل من''میں جتنے کردار ہیں وہ قصوں اور واقعات کی صحیح عکاسی کرتے ہیں اوران سے ان کی تہذیب ومعاشرت کا پتا چلتا ہے۔اوران کے جذبات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔جیسے راجہ کشال ایک عیاش اور شراب نوش بادشاہ تھا۔جب وہ دیوانئ کو اپنے روم میں دیکھتا ہے تو یہ کہتا ہے:

''وہ سہمی سی ایک طرف کھڑی ہوگئی۔کشال اس کے قریب آیا اوراس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔''سندری کیا تم اپنے پالک سے اب بھی اپرسن ہو؟ دیوانئ نے جواب نہیں دیا'' کشال نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بستر کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔دیوانئ آگے بڑھی اس کا چہرہ زرداور تاثرات سے عاری تھا کشال اس کے پاس بیٹھا اور بولا۔''اس نگر کی کوئی بھی سندری اپنے پالک کے آتتھیہ سے پرسن ہوسکتی ہے۔تم بھاگیہ وان ہو۔تمھیں بھی پرسن ہونا چاہیے۔''مجھے چھوڑ دو کتے۔''ورنہ میں تمہیں کچا چبا جاؤں گی''غصے میں کانپتی ہوئی دیوانئ نے چیختے ہوئے کہا کمرے میں تھپڑ کی آواز گونجی اور دیوانئ نڈھال سی بستر پر گرگئی۔کشال نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کے کپڑوں کو کھولنا شروع کر دیا۔جیسے جیسے دیوانئ کا تانبے جیسا بدن اس کے سامنے کھل رہا تھا،اس کے ہوش وحواس رخصت ہوتے جارہے تھے۔دیوانئ اب کوئی مزاحمت نہیں کررہی تھی۔اس کا نڈھال جسم بستر پر بکھرا ہوا تھا اور کشال کسی فاتح کی طرح اس کے شکست خوردہ جسم سے من مانی کررہا تھا۔'' 40

اس کے علاوہ ناول کا ایک اوراہم کردار''سرال'' ہے جو دیوانئ اور کشال کا لڑکا ہے۔دل من پہنچنے سے پہلے اپنی ماں کا فرماں بردار لڑکا تھا۔لیکن دل من میں جانے کے بعد دھیرے دھیرے اس کے اندر اس کے باپ کی صفت آگئی تھی۔اس کو ناول نگار نے اس طرح پیش کیا ہے:

''سرال کو شراب کی لت پڑگئی تھی اوراس میں کیتی کا بھی ہاتھ تھا۔وہ چاہتی تھی کہ سرال اس کے پتا کے راستے پر چلتے ہوئے اپنے انجام کو پہنچے۔وہ چاہتی تھی کہ سرال شہر کی ذمہ داریوں سے غافل رہے تاکہ اصل اقتدار اس کے ہاتھ میں رہے۔اس نے سرال کی نظروں میں اعتبار حاصل کر لیا تھا اس لیے سرال کو اس کا مشورہ ماننے میں کوئی

قباحت نظر نہیں آتی تھی۔'' 41

حالانکہ سرال 'دل من' کو فتح کرنے سے پہلے ایک اچھا جنگجو، چالاک، دوراندیش، بہادر، ذہین طالب علم اور فرماں بردار لڑکا تھا۔ جو کام سوچتا اسے کر ڈالتا تھا۔ یہی ناول نگار کے کردار نگاری کی خصوصیت ہے کہ ان کے ناولوں کے اکثر کرداروں میں نشیب و فراز کی وہ کیفیت ملتی ہے جس میں کردار نہ تو صرف شر کا نمائندہ ہوتا ہے اور نہ ہی نیکی کا پیکر ہوتا ہے۔ جس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کردار اپنے اندر زندگی کے لوازمات کو مضمر کیے ہیں۔ اس تعلق سے مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

''جنگ کا انجام وہی رہا جو سرال نے سوچا تھا اس کے دو ہزار جوانوں نے اکد کو روند ڈالا تھا۔ شاروکین نے جم کر مقابلہ کیا تھا۔ لیکن سرال کی جنگی حکمت عملی کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ اپنی شکست کے آثار دیکھ کر وہ فرار ہو گیا۔ اپنی شاندار جیت کی اطلاع اس نے ایک غلام کے ذریعہ فوراً ہی پتیسی لوگل زگسی کو بھیج دی تھی۔ لارسا اور سمیریا کے دوسرے تمام شہروں میں جشن فتح منایا گیا تھا۔ لارسا کے لوگ خاص طور پر اس کا استقبال کرنے کو بے چین تھے۔ دوران جنگ اس کی شجاعت اور حکمت عملی کے ناقابل یقین قصے لوگوں کی زبان پر تھے اور سارے لوگ اسے عام انسان نہ سمجھ کر ان اپل تصور کرنے لگے تھے۔'' 42

حالانکہ اس ناول کے کچھ کردار FLAT (چپٹے) بھی ہیں جن میں یک رنگی ہے جیسے راجہ کشال، سوریم، مہرشی وغیرہ۔

ناول عزازیل میں بھی یعقوب یاور نے کرداروں کے ذریعے سے وہی کام کروائے ہیں جو واقعہ کے عین مناسب ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار عزازیل ہے جو کہ شر اور خیر کا آماج گاہ ہے۔ جب وہ شر کا ہمنوا ہے تو یعقوب یاور نے اس سے ویسے ہی کام کروائے ہیں۔ جب وہ رامن کے نام سے دنیا میں جنم لیتا ہے تو وہ غارت گری، جنسی استحصال لوگوں کو خدا سے دور کرنے کا افعال کرتا ہے۔ جس کو ناول کے مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھ سکتے ہیں:

''ابھی رامن ویرانوں میں بھٹک ہی رہا تھا کہ اس کی نظر ایک نسوانی وجود پر پڑی۔اس سے پہلے اس نے کبھی کسی ایسے نسوانی وجود کو اتنی توجہ سے نہیں دیکھا تھا۔ یہ وجود اسے بھلا لگا۔اس کی خواہش ہوئی کہ وہ اسے چھوئے اور ساتھ رکھے۔ چنانچہ اس نے اس سے ساتھ چلنے کی درخواست کی۔ جواب میں اس نسوانی وجود نے ،جس کا نام طولان تھا،توجیہ کی کہ وہ پہلے سے ہی لامث کی تحویل میں ہے۔رامن نے پہلے تو اسے سمجھایا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ اس کے باوجود اس کے ساتھ چل سکتی ہے۔لیکن جب وہ آمادہ نہ ہوئی تو اس نے زبردستی اسے اپنی گود میں اٹھا کر کندھے پر لاد لیا۔ وہ روتی چلاتی رہی،لیکن اس کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔کچھ دور جانے کے بعد اسے ایک غار نظر آیا۔ وہ اس میں داخل ہو گیا۔طولان کی منت سماجت کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔شر کے غلبے کا ایسا عریاں اظہار اس سے قبل سرزمین اردبان پر پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ یہ ایک مرد کا اپنی قوت کے نشے میں چور ہو کر ایک کمزور عورت کے ساتھ کیا گیا اولین گناہ تھا۔اس عمل سے زمین پر لرزہ طاری تھا اور آسمان کانپ رہا تھا۔رامن نے نسوانی جسم کا ذائقہ چکھ لیا تھا۔ وہ اس کے نشے میں سرشار اور دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر تھا۔''43

اسی طرح جب وہ خیر کا سربراہ تھا تو اس سے یعقوب یاور نے خیر کے کام کروائے ہیں:

''مشعل بردار کی حیثیت سے عزازیل کا تقرر ہونے کے بعد اس کا ذوق عبادت بڑھ گیا تھا۔ یہ منصب نہایت اہم تھا لیکن اس کی مصروفیات برائے نام تھیں۔زیادہ وقت وہ خالی رہتا اور اس وقت کا بہترین مصرف اس کے لیے خدا کی عبادت تھا۔فرشتے عزازیل کے انداز عبادت گزاری کو رشک سے دیکھتے۔خدا کو خوش رکھنے کے لیے یہ طریقہ کارگر ہے یہ ہر فرشتہ جانتا تھا۔اس کا اندازہ انھیں عزازیل کے حجرے اور چہرے سے پھوٹتے نور خداوندی سے ہوتا تھا۔اس کی شخصیت محترم اور اس کا حجرہ قبلۂ ملائک تھا۔ ہر فرشتے کی تمنا ہوتی تھی کہ وہ عزازیل کی قربت میں رہے۔عزازیل کا استغراق اور انماک دیکھ کر انھیں احساس ہوتا کہ اسے خدا کی دائمی خوشنودی حاصل

ہوجائے گی۔'' 44

کردار کے اعتبار سے اس ناول میں اچھے کردار ہیں جس میں وسعت اور رنگارنگی ہے مختلف خوبیاں وخامیاں شدت کے ساتھ موجود ہیں۔اسی طرح اس ناول میں ایک نسوانی کردار تلبانیخ ہے وہ عزازیل کی محبوبہ تھی۔اور وہ عزازیل کے ساتھ ایسے ہی پیش آتی تھی جیسے ایک معشوقہ اپنے عاشق سے آتی ہے۔ناول نگار نے اس چیز کو اس کردار کے ذریعے اس طرح سے دکھایا ہے:

''میں جانتی ہوں عزازیل، لیکن تمہارے یہ تیور تمھاری نامرادی سے زیادہ تمھاری رقابت کی جانب اشارہ کررہے ہیں۔یہ تمھارے جیسے معزز شخص کے لیے نامناسب بھی ہے اور ضرر رساں بھی۔رامن کی قسم، میں تمھاری ہمدرد ہوں دشمن نہیں۔لیکن شاطون اعظم سے جنگ میں میں تمھاری مدد نہیں کرسکوں گی۔البتہ اس سے تمھاری جان کو خطرہ ہوا اور میں نے سنا یا تم نے مجھے مدد کے لیے پکارا تو میں ضرور آوں گی۔ عزازیل، ہماری رفاقت اتنی کمزور نہیں ہے کہ اسے شاطون اعظم جیسے لوگ توڑ سکیں۔''45

یعقوب یاور کے ناولوں کے کردار ایسے ہیں کہ جن کی ساخت واحوال پوری طرح کھل کر قاری کے سامنے آجاتے ہیں اور ان کرداروں کے ذریعے واقعات صحیح طور پر ناول میں پیش کیے گئے ہیں۔انھوں نے اپنے ناولوں میں کرداروں کو وہی کام دئے ہیں جو واقعہ و ماحول کے مناسب ہوتا ہے۔یہ کردار جامد وساکت نہیں ہیں ان کے افعال واقوال میں ضرورت کے تحت تغیر وتبدیلی واقع ہوتی ہے۔اس ضمن میں مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

''چند منٹ بعد ہی آٹو لھورا بیر کے ایک ہوٹل کے سامنے رکا۔آٹو والا کاونٹر پر آیا اور کسٹمر لانے کی خبر دے کر اپنا کمیشن وصول کیا اور واپس آکر رکشے سے مسعود کا سوٹ کیس اتار کر ہوٹل میں لے چلنے کی کوشش کی۔مسعود نے اس سے سوٹ کیس لے کر اسے اس کا کرایہ ادا کیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔اب تم اتنا کشٹ کیوں کرتے ہو، یہ کام میں سویم کرلوں گا۔اس نے بڑی چابک دستی سے اپنی زبان بدل لی تھی۔وہ اپنے

> سوٹ کیس کے ساتھ ہوٹل کے کاونٹر پر پہنچا۔ تو منیجر نے اس کے سامنے مسافروں کے اندراج کا رجسٹر کھسکا دیا۔ اس نے اطمنان سے رجسٹر کی تمام خانہ پری کی۔ نام کے خانے میں سوہن لال لکھا، باپ کے نام کی جگہ ماکھن لال اور مستقل پتے کی جگہ فتح پورا کا ایک فرضی پتہ اور شہر میں ٹھہرنے کی مدت پانچ دن درج کر دی۔'' 46

مجموعی طور پر یعقوب یاور کی کردار نگاری کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ناولوں میں جو کردار پیش کیے ہیں وہ موضوع اور واقعات کے مطابق ہیں۔ انھوں نے جس جس موضوع پر ناول لکھا ہے اسی مناسبت سے کردار کا انتخاب بھی کیا ہے۔ اور ان کے ناولوں کے کردار اسی دنیا کے ہیں جس دنیا پر ناول منحصر ہے۔ ناول میں کردار عموماً دو طریقوں سے ظاہر کیے جاتے ہیں ایک طریقہ تشریحی ہوتا ہے اور دوسرا طریقہ ڈرامائی، تشریحی طریقہ یہ ہے کہ ناول نگار کردار کے افعال و اقوال احساسات و جذبات کو خود بیان کرے دوسرا یہ کہ کردار اپنی بات چیت وافعال سے خود کو روشناس کرائے۔ یعقوب یاور کے ناولوں میں کردار نگاری کا طریقہ اکثر تشریحی ہے کیوں کہ ان کے ناولوں کا فارم زیادہ تر بیانیہ ہے۔

مکالمہ نگاری:

کرداروں کا آپس میں بات چیت کرنا مکالمہ کہلاتا ہے ۔ مکالمہ نگاری ناول کا ایک اہم جز ہے۔ مکالمہ ہی کے ذریعے کردار کے ارادے احساسات و جذبات وغیرہ ظاہر ہوتے ہیں۔ ناول نگار کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ مکالمے کو عمدہ بنانے میں خاص خیال رکھے۔ مکالمہ فطری، مناسب، موزوں واضح اور مختصر ہونا چاہیئے۔ مکالمہ ناول کے فن کا ایک ایسا عنصر ہے جسے لفظوں اور جملوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ کرداروں کا احساس اور انداز فکر کی آئینہ داری بھی مکالموں کے ذریعے ہی ہوتی ہے۔ اگر ناول میں تمام اوصاف موجود ہیں مگر مکالمے بے جان ہیں تو ناول کا تمام حسن ماند پڑ جاتا ہے۔ کیوں کہ مصنف جو کہنا چاہتا ہے اس کی بنیاد مکالمے پر ہوتی ہے۔ یعقوب یاور کے ناولوں میں کرداروں کے ذریعے سے جو مکالمے پیش کیے گئے ہیں وہ مکالمے تکلف اور تصنع سے پاک ہیں۔ یعقوب یاور کے تینوں ناولوں کے مکالمے الگ الگ ہیں۔ معاشرے کے جن طبقات سے ناول میں کردار منتخب کیے گئے ہیں ان طبقات کی زبان کو ناول نگار نے

مکالمے کے طور پر لکھا ہے۔

ناول ''دل من'' میں مکالموں کی زبان خالص ہندی ہے۔ کرداروں کے مکالمے ہی کی وجہ سے یوسف ناظم کو یہ ناول مہابھارت جیسا معلوم ہوا ہے۔ اور ساتھ ہی اس ناول کا بیانیہ انداز بھی یوسف ناظم کو بہت بھایا ہے۔ وہ اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''باوجود اس کے کہ دل من کی زبان ہندی اور سنسکرت آمیز ہے، اس کے پڑھنے میں مجھے وہی مزا آیا جو راہی معصوم رضا کے مشہور و معروف سیریل ''مہابھارت'' دیکھنے میں آیا تھا۔ اس سیریل کا شاید ہی کوئی ایپیسوڈ مجھ سے چھوٹا ہو۔ اس کتاب کا بھی کوئی صفحہ میری زد سے بچا نہیں ہے۔ دل من تمدن سندھ کے پس منظر کو نہایت خوب صورتی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ یہ گرے کی ''ایلیجی'' نہیں ہے نہ داستان امیر حمزہ ہے، لیکن اس میں رزم و بزم کی ہر وہ حکایات ہے جو قاری سے اصرار کرتی ہے، آگے پڑھو اور آگے پڑھو۔'' 47

کرداروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی زبان اور اپنی تہذیب ساتھ لاتے ہیں۔ اگر کوئی کردار اپنی تہذیبی جڑوں کی نمائندگی نہیں کرتا تو اسے مجرد مانا جاتا ہے۔ دل من کے تمام کردار اپنی تہذیبی جڑوں سے وابستہ ہیں زبان، پوشاک، رہن سہن، ہر چیز سے سندھ کی تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں۔ دل من کے کرداروں کی زبان سنسکرت زدہ ہے اس سلسلے میں ناول نگار خود کہتے ہیں:

> ''اس ناول میں ہندی الفاظ کا کثرت سے استعمال ہے، یہ بات درست ہے۔ دراصل میں اس سلسلے میں ذرا مختلف انداز میں سوچتا ہوں۔ ہوا یہ تھا کہ کافی عرصہ پہلے احمد علی کا انگریزی ناول "Tuilight in Delhi" میرے مطالعہ میں آیا تھا۔ یہ ناول بہادر شاہ ظفر کے زوال کے پس منظر میں تھا۔ اس میں جب میں بادشاہ اور لال قلعے کے ملازمین کو انگریزی میں باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا تو مجھے یہ حقیقت سے بعید محسوس ہو رہا تھا۔ زبانوں کی مجبوری اپنی جگہ لیکن مجھے لگا کہ جہاں تک ممکن ہو زبان کو کردار کے قریب ہونا چاہیے۔ پھر اسی زمانے میں قدسیہ زیدی کا اس ناول کا

ترجمہ ''دلی کی ایک شام'' میرے مطالعے میں آیا۔اب یہ ناول اپنی تہذیب سے نسبتاً بہتر طور پر وابستہ ہو گیا تھا۔خود احمد علی نے اس کے مقدمے میں تحریر کیا کہ یہ اردو ترجمہ انگریزی ناول سے بہتر ہو گیا ہے۔ دل من کو لکھتے وقت مجھے لگا کہ اردو اور ہندی دونوں ایک ہی بنیاد پر کھڑی زبانیں ہیں۔ سندھ کی قدیم تہذیب سے ہندی کا سنسکرت زدہ اسلوب جس طرح میل کھاتا ہے اردو کا، عربی اور فارسی کا پس منظر نہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اردو قارئین کے لیے ہندی الفاظ غیر مانوس نہیں ہیں۔ چنانچہ میں نے اس ناول میں جہاں جہاں کرداروں کے لیے ضروری محسوس ہوا، بے دریغ ہندی زبان کا استعمال کیا۔'' 48

یعقوب یاور کی ان باتوں سے مجھے بھی اتفاق ہے کہ کرداروں کی زبان سے وہی بات ادا کروانی چاہیے جو اس کے تہذیب اور ماحول کے مطابق ہو۔ پر ایک بات ہے کہ سندھ کی تہذیب میں کیا سنسکرت زبان تھی۔اس کے بارے میں ابھی تک تحقیق میں کچھ ثابت نہیں ہوا ہے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی زبان جو بھی رہی ہو، سنسکرت سے ضرور قریب رہی ہوگی۔ کیوں کہ موہن جوداڑو کا زمانہ آریہ کے پہلے کا ہے۔ آریہ میں سنسکرت زبان کا چلن تھا اس لیے ہوسکتا ہے کہ اس کے نمونے موہن جوداڑو میں رہے ہوں۔ ناول ''دل من'' میں کرداروں نے جو مکالمے اپنی زبان سے ادا کئے ہیں وہ مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھے جا سکتے ہیں:

''تھوڑی دیر بعد اس وقت جب یامنی اپنے کپڑے ٹھیک کر رہی تھی اور نگر پالک بستر پر بے سدھ پڑے تھے۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ''یہ کون دھرسٹ ہے جو ہمارے وشرام میں بادھا اتپن کر رہا ہے'' کشال چیخا۔''

''شما کریں مہامن'' باہر سے مہاویر مانگدی کی آواز آئی ایک اتی آوشیک سوچنا نے اس وگھن پر ووِش کیا ہے۔'' 49

لیکن یعقوب یاور نے بیانیہ کے لیے خالص اردو زبان بڑی خوبصورتی اور روانی کے ساتھ تحریر کیا ہے۔جس میں سلاست بے تکلفی اور سادگی ہے۔اس ناول کے فن پر ڈاکٹر کوثر مظہری لکھتے ہیں:

''یعقوب یاور کے تہذیبی اور تاریخی شعور اور فنی بصیرت کے امتزاج سے اردو کے ایک ایسا ناول مل گیا ہے جو نئی نسل کے لیے بصیرت افروزی کا کام کرتا رہے گا۔ اگر فنی خود اعتمادی اور تخلیقی قوت کا فقدان ہوتا تو یعقوب یاور اس تاریخ کی پوتھی کو فکشن کے بدلے کچھ اور بنا دیتے۔ بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ ایک خاص تناظر کے باوجود یعقوب ماحول اور تاریخ کی جگالی کرتے نظر نہیں آتے۔ ان کے صاف ستھرے اسلوب نگارش نے تہذیبی تاریخ کو مزید منزہ مجلیٰ کر دیا ہے۔ انھوں نے بیانیہ کے لیے تو خالص شستہ اردو زبان کا استعمال کیا ہے لیکن مکالموں میں کردار کے مطابق بیشتر ہندی اور ہندوستانی الفاظ کا خوبصورت استعمال کیا ہے۔''50

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ''دل من'' میں مکالمہ نگاری کے وہ سارے عناصر موجود ہیں جو اس جز کے لیے مناسب اور احسن ہوتا ہے۔ اس ناول میں کرداروں کے مکالموں سے واقعات میں فطری جامعیت پیدا ہوئی ہے اور اس کے ذریعے ناول کے واقعات کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ یعقوب یاور نے اپنے دوسرے ناولوں میں بھی موزوں اور کردار کے مطابق مکالمے لکھے ہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا خاتون محترم

میں اپنے وعدہ کے حسار میں پھنس چکی ہوں، عزازیل لیکن تمھارے اس اقدام سے عزازیل کو بہت رنج ہوا''۔

بہتر ہوگا کہ اب تم شاطون اعظم کی برتری تسلیم کر لو۔ اور اس تنازعے کو ختم کر کے اپنے لیے ہر طرح کی آسائش حاصل کر لو۔ شاطون اعظم اس کے بدلے تمھیں دنیا کی ہر نعمت فراہم کر سکتا ہے۔ اس نے مجھ سے ایسا ہی کہا ہے۔

عزازیل کو تم سے یہ امید نہیں تھی تلبانخ کہ ایک دن تم شاطون کی حمایت میں اس طرح میرے سامنے آؤ گی۔

نہیں عزازیل تمھاری آمدگی بعد از وقت ہے۔ اب میں اپنے وعدہ سے بندھ چکی ہوں۔'' 51

اس اقتباس میں عزازیل اور اس کی معشوقہ آپس میں گفتگو کرتے ہیں جب عزازیل مدد کے لیے تلبانیخ کے پاس جاتا ہے تو وہ عزازیل سے اس طرح سے بات کرتی ہے۔ اور وہ اپنے وعدہ کا حوالہ دے کر عزازیل کو مناتی ہے جس سے عزازیل مان بھی جاتا ہے۔ اسی طرح اس ناول میں دوسرے بھی مکالمے ہیں۔ جو کردار اور ماحول کے عین مطابق ہیں:

''دوران تعلیم فرشتے تو اس سے طرح طرح کے سوالات پوچھتے ہی تھے۔ ایک دن خود اس نے فرشتوں سے سوال پوچھا۔ ''کیا تم عزازیل سے محبت کرتے ہو۔؟''

''عزازیل ہمارا رہبر اور معلم ہے۔ اس سے محبت ہم پر فرض ہے۔

''کیا تم اس سے غداری اور نافرمانی کے مرتکب ہو سکتے ہو؟''

''ایسا ممکن نہیں ہے۔''

''کیا اس کے کہنے پر تم کچھ بھی کر سکتے ہو؟''

''یقیناً''

عزازیل ان جوابات سے خوش تھا۔ اس نے ایک قدم اور بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''اگر ایک طرف خدا ہو اور دوسری طرف تمھارا معلم عزازیل تو تم کس کی طرف ہو گے؟''

''ہم خدا اور معلم کو ایک ہی طرف دیکھتے ہیں۔ ان کو علاحدہ علاحدہ دیکھنے کا تصور ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔''

''لیکن اگر ایسا واقعی ہو جائے تو؟''

''تو معلم ملائک ہماری اس گستاخی کو معاف فرمائیں، لیکن اگر ایسی صورت وجود میں آتی ہے تو تمام ملائک خدائے قادر کی طرف ہوں گے۔'' 52

ناول ''عزازیل'' کے مکالمے میں جو زبان مستعمل ہے وہ سادہ، صاف و عام فہم ہے۔ یعقوب یاور کے مکالمے پلاٹ اور کردار کی مناسبت سے ہیں۔ ناول ''جہاد'' میں کرداروں پر علاقائیت کا اثر ہے۔ اس وجہ سے جہاد کے کرداروں کے مکالمے علاقائی زبان میں بھی ہیں۔ اور ہندو مسلم کی زبان میں تفریق ہے۔ مسلم

کرداروں کے لیے ناول نگار نے اردو زبان کے ساتھ علاقائی زبان کا انتخاب کیا ہے۔اسی طرح غیر مسلم کرداروں کے لیے علاقائی زبان یا پھر ہندی۔ حالانکہ اس مکالمے سے یہ اندازہ بالکل نہ لگایا جائے کہ یعقوب یاور نے ہندی اور اردو کا مذہب کی بنا پر تفریق کیا ہے۔جس ماحول میں یہ ناول لکھا گیا ہے۔اس کی ضرورت کی بنا پر ایسے مکالمے اختیار کے گئے ہیں۔حالانکہ یہ مکالمے ناول کی کچھ جگہوں پر ہی ہیں۔اس ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس کو ناول نگار نے جگہ اور کردار کی مناسبت سے لکھا ہے:

''ایک معمر عورت نے اپنے قریب کی دوسری عورت سے کہا۔آئے، کتی نیک لاگت ہے مسود کی عورت۔

اس پر دوسری خاتون نے جواباً کہا۔ہٹ، کا کھت ہس۔یا مسود کی عورت نھیں دوس ھوے۔

ارے نھیں نا تو جلدی ھوئی جائی۔وہ خاتون جیسے اپنے قول سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھی۔ ہو جائی تو کتنا اچھا ہوئی۔'' 53

یہ علاقائی زبان ہے جو کردار آپس میں بول رہے ہیں۔دوسرے اقتباس میں جس میں غیر مسلم کردار، ہندی زبان کا استعمال کرتے ہیں۔اس کے لیے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''پنڈت جی۔ٹھاکر ویر سنگھ گرجے۔آپ کو دھیان رکھنا چاہیے کہ شری واستو جی ہمارے آدرنیہ اتھتی ہیں۔شما چھاہتا ہوں ٹھاکر صاحب،۔میں انھیں پہچانا نہیں، کبھی آپ کے یہاں دیکھا بھی نہیں، بھول ہوئی۔پنڈت جی کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے بولے۔'' 54

یعقوب یاور کے تینوں ناول کے مکالمے کرداروں کی مناسبت سے لکھے گئے ہیں۔جس سے ناول کے کرداروں کی شناخت ابھر کر سامنے آتی ہے۔اور واقعات کی اہمیت ناول میں بڑھ جاتی ہے۔ان کے مکالمے کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کرداروں کی جگہ اور مقام اور وقعت کی بنا پر مکالمے تحریر کیے ہیں۔

منظر نگاری:۔

کامیاب منظر کشی ناول کو دلکش اور پر اثر بناتی ہے۔مطلب یہ کہ کسی مقام کا ذکر کیا جارہا ہے یا واقعہ بیان کیا جارہا ہے۔تو فنکار اس کی تصویر ایسے کھینچے کہ پڑھنے والے کو محسوس ہو کہ وہ خود جائے واردات پر موجود ہے اور سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ناول واقعات اور کرداروں کا ایک خاص پس منظر ہوتا ہے۔دنیا کے تمام واقعات اپنا زمانی و مکانی پس منظر رکھتے ہیں۔انسانی معاشرے کے افراد بھی زمانی و مکانی پس منظر کے تابع ہوتے ہیں۔فطری طور پر ناول کے واقعات اور کرداروں کا بھی کوئی نہ کوئی زمان و مکان ہوتا ہے۔ناول کے واقعات اور کرداروں کے افعال سے اگر زمان و مکان کو نکال دیا جائے تو ان کے حسن واثر کی وقعت زائل ہو جائے گی۔دنیا میں ہر واقعہ و حادثہ اپنے متعلقہ عہد میں ہی معنی خیز ہوتا ہے۔اور ہر کردار اپنے ہی دور میں اثر انگیز ہوتا ہے۔اسی طرح ہر واقعہ کے رونما ہونے کا ایک جگہ ہوتا ہے۔اگر کسی واقعہ کو اس کے اصل جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ پر بیان کیا جائے تو اس واقعے اور بات کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی اور اس کی اصلیت و معنویت کھو جائے گی۔ہر کردار کے متحرک اور سرگرم رہنے کی بھی ایک خاص جگہ ہوتی ہے۔اگر ان کو اپنی جگہوں سے ہٹا دیا جائے تو واقعے کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔جیسے ٹیچر کو پولس تھانے میں بٹھا دیا جائے اور پولس کو کلاس میں۔ہر عہد کے اپنے حالات اور ہر جگہ کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ناول کا واقعہ انھیں حالات اور تقاضوں کے پس منظر میں بامعنی اور موثر بنتا ہے۔منظر نگاری دراصل معاشرہ نگاری ہے۔ناول کے واقعات اور کرداروں کا اگر زمانہ اور جگہ متعین نہ ہو تو معاشرہ نگاری مبہم بن جاتی ہے۔ناول نگار جس معاشرے کے واقعات و حالات کو پیش کرتا ہے ان کی تفصیلات کے لیے وہ منظر نگاری کا سہارہ لیتا ہے۔جو ناول کے واقعات و حادثات کو آگے بڑھانے میں کارآمد ہوتے ہیں۔ناول نگار اپنے عہد اور اپنے گرد و پیش کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا بغور مطالعہ،مشاہدہ کرتا ہے۔اور اپنے تاثر کو تخلیقی انہماک اور فنی بصیرت کیساتھ منظر نگاری کے ذریعے سے ناول میں جگہ دیتا ہے۔

یعقوب یاور نے اپنے ناولوں میں مقامات و ماحول کا ذکر دو طرح سے کیا ہے۔ایک یہ کہ سماج کا

نقشہ بازاروں، سڑکوں، گلیوں، مکانوں وغیرہ سے پیش کیا ہے۔ دوسرا یہ کہ انھوں نے مناظر قدرت کو پیش کیا ہے جن میں سمندر، جنگل، پہاڑ، دریا، سورج، چاند، موسم وغیرہ کی منظرکشی کی ہے۔ یعقوب یاور نے اپنے ناولوں کی ابتداء منظر نگاری سے کی ہے جس سے ناولوں میں دلکشی اور اس کے تاثیر میں اضافہ ہوا ہے۔ ساتھ ہی پلاٹ کے ارتقاء و کردار کی تعمیر و توجیہ میں یہ منظر نگاری معاون و مددگار ثابت ہوئی ہے۔ ناول عزازیل کا ایک اقتباس درجہ ذیل سطروں میں مرقوم ہے جس میں مناظر قدرت کے ساتھ سماج کا نقشہ عمارتوں اور مکانوں کے ذریعے سے کھینچا گیا ہے:

> ''سب سے پہلے زمین کے لرزنے کا احساس ہوا تھا۔ پھر ہلکی سی خوش گوار گرم پانی کی بارش ہوئی تھی۔ پھر اچانک سارا آسمان سبز دکھائی دینے لگا تھا۔ پھر لگا جیسے کوئی ان دیکھی قوت اس شہر بے مثال کی عمارتوں، سڑکوں اور تمام آلات حیات کو اس طرح توڑ ڈال رہی ہے جیسے کوئی بچہ کسی پر ناراض ہو کر خود اپنے کھلونے توڑنے لگتا ہے۔ ہر چیز شکستہ ہو کر زمیں بوس ہو رہی تھی۔ اور یہ سب کسی ایک شہر تک محدود نہیں تھا کم و بیش سارے سیارے کا یہی عالم تھا۔'' 55؎

اس اقتباس کو پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ یعقوب یاور نے اپنے ناولوں میں بڑی ہنرمندی کے ذریعے منظر نگاری کو پیش کیا ہے۔ ناول دل من میں یعقوب یاور نے منظرکشی کچھ اس طرح سے کی ہے۔ جس میں موہن جوداڑو اور ہڑپا کے مقامات و ماحول کی تصویر کشی ہے:

> ''آسمان پر سیاہی مائل، بھورے بادلوں کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جلد ہی تیز بارش ہونے والی ہے۔ لیکن ابھی ہلکی بوندا باندی کے بعد پانی رک گیا تھا۔ آسمان سے ٹپکنے والی یہ چند بوندیں بھلے ہی زمین کے سینے پر ہونے والے کالے کارناموں کا آسمانی ردعمل نہ رہی ہو لیکن اس وقت دل من کی شہر پناہ کے مشرقی پھاٹک کے باہر کھڑی ایک بے بس اور بے سہارہ ادھیڑ عورت ایسا ہی سمجھ رہی تھی۔'' 56؎

مندرجہ بالا اقتباس میں اس قدرتی عذاب کی منظرکشی ہے جو دیوائی کی مظلومیت کی وجہ سے شہر دل

من پر آیا۔اس کے لیے دیوانئ بددعا کی تھی۔ناول عزازیل کا دوسرا اقتباس ملاحظہ ہو جس میں منظر کشی کچھ اس طرح سے ہے۔

''اردبان پر موت کا سناٹا طاری تھا۔سارا گردوغبار چھٹ چکا تھا۔یہاں کا سارا نظام صنعت اب خود پر ماتم کناں تھا۔صنعت نے فطرت کے سامنے اپنی شکست عظیم تسلیم کرلی تھی۔چاروں طرف ایک ہو کا عالم تھا،سکوت تھا اور بس ایسے ہی یہ خاموش لمحے میں ایک اور سیارہ اپنا راستہ بھٹک کر اردبان سے ٹکرایا اور دونوں کے پرخچے اڑ گئے سیارہ امن وامان اردبان پر فنا کا آخری نمونہ پیش کیا جاچکا تھا۔'' 57؎

اس اقتباس میں انسانی دنیا کے پہلے کی دنیا اردبان پر قیامت کی منظر کشی ہے۔جس کو یعقوب یاور نے بہت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔اس طرح اس ناول کا دوسرا اقتباس ملاحظہ ہو:

''عزازیل حیران تھا جبرائل کی سرکردگی میں ان کا قافلہ جس وقت عرش اصغر پر پہنچا تو ہزاروں کی تعداد میں ملائک ان کے استقبال میں کھڑے تھے۔عزازیل کے ذہن میں پہلے خیال یہ آیا تھا کہ شاید اہتمام اس فاتح لشکر جرار کے استقبال کے لیے کیا گیا ہے۔جو آشیانے اردبان کی سرکوبی کے بعد واپس لوٹا ہے۔لیکن اس کا یہ خیال درست نہیں تھا۔استقبال کرنے والوں کی سربراہی خود اسرافیل کے سپرد تھی۔جو ایک طویل مصروفیت کے بعد فارغ ہوا تھا۔عرش پر ان کے قدم پڑتے ہی وہ نہایت ادب سے عزازیل کے سامنے آیا اور بولا ساکنان عرش آپ کا استقبال کرتے ہیں۔عزازیل محترم۔'' 58؎

اس اقتباس میں عزازیل کو دنیا سے آسمان پر اٹھائے جانے کا جو منظر تھا اس کو یعقوب یاور نے ناول میں پیش کیا ہے۔ناول دل من کا دوسرا اقتباس ملاحظہ ہو:

''موت سامنے تھی لیکن اس عورت کو موت کا ڈر نہیں تھا۔اسے اب اور جینے کی خواہش نہیں تھی۔اس کے دل میں کوئی انتقامی جزبہ نہیں تھا۔شاید اسی لیے وہ جنگلی جانوروں اور دریا کی ملی جلی خوفناک آوازوں سے بے نیاز تھی۔اس کا جسم بخار کی حدت سے

ٹوٹ رہا تھا۔اور ذہن و دماغ فیصلے کی قوت کھو چکے تھے۔اس کی زندگی کی ساری ریاضت برباد ہو چکی تھی۔شاید یہی سبب تھا کہ اس لمحے وہ بے ہوشی کا مقابلہ کرتے ہوئے حیات وموت کی کشمکش سے آزاد کسی اور فکر میں مبتلا تھی۔وہ سوچ رہی تھی کہ شہر پناہ کے اس پھاٹک سے باہر پھیکے جانے والا واقعہ اس کی زندگی میں دوسری بار رونما ہوا تھا۔'' 59

مندرجہ بالا اقتباس میں یعقوب یاور نے دیوانئ کی اس حالت کی منظرکشی کی ہے جب اس کا جنسی استحصال ہوا اور اس کو بادشاہ نے شہر کے باہر پھینک دیا تھا۔ناول دل من کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

''تھوڑی دیر بعد سورج غروب ہو گیا اس نے سرال کی مدد سے کچھ سوکھی لکڑیاں جمع کیں اور انھیں جلایا۔ویسے مسر نے اس جگہ رکتے ہوئے کہا تھا کہ یہ جگہ نہایت محفوظ ہے یہاں خطرناک جنگلی جانور بالکل نہیں ہیں۔ان کے پاس کھانے کا سامان تھا جسے دونوں نے مل کر تیار کیا اور کھانے کے بعد وہیں کپڑا اچھا کر لیٹ گئے۔سرال کا کہنا تھا کہ دیوانئ سو جائے اور وہ تمام رات جاگ کر پہرہ دے گا۔'' 60

اس اقتباس میں اس واقعہ کی منظرکشی ہے جب دیوانئ اور اس کا لڑکا سرال شہر ہریوپیکا (ہڑپا) کی طرف جا رہے تھے۔تو شام ہوگئی اور ایک جنگل میں رک گئے تھے۔اس کی منظرکشی یعقوب یاور نے اس طرح سے کی ہے۔ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

''اب سرال آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے مہادیو سے مخاطب تھا۔بادلوں کی گڑگڑاہٹ میں اس کی آواز دب کر رہ گئی۔جیسے مہادیو نے اس کی بات سننے سے انکار کر دیا ہو اور تھوڑی دیر بعد دل من میں ایک بھی چیخ باقی نہیں بچی تھی۔پورا شہر خاموش تھا۔آواز تھی تو بس تیز ہواؤں کے چلنے کی، پانی کے گرنے کی، اور دریائے سندھ کے گرجنے کی۔لیکن اب طوفان کی شدت میں کمی آنے لگی تھی۔اس کے بعد سورج نے اس حسین شہر، دیوتاؤں کی پسندیدہ سرزمین، جنت نظیر دل من کی شہر پناہ کے پھاٹک کو کھلتے پھر کبھی نہیں دیکھا۔'' 61

مندرجہ بالا اقتباس ناول ''دل من'' کا ہے۔جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ شہر دل من پر خدا کا عذاب آیا تو اس کی حالت کیا تھی۔ناول نگار نے اس کی منظرکشی اس طرح سے کی ہے کہ قاری کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ سارے مناظر کو از خود دیکھ رہا ہے جس سے ناول کو پڑھنے میں اس کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔منظر نگاری کے تعلق سے ناول ''دل من'' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''آسمان سے موسلا دھار پانی برس رہا تھا۔دل من کے ناگرکوں نے بارش کے یہ تیور پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔وہ ایسا بھی محسوس کر رہے تھے کہ دریائے سندھ کا غضب بھی بارش کے ساتھ شامل ہو گیا۔انھیں یہ بھی لگ رہا تھا کہ زمین سے بھی جگہ جگہ پانی ابل رہا ہے۔شہر کے لوگ دیوتاؤں کو یاد کر رہے تھے۔لیکن دیوتا جیسے دھرتی اور یہاں کے رہنے والوں سے غافل ہو چکے تھے۔'' 62

اس اقتباس میں دل من شہر پر جب پانی کا عذاب آیا تو اس منظر کو ناول نگار نے اس طرح بیان کیا ہے کہ اس منظر کی کیفیت و احوال قاری پر عیاں ہو جاتی ہے۔

سن 2002 میں گودھرا کانڈ کی وجہ سے گجرات میں جو فساد ہوا اور اس سے پورے ہندوستان کے مسلمانوں میں جو خوف و دہشت کا سماں ہر طرف طاری تھا اس کی روداد ناول جہاد میں موجود ہے اس کا نقشہ ناول نگار نے کچھ اس طرح سے کھینچا ہے۔ناول کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''مغرب میں غروب ہونے والا آفتاب کچھ شرمندہ سا اپنا چہرہ بادلوں کے پیچھے چھپانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔اس کی نظروں کے سامنے جو کچھ ہوا تھا اسے پسند نہیں تھا۔اللہ کی یہ مصلحت تھی مسلم اکثریت والے قصبہ کوٹ کی جامع مسجد کے پیش امام حافظ عبدالصمد نے مغرب کی نماز کے بعد مسجد سے نکلتے ہی ڈرے سہمے مسلمانوں سے جیسے ڈھارس بدھانے والے انداز میں کہا۔اس کی ہر مصلحت میں بنی نوع انسان کی فلاحی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور پوشیدہ ہوتا ہے۔''63

اسی ناول میں لکھنؤ حضرت گنج کی منظرکشی کو اس طرح سے پیش کیا گیا ہے:

> ''حضرت گنج چوراہے پر واقع لکھنؤ کا قدیم کافی ہاوس تاریخی اہمیت کا حامل رہا

ہے۔ یہ وہی کافی ہاوس تھا جہاں بیٹھ کر متعدد سیاست دانوں نے وطن کی تاریخ لکھی تھی۔ یہاں بیٹھنے والے شعراء وادباء نے نہ صرف وطن کے فکری نظام پر بحث وتمحیص اور غور وخوض کیا بلکہ اپنے اشعار اور پر اثر تحریروں سے ملکی مسائل کی نشاندہی کا قابل قدر انجام دیا۔'' 64؎

مندرجہ بالا اقتباس میں یعقوب یاور نے حضرت گنج چوراہے کی احوال وکیفیت کو اس طرح سے بیان کیا ہے کہ اس کی اہمیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

ناول جہاد کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو جس میں ناول نگار نے بنارس کی گلی مدن پورہ کی منظر کشی کی ہے:

''صبح کے سات بجے تھے مدن پورہ کی گلیوں میں چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ صبح معمول کی سیر سے واپسی کے فوراً بعد اپنے گھر اجنبی نوجوان کو اپنا منتظر پانے اور اس سے ملاقات کا تحیر اور اس سے ہونے والی گفتگو سے پیدا شدہ خوف اب بھی عبدالرحمٰن کے چہرے سے عیاں تھا۔''65؎

اس اقتباس میں منظر کشی کے دو حصے ہیں۔ ایک محل کی اور ایک کیفیت کی، مدن پورہ کی گلیوں کی چہل پہل اور دوسرے حصے میں عبدالرحمٰن کی ذہنی خوف ودہشت کو انھوں نے اس طرح سے بیان کیا ہے۔

ناول عزازیل کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو جس میں یعقوب یاور کی منظر کشی بدرجہ اتم موجود ہے:

''محل کے بیرونی میدان میں لوگوں کی بھیڑ جمع تھی یہ سب اسی پر اثر ار موسیقی کے دھن پر رقص کر رہے تھے جو کبھی مشرق کی جانب سے آتی محسوس ہوتی تھی۔ اور کبھی مغرب کی طرف سے۔ یہ اپنے آقائے سیارہ سے مدد کے طالب تھے انھیں اب بھی یہ یقین تھا کہ وہ جلد ہی انھیں تحفظ فراہم کرے گا۔ لیکن جب سارا محل مٹی اور راکھ کے ایک عظیم الشان ڈھیر میں تبدیل ہو گیا تو وہ مایوس ہو گئے۔'' 66؎

اس اقتباس میں ناول نگار نے اس جگہ کی منظر کشی کی ہے جس کا بادشاہ شاطون اعظم ہوتا ہے۔ وہ اور اس کی قوم اللہ کی اتنی نافرمان ہو جاتی ہے کہ جس کی بنا پر یہ عذاب آتا ہے۔ جس کا بیان ناول میں اس

طرح سے کیا گیا۔ناول ''دل من'' میں شہر ہریو پیکا (ہڑپا) کی تصویر کشی اس طرح سے کی گئی ہے:

''ہریو پیکا کوئی معمولی شہر نہیں تھا۔ دریائے راوی کے کنارے بسایا شہر اپنے محل وقوع کے اعتبار سے مثالی تھا اس کے بارے میں مشہور تھا کہ دیولوک میں رہتے رہتے جب دیوتا اکتانے لگے تب انھوں نے دھرتی پر رہنے کا ارادہ کیا اور اس شہر کی بنیاد رکھی۔ترقی کرتے کرتے یہ شہر کئی معنوں میں مرکزی حیثیت اختیار کر گیا۔ یہ ایک بڑا تجارتی مرکز تھا۔ جہاں دور دراز کے تاجر آ کر اپنا سامان فروخت کرتے تھے اور کئی دوسرے شہروں کے لوگ اپنی ضرورت کا سامان حاصل کرنے کے لیے یہاں آتے تھے۔سونے کے زیورات فروخت کرنے والے وسطی ہند سے ، چاندی کے تاجر مغرب قریب سے، قیمتی پتھر تانبا فروخت کرنے والے مغربی ہند سے یہاں آتے تھے۔'' 67

شہر ہریو پیکا کی تصویر کشی یعقوب یاور نے اس طرح سے کی ہے کہ قاری کے ذہن میں شہر کا محل وقوع اور اس کی اہمیت دونوں اجاگر ہو جاتی ہے۔انھوں نے ناولوں میں مختلف مناظر کی تصویر کشی اس طرح سے کی ہے کہ وہ قاری کے سامنے من وعن منکشف ہو جاتے ہیں۔ساتھ ہی واقعات وحادثات کی تصویر وہ اپنی تحریر میں اس طرح سے کھینچتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے واقعات وحادثات قاری کے سامنے رونما ہو رہے ہیں۔

جذبات نگاری:۔

ناول یا کردار کا تعلق جذبات سے ہوتا ہے، کیوں کہ ناول کی دنیا جذبات سے بھری ہوتی ہے۔کبھی کوئی واقعہ نشاط انگیز ہوتا ہے،کبھی الم ناک ہوتا ہے۔ناول نگار انھیں چیزوں پر اپنی جدت طبع صرف کرتا ہے۔کبھی کبھی ایسے واقعات ناول میں پیش کئے جاتے ہیں جو غم اور نشاط دونوں کی تصویر کھینچتے ہیں۔ناول کے واقعات وحادثات سے ناول نگار کے جذبات وخیالات بھی اجاگر ہوتے ہیں۔ناول نگار اپنے جذبات و احساسات سے ان مسائل وحادثات کو ناول میں جگہ دیتا ہے۔جس سے وہ زندگی میں دوچار ہوتا ہے۔

ناول نگار کو پلاٹ کی تشکیل میں کردار کے تعلق سے پہچان اس کے جذبات سے ہوتا ہے۔اس لیے کہ ناول کے کرداروں میں جو جذبات ہوتے ہیں اس میں حسن و عشق کا تصادم، محبت کی فراوانی، اس کے علاوہ مذہبی لگاؤ تاہم اس جذبے کی موافقت اور مخالفت میں کئی مزید جذبے ملتے ہیں۔اسی کے ذریعے کرداروں کے احساسات کا پتا چلتا ہے۔غصہ، ناراضگی، بے رحمی، چاہت، مخالفت، اختلاف اور نہ جانے کتنے ایسے جذبات ہیں جن کو موقع و محل کی مناسبت سے ناول میں مصنف پیش کرتا ہے اور یہ عمل ناول نگار کی فنی دلچسپی سے متعلق بھی ہوتا ہے۔ناول نگار میں جس قدر لطیف جذبوں اور جمالیاتی حسن کو محسوس کرنے کی صلاحیت ہوگی، اتنی ہی کامیابی کے ساتھ جذبات کی عکاسی کرے گا۔ڈاکٹر مجید بیدار لکھتے ہیں:

''ناول کے پلاٹ کی تشکیل کے موقع پر ''جذبات'' کے بیان کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے اور جس کے بغیر ناول میں تحریک پیدا نہیں ہوتی اس لیے ناول نگار کو جذبات کا سہارا لینا ضروری ہے۔'' 68

یعقوب یاور نے جگہ جگہ اپنے ناولوں میں کردار کے ذریعے ان کے جذبات کو پیش کیا ہے۔جس سے کردار کے رویے کا پتہ چلتا ہے۔ساتھ ہی ناول کے پلاٹ میں تسلسل اور ربط پیدا ہوتا ہے۔ناول نگار نے سنجیدگی کے ساتھ صحیح موقعوں پر کرداروں کے ذریعے ان کے جذبات کو پیش کیا ہے۔ناول ''دل من'' میں سرال کی عورت تارکی کے جذبات کو اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

''تارکی کا غصہ آسمان پر پہنچ چکا تھا۔سوچنے سمجھنے کی اس کی قوت سلب ہو چکی تھی۔غضب ناک ہوکر اس نے خنجر کو ایک نظر دیکھا اور اگلے ہی لمحے وہ خنجر ولی کے سینے میں پیوست ہو چکا تھا۔اور اس کی لاش اس کے سامنے ہی پڑی تھی۔تھوڑی دیر بعد تارکی نے اپنے غصے پر قابو پایا تو وِلّی کی لاش دیکھ گھبرا گئی اور رونے لگی۔'' 69

اس اقتباس میں تارکی وِلّی پر اتنی غضب ناک اس لیے ہوئی کہ وہ اس کے شوہر سرال کو اپنانا چاہ رہی تھی۔جس کی بنا پر اس کو اتنا غصہ آیا کہ وہ ولی کو موت کے گھاٹ اتار دی۔اس اقتباس میں غصہ، غم، گھبراہٹ، رونا، یہ سب جذبات موجود ہے۔ناول دل من کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو جس میں یعقوب یاور

نے دیوانئ کے محبوب سوریم کے جذبات کو لکھا ہے۔

''اس دن سوریم پھر اشانت تھا۔دیوانئ کے سامنے شادی کی تجویز وہ پہلے کئی بار رکھ چکا تھا۔لیکن ہر بار دیوانئ کسی نہ کسی بہانے اسے ٹال جاتی تھی۔اسے انتظار کرتے کرتے کئی برس ہو چکے تھے۔وہ اس انتظار سے اکتایا نہیں تھا۔لیکن اب اس کا یہ وشواس نراشا میں بدل رہا تھا۔کہ دیوانئ اس سے شادی کے لیے سنجیدہ ہے۔اس لیے اس نے طے کیا تھا کہ وہ دیوانئ سے صاف صاف ہاں یا نہیں میں جواب مانگے گا۔۔۔دیوانئ کہتی ہے میں آج تم کو اس کے بارے میں کھل کر بتاتی ہوں کہ تم میرے لیے وشوسنیہ ہو۔میں اپنے جیون کے بارے میں اس سمے تک کچھ نہیں سوچ سکتی ہوں جب تک دل من پالک سے اپنے گھور اپمان کا پرتی شودھ نہیں لے لوں گی۔'' 70

مندرجہ بالا اقتباس میں بے چینی، وشواس، بدلے کا جذبہ، مایوسی یہ سارے جذبات موجود ہیں۔جس کو یعقوب یاور نے مرکزی کردار دیوانئ اور ذیلی کردار سوریم کے ذریعے پیش کیا ہے۔یعقوب یاور نے دیوانئ کے اندر بدلے کے جذبے کو اتنی شدت سے رکھا ہے کہ وہ اپنے جذبہ عشق کو بھول جاتی ہے حالانکہ وہ اپنے عاشق شوریم سے پیار کرتی ہے۔ناول نگار نے دیوانئ میں بدلے کی آگ کو اس طرح تپایا ہے کہ اسے صرف بدلہ لینے کا جنون رہتا ہے۔اور اپنی جنسی استحصال کے سبب مردوں سے اسے نفرت بھی ہو جاتی ہے۔اور یہی نفرت دیوانئ کے جذبے میں کسی نہ کسی صورت میں موجود رہتا ہے۔ناول ''دل من'' میں دیوانئ اپنا بدلہ لینے کے بعد جس کیفیت اور حالت میں ہوتی ہے اس کے جذبات کو یعقوب یاور نے اس طرح لکھا ہے:

''دل من کی سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے دیوانئ نے جو مسرت محسوس کی اس کا بیان کیسے ممکن ہے کہ یہ اس کے خوابوں کا شہر تھا۔کوٹ پہنچ کر وہ اپنے بیٹے سے ملی تو اسکی پہلی خواہش یہ تھی کہ وہ اپنے گھر اور متھو کی سمادھی پر جانا چاہتی ہے۔تا کہ اس کی آتما کی شانتی کے لیے دیوتاؤں سے دعا کر سکے۔بھلا سرال کو اس میں کیا اعتراض ہو سکتا

تھا۔اس نے داسوں کوحکم دے کر ساری تیاری کروادی۔'' 71

اس اقتباس میں یعقوب یاور نے دیوانئ کے اس جذبے کو پیش کیا ہے جس کو وہ کئی سال اپنے اندر رکھی ہوئی تھی۔وہ بدلے کا جذبہ تھا۔جب اس کے بیٹے سرال نے اپنے باپ کشال اور اپنی ماں کے گنہگار کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔تب دیوانئ خوشی خوشی دل من شہر میں جاتی ہے۔اس اقتباس میں خوشی، انتظار، وشواس یہ سارے جذبات موجود ہیں۔ناول ''دل من'' میں دیوانئ کے غصے اور خوف کو ناول نگار نے اس طرح بیان کیا ہے۔کہ جس سے دیوانئ کے جذبات اجاگر ہوتے ہے۔ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''دیوانئ غصے اور خوف کی ملی جلی کیفیات کے ساتھ دل من کے اس مضبوط چوبی پھاٹک کو دیکھ رہی تھی۔جو اس شہر کے باہر نکالے جانے کے بعد بند ہو رہا تھا۔جس جرم پر اسے یہ سزا دی گئی تھی۔اس پر وہ اب بھی شرمندہ نہیں تھی۔وہ خوش تھی کہ اس نے کم از کم ایک انسان نما درندے کے بوجھ سے اس زمین کو نجات دلا دی ہے۔'' 72

یعقوب یاور نے دیوانئ کی جذبات کو اس طرح سے پیش کیا ہے کہ جب دیوانئ کو دل من شہر سے باہر نکال دیا گیا تھا تو اس کے اندر جو جذبات پیدا ہوئے تھے اس میں غم تھا،غصہ تھا،ڈر تھا،اطمینان تھا ساتھ ہی جس قتل کے جرم میں اس کو شہر دل من سے باہر پھینکا جاتا ہے اس پر وہ شرمندہ نہ تھی اس قتل سے اس کو اطمینان تھا کہ اس نے ایک برے آدمی کا خاتمہ کر دیا تھا۔اسی طرح ناول عزازیل میں یعقوب یاور نے کرداروں کے جذبات کو پیش کیا ہے۔ناول عزازیل کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''میں جانتی ہوں عزازیل لیکن تمہارے یہ تیور تمہاری نامرادی سے زیادہ تمہاری رقابت کی جانب اشارہ کر رہے ہیں۔یہ تمہارے جیسے معزز شخص کے لیے نامناسب بھی ہے اور ضرر رساں بھی۔رامن کی قسم ، میں تمہاری ہمدرد ہوں دشمن نہیں۔لیکن شاطون اعظم سے جنگ میں میں تمہاری مدد نہیں کر سکوں گی۔البتہ اس سے تمہاری جان کو خطرہ ہو اور میں نے سنایا تم نے مجھے مدد کے لیے پکارا تو میں ضرور آؤں گی۔عزازیل، ہماری رقابت اتنی کمزور نہیں ہے کہ اسے شاطون اعظم جیسے لوگ توڑ سکیں۔'' 73

مندرجہ بالا اقتباس میں تلبانیخ جو ابلیس کی معشوقہ ہے اس کے جذبات کو ناول نگار نے پیش کیا ہے۔اس طرح ناول عزازیل کے دوسرے کرداروں کے جذبات کو ناول میں بڑی چابک دستی سے بیان کیا گیا ہے۔اس تعلق سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''عناصر کا عریاں رقص دیکھ کر خود شاطون بھی لرز گیا تھا۔قوت کل مدعی ہونے کے باوجود جو کچھ ہو رہا تھا اسے روک پانا اس کے حدود اور اختیار سے باہر تھا۔اسے اس کی توقع تو تھی لیکن یہ امید نہ تھی کہ یہ ہنگامہ آخر اس کے دور اقتدار میں ہی آجائیگا۔وہ اسے ایک عام طوفان کہہ کر اپنے آپ کو سمجھانے اور مطمئن رکھنے کی کوشش ضرور کر رہا تھا۔لیکن دل کے کسی گوشے میں اسے یقین تھا کہ بس اب اس کا یہ سارا کارخانہ اقتدار ختم ہونے والا ہے۔'' 74

مندرجہ بالا اقتباس میں شاطون اعظم جو اردبان کا حاکم ہے۔جب وہ اردبان کو تباہ ہوتے دیکھتا ہے تو اس کے جذبات کو مندرجہ بالا سطروں میں پیش کیا گیا ہے۔جس میں خوف، اطمینان، مایوسی، وغیرہ موجود ہے۔ناول عزازیل کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

''عزازیل ہمارا رہبر اور معلم ہے۔اس سے محبت ہم پر فرض ہے۔''

''کیا تم اس سے غداری اور نافرمانی کے مرتکب ہو سکتے ہو۔''

''ایسا ممکن نہیں ہے۔''

''کیا اس کے کہنے پر تم کچھ بھی کر سکتے ہو۔''

''یقیناً''

''عزازیل ان جوابات سے خوش تھا۔اس نے ایک قدم اور بڑھاتے ہوئے پوچھا۔اگر ایک طرف خدا ہو اور دوسری طرف تمہارہ معلم عزازیل تو تم کس کی طرف ہوگے۔؟'' 75

اس میں فرشتوں کے جواب سے عزازیل بہت خوش تھا اور اس خوشی میں اس کے اندر اس طرح کے جذبات پیدا ہو گئے تھے کہ وہ خود کو خدا سے موازنہ کرنے میں لگ گیا۔اس میں عزازیل کے اس جذبات

کو پیش کیا گیا ہے جس میں خوشی ہے ۔ناول جہاد میں بھی جذبات نگاری کو اچھے پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔جس میں ہندو مسلم کے تصادماتی جذبات کو مصنف نے بڑی ہنرمندی سے ناول کا حصہ بنایا ہے۔جس کے ذریعے ناول کے واقعات میں تاثیر پیدا ہوئی ہے۔اس ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں کرداروں کے جذبات کو دکھایا گیا ہے:

''اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے جابروں اور ظالموں کو سزا دینے کے اس کے اپنے طریقے ہیں وہ ہنروران کو سنے گا یہ حافظ عبدالرحمٰن نے کہا۔''
''اب جو کچھ کرے کا ہے وا کھدا کا نہیں ہمن کا کرے کا ہوئی۔''نمازیوں میں سے ایک نوجوان مسعود خاں کی ایک آواز ابھری اس کا مشتعل چہرہ مغربی افق پر حد نظر تک بسیط سرخی سے مماثل تھا جس سے اس کے دل کے اندر موج زن طوفان کا تھوڑا بہت اندازہ ہو رہا تھا۔''ہم کا ھی ای کا پھرن کا سبک سکھائے کا ہوئی۔'' 76؎

گجرات میں جب مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا تب ناول جہاد کے مرکزی کردار مسعود خاں کے جو جذبات تھے اس کو اس اقتباس میں پیش کیا گیا ہے۔اسی طرح سے ناول میں اس ماحول میں ہندوؤں کے جو رویے اور جذبات تھے اس کو یعقوب یاور نے اس طرح سے لکھا ہے:

''پنڈت جی نے ایک اچٹتی ہوئی نظر تمام سامعین پر ڈالی۔۔۔۔''یہ مسلمان جن کے دھرم گرنتھ ہی میں لکھا ہے کہ جب تک سب ہندو مسلمان نہ بن جائیں۔ان کو مارتے کاٹتے رہو،کیسے ہمارے ساتھ امن چین سے رہ سکتے ہیں۔انھیں جب جب اوسر ملے گا،یہ ہمارے لیے سمسیا کھڑی کرتے رہیں گے۔اس کا سمادھان کیول یہی ہوسکتا ہے کہ ہم ان سے صدیوں بھے بھیت رہتے ہوئے ان سے دب کر رہیں تو اب ہندو اس کے لیے بالکل تیار نہیں ہے ہمیں ان سے مکتی چاہئے اور اس کے لیے ہمیں ساہس کر کے ایک بار آر پار کی لڑائی لڑنی ہوگی۔اب چاہے یہ بات کسی کو بھلی لگے یا بری۔''
''آنند نرائن جی،آپ بھی تو کچھ اپنے وچار ویکت کیجیئے۔''
ٹھاکر رن ویر سنگھ نے انھیں خاموش بیٹھے دیکھ کر کہا''مجھے تو لگ رہا ہے ٹھاکر

صاحب، کہ میں یہاں پر بالکل ان فٹ ہوں۔'' آنند نارائن سری واستو جی نے جو
ہائی کوٹ کے وکیل تھے اور ٹھاکر صاحب کے مہمان کی حیثیت سے ان ہی کے کسی کام
کے الہ آباد سے یہاں آئے تھے۔۔۔۔''یہاں چرچا جس اور جا رہی ہے وہ میرے
وچاروں سے میل نہیں کھاتی۔اس لیے یہاں کچھ کہہ کر میں اپنی بے عزتی نہیں کرانا
چاہتا۔''77؎

اس طرح یعقوب یاور نے اپنے ناولوں میں کرداروں کے جذبات (غم،غصہ،خوشی) کو اپنی فنی صلاحیت سے اجاگر کیا ہے جس سے ناول کے ختم ہونے کے بعد قاری پر گہرا اثر ہوتا ہے۔

اسلوب وزبان وبیان:۔

ناول کی تعمیر وتشکیل میں پلاٹ اور کردار کے ساتھ زبان و بیان اور اسلوب کی اہمیت ہوتی ہے۔ کیوں کہ زبان ہی ترسیل کا اہم وسیلہ ہے۔کوئی بھی فن پارہ جب وجود میں آتا ہے تو اس کا مقصد قاری تک رسائی ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ قاری اور فن پارے کے مابین ترسیل کا مرحلہ بخوبی حل ہو۔ترسیل کی کامیابی کی پہلی شرط یہ ہے کہ زبان رواں،صاف، برجستہ ہو۔زبان و بیان اور مکالمہ نگاری کو کچھ لوگ ایک ہی مانتے ہیں لیکن یہ قدر مختلف ہے۔مکالمہ نگاری میں صرف کرداروں کی زبان کو دیکھا جاتا ہے۔اور زبان و بیان میں کردار کے ساتھ ناول نگار کی زبان کو بھی دیکھا جاتا ہے۔یعقوب یاور کے مکالمہ نگاری کا ذکر مذکورہ بالا صفحوں میں کردیا گیا ہے۔رہی بات زبان و بیان کی تو یعقوب یاور نے ناول کو بیان کرنے کے لیے جس اسلوب کا استعمال کیا ہے وہ بیانیہ ہے۔مصنف کی زبان ناول کے پلاٹ کے مطابق ہے۔سیدھی سادی اور عام زبان ہے۔ناول نگار نے بیانیہ میں جو زبان استعمال کیا ہے وہ سہل اور رواں ہے۔ناول دل من اور عزازیل پڑھتے ہوئے ہمیں تاریخ اور ناول دونوں کا شعور رکھنا ہوتا ہے۔بیانیہ کی تین سطحیں ان کے ناولوں میں نظر آتی ہیں۔راوی کا بیانیہ، کردار کا بیانیہ، اور خود کلامی۔ان تینوں کو ناول نگار نے اپنے ناولوں میں یکجا کیا ہے۔کردار اور راوی کو ایک دوسرے میں ضم کیا ہے۔ناول میں تکنیک اور موضوع کے افتراق کا پتا نہیں چلتا ہے۔مجموعی اعتبار سے یعقوب یاور کے تینوں ناول فن کے اعتبار سے بیانیہ انداز میں لکھے گئے بہترین ناول

ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ تینوں کی الگ الگ اہمیت ہے یہ تینوں ناول اردو ناول نگاری میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دل من اور عزازیل اس طرح کے موضوع پر ابھی تک کوئی ناول نہیں لکھے گئے ہیں۔ اس بنا پر بھی یہ اہمیت کے حامل ہیں کہ اردو ناول نگاری میں اس موضوع کی جو کمی تھی اس کو یعقوب یاور نے پورا کیا ہے۔

ناول کے موضوع، واقعات اور مقصد حیات وغیرہ کو ناول نگار قاری کے سامنے کس طرح پیش کرتا ہے اس کی پیش کش کا انداز کیا ہے یہ سب اسلوب و بیان میں آتا ہے۔ اسلوب ایک طرح سے طریقہ بیان ہے کسی بات کو کہنے کے طریقے ہر آدمی کے مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی چھوٹی سی بات کو تفصیل سے بیان کرتا ہے اور کوئی بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے۔ ایک ہی موضوع پر کئی ادیب قلم اٹھاتے ہیں لیکن پیش کش کے اعتبار سے سب ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں۔ ان کا اسلوب ہی ان کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے۔ اسلوب میں طریقے تحریر زبان و بیان، انتخاب الفاظ کے ساتھ ترتیب کو اہمیت حاصل ہے۔ زبان دراصل وہ بنیادی قوت ہے جس پر واقعہ نگاری، مکالمہ نگاری، کردار نگاری، سب کا دارومدار ہے۔ صاف و سادہ اور طاقتور زبان ان سب اجزاء کو خوبصورتی سے مزین کرتی ہے۔ ڈاکٹر سنبل نگار لکھتی ہیں:

> ''فکشن کی زبان کے بارے میں اکثر مغربی نقاد کی رائے یہ ہے کہ اس میں بناو سنگار نہیں ہونا چاہیے ورنہ قاری کی توجہ اصل موضوع یعنی کہانی یا واقعات سے بھٹک کر زبان کی آرائش میں الجھ جائے گی۔'' 78

ناول کی زبان آئینے کی مانند نہیں بلکہ کھڑکی میں لگے شیشے کے مانند ہونا چاہیے۔ جس سے آر پار دکھائی دے۔ ناول کی زبان کردار کے مطابق ہونی چاہیے۔ کردار جن طبقات سے منتخب کئے جائیں ان طبقات میں بولی اور سمجھے جانے والی زبان کا استعمال کرنا چاہیے۔ اگر ناول نگار کردار کو فراموش کر کے معیاری زبان کو ملحوظ خاطر رکھے گا تو کرداروں کی صحیح شکل اور اصلی صورت سامنے نہیں آئے گی۔ ناول کی زبان کا عام نقائص سے پاک ہونا اشد ضروری ہے۔ لیکن اس سے ضروری یہ ہے کہ کردار کی مناسبت سے زبان کا استعمال کیا جائے۔ یعقوب یاور نے اپنے ناولوں میں کردار کی مناسبت ہی سے زبان کا انتخاب کیا ہے۔ ناول دل من کے کردار کا تعلق سندھو گھاٹی سے ہے۔ جس کا زمانہ موہن جودڑو اور ہڑپا کا ہے۔ اس ناول میں کرداروں

کے ذریعے سے جو زبان عمل میں لائی گئی ہے وہ ہندی اور سنسکرت آمیز ہے۔ یہ زبان ان کرداروں کی مناسبت سے ہے۔مندرجہ ذیل اقتباس میں یہ چیز دیکھ سکتے ہیں۔

> ''مہرشی کو اس پر ترس آ گیا وہ بولے'' پتر تیری بھگنی دیوانئ جیوت ہے'' ابھی ان کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ متھو کھڑا ہو کر ناچنے لگا۔اب وہ بس ایک ہی بات رٹے جارہا تھا۔دیوانئ جیوت ہے دیوانئ جیوت ہے اب میں کشال کا ودھ کروں گا۔اب میں کشال کا ودھ کروں گا۔مہرشی یہ دیکھ کر گھبرا گئے انھیں اب احساس ہوا کہ ایک پاگل کو راز کی بات بتا کر انھوں نے کتنی بڑی غلطی کی لیکن اب وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔راز تو ان کی زبان سے نکل چکا تھا۔اس کے بعد انھوں نے شہر میں جلدی جلدی اپنا کام ختم کیا تھا اور وقت سے کچھ پہلے ہی آشرم میں واپس آ گئے تھے۔'' 79

جب دیوانئ کا بھائی جو اس کا منگیتر ہے اس کو پتا چلتا ہے کہ دیوانئ راجا کشال کے چنگل سے بچ نکلی ہے اور وہ زندہ ہے۔تو ناول نگار نے اس کردار کے ذریعے ہندی اور سنسکرت آمیز زبان کا استعمال کیا ہے۔ جو اس کردار اور تہذیب کی مناسبت سے ہے۔جس میں ودھ کرنا، جیوت رہنا وغیرہ ہندی اور سنسکرت زدہ الفاظ ہیں۔اسی طرح ناول دل من کا دوسرا اقتباس ملاحظہ ہو جس میں ہندی کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں:

> ''سوریم مجھے اس میں کوئی سنکا نہیں ہے کہ میں تم سے پریم کرنے لگی ہوں۔اور اب تمہارے بنا جیون ادھورا سا لگتا ہے۔ پرنتو میری اپنی کچھ ووستائے ہیں۔میں آج تم کو اس کے بارے میں کھل کر بتاتی ہوں۔کیوں کہ تم میرے لیے وشوسنیہ ہو۔میں اپنے جیون کے بارے میں اس سمے تک نہیں سوچ سکتی ہوں جب دل من پالک سے اپنے گھور اپمان کا پرتیشودھ نہیں لے لوں گی۔اس کا ارتھ یہ ہوا کہ یدی تم کشال سے پرتیشودھ میں سپھل نہیں ہوئی تو یہ وواہ نہیں ہوگا۔''ہاں'' اور کشال سے پرتیشودھ کے لیے کوئی سمے سیما نردھارت نہیں ہے۔'' 80

دیوانئ اور اس کے محبوب کے مکالمے میں ناول کی زبان کو جانا جا سکتا ہے۔ جو ہندی اور سنسکرت

آمیز ہے۔ یہ زبان دونوں کرداروں کی مناسبت سے استعمال کیا گیا ہے۔ کیوں کہ اس ناول کے موضوع کے اعتبار سے ایسے ہی زبان مناسب تھی۔ تاکہ پرانی تہذیب و ثقافت کی تصویر ناول میں برقرار رہے۔ ناول میں کرداروں کے مکالمے کے لیے جو زبان مستعمل ہے وہ اکثر جگہوں پر ہندی اور سنسکرت آمیز ہے۔ لیکن ناول نگار کا بیانیہ خالص اردو اور عام بول چال کی زبان ہے جس کو انھوں نے ناول میں استعمال کیا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو جس میں یعقوب یاور کا بیانیہ انداز موجود ہے:

> ''دونوں ایک چٹان پر بیٹھ گئے کیتی نے سرال کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سہلانا شروع کر دیا۔ اور صرف اس عمل سے ہی سرال لذت کے سمندر میں غوطے لگانے لگا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیتی نہ صرف یہ کہ اس کے خوابوں کی ملکہ ہے بلکہ شاید ان کی یہ محبت کشال کو ختم کرنے کے منصوبے میں معاونت بھی کرے۔ اسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ اپنے باپ کے قتل کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ اس نے اس طرف بھی دھیان نہیں دیا تھا کہ کیتی کی شکل خود اس سے کتنی ملتی جلتی ہے۔'' 81

اس میں یعقوب یاور نے جو زبان استعمال کی ہے۔ وہ سہل اور عام فہم ہے۔ اس میں نہ تو ہندی ہیں اور نہ ہی سنسکرت آمیز الفاظ۔ کیوں کہ یہ ناول نگار کا بیانیہ ہے۔ اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ناول نگار نے صرف کرداروں کی مناسبت سے ہی ناول میں ہندی اور سنسکرت آمیز الفاظ کا استعمال کیا ہے۔

زبان و بیان کے اعتبار سے ناول عزازیل فوقیت کا حامل ہے۔ کیوں کہ اس میں ناول نگار نے سادہ سلیس، سہل، عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے۔ اور یہ زبان کرداروں کی مناسبت سے بھی ہے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''شکریہ عزازیل مجھے تمہارا وجود اور تمہاری زندگی عزیز ہے۔'' عزازیل کو اب اجازت دو کیوں کہ وقت کم ہے اور اسے ابھی بہت سے ضروری کام کرنے ہیں۔''
> ''یاد رکھو عزازیل کہ تم متواتر دوسری بار مجھے تشنہ چھوڑ کر جا رہے ہو۔'' عزازیل آگے بڑھا اور تلبانیخ کو اپنی آغوش میں لے کر اس کا طویل بوسہ لیا تلبانیخ کی آنکھیں رنگ بدلنے لگیں اس کا مطلب تھا کہ اگر وہ فوراً علاحدہ نہ ہوا تو تلبانیخ آسانی سے اسے

جانے نہیں دے گی۔لیکن شایداس کے لیے پہلے ہی دیر ہو چکی تھی۔اب تلبانیخ کسی صورت اسے چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی۔بالآخر عزازیل نے بھی کچھ وقت یہاں گزارنے کا ارادہ کرلیا۔'' 82

مندرجہ بالا اقتباس میں یعقوب یاور کا بیانیہ کرداروں کا مکالمہ دونوں چست درست اور سادہ و سلیس ہے۔جس کو پڑھنے میں کسی طرح کی کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی ہے۔ ناول عزازیل کا دوسرا اقتباس ملاحظہ ہو:

''عزازیل موحد ہے۔ اس نے ازل سے آج تک صرف معبود برحق کو سجدہ کیا ہے۔حکم خداوندی کے باوجود وہ غیر از خدا کسی اور کو سجدہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔''

''عزازیل تمہاری اس گستاخی کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔اگر تم فوراً آدم کو سجدہ کرو۔''

''پھر کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ عزازیل کو آدم کے مساوی درجہ اور اس کی خدمت سے استثنیٰ کی سند عطا کی جائے۔''

''عزازیل تمھیں تنبیہ کی جاتی ہے کہ تم قہر خداوندی کی دعوت دے رہے ہو اور منشائے خاوندی کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہو۔ایسا نہ ہو کہ تمھیں عزازیل کے مرتبے سے گرا کر ابلیس قرار دیا جائے۔'' 83

اس میں عزازیل اور اللہ کے مکالمے کو پیش کیا گیا ہے جس میں دلکشی اور سادگی ہے۔اس طرح ناول عزازیل کا زبان و بیان سادہ اور سلیس کے ساتھ دلچسپ بھی ہے۔اس میں ایسی زبان کرداروں کے مکالمے اور بیانیہ کے طور پر لکھا گیا ہے جس میں عمدگی اور جامعیت ہے۔مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

''عزازیل محترم'' ایک طالب علم فرشتے ہاروت نے عزازیل کو مخاطب کرتے ہوئے فرمائش کی۔''فرشتوں کی اکثریت جبر و قدر کے بارے میں آپ کے خیالات سے استفادہ چاہتی ہے کہ یہ مسئلہ اکثر انھیں الجھن میں ڈالتا رہتا ہے۔''

''اے مخلوقات معصوم'' عزازیل نے انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔'' اس مسئلے پر

اظہار خیال سے پہلے یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فرد کا احتساب اس کے اختیارات کی بنیاد پر ہوگا۔ جبر وقدر کے تحت سرزد ہونے والے اعمال کے لیے فرد پر ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔'' یہ کہہ کر عزازیل نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔''میں جانتا ہوں کہ تمہاری اصل الجھن کیا ہے۔تم نے سنا ہے کہ ہر شے کی ایک تقدیر ہوتی ہے۔اور تقدیر جبر ہے۔اشیاء کی طرح افراد بھی اس جبر سے آزاد نہیں ہیں۔تو پھر وہ خود اپنے اعمال کے ذمہ دار کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ غلط فہمی اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ ہم اس مسئلے کو غلط زاویے سے دیکھتے ہیں۔ جبر وقدر کے تعلق سے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ تقدیر عناصر کے اجزا سے تعلق رکھتی ہے ان کے مرکبات سے نہیں۔ کب کون عنصر کسی دوسرے عنصر سے ملے گا یہ اختیار ہوسکتا ہے لیکن دو مخصوص عناصر کے میل کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا یہ قدر ہے۔ چنانچہ ہر شے کی تقدیر کو اس کے اجزاء کی بنیاد پر دیکھنا چاہیے۔ایسا کرنے پر اختیار کے رموز منکشف ہوتے ہیں۔اور اس انکشاف کے بعد یہ مسئلہ نہیں اٹھتا کہ تقدیر کے جبر کے باوجود افراد کا احتساب کس بنیاد پر ہوگا۔تقدیر کے اجزاء کو مرکبات میں بدلنا فرد کا اختیار ہے اور اسے بہر حال اس اختیار کے لیے جواب دہ ہونا چاہیے۔''

''لیکن عناصر کے اجزاء کے مقدر کے بارے میں کیسے جانا جائے۔'' ماورت نے پوچھا۔

''اس بات کا علم ناممکن تو نہیں لیکن خطرناک ضرور ہے۔اس کا اصل مقام حدود یزدانی میں ہے۔اس لیے اس کا تجسس گمراہی کا سبب بن سکتا ہے۔''

عزازیل نے فرشتوں کو متنبہ کیا اور وہ خوف وخداوندی سے لرزنے لگے۔'' 84

ناول ''جہاد'' میں یعقوب یاور کی جو طرز تحریر ہے وہ دو طرح کی ہے ایک ان کا بیانیہ دوسرا کرداروں کا مکالمہ اسی اسلوب میں پورا ناول لکھا گیا ہے۔ کرداروں کی مناسبت سے مکالموں کا انتخاب کیا گیا ہے جس میں اردو زبان کے ساتھ علاقائی بولی شامل ہے۔ یعقوب یاور کے بیانیہ میں صاف ستھری خالص اردو زبان

مستعمل ہے۔مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

''آج جامعہ مسجد کے باہر جو کچھ ہو رہا تھا وہ بھی ان کے اس خوف اور بے یقینی کے رویہ کا روایتی مظاہرہ تھا۔ گجرات کے حالیہ مسلم کش فساد کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی خبریں دوسرے تمام لوگوں کی طرح یہاں کے لوگوں نے بھی ریڈیو پر سنی تھی۔مسعود خاں کا ترش لہجہ اس کا فطری ردعمل تھا۔''

''بیٹے اس طرح کے مسائل جوش، ہوش، دور اندیشی اور ذہانت سے حل کیے جاتے ہیں۔حافظ عبدالصمد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔''

''ی دور اندیسی اپنے پاس رکھو مولا نا ی مسئلہ آیسے حل ہونے والا نہیں نا کا پھرن کی ہمت کی ہمرے دیسوا ماں ہم کا چین سے نہ رہے دینھیں اب ان کا ی بتاوئے کا وکھت آ گا ہے۔کہ ہم بجدل اور نامرد نہیں نائی بتاوت بہت جروری ہوئی گا ہے کہ ہم ھو ہمت اور طاقت کا استعمال کرب جانت ہن۔مسود خاں آج خلاف معمول غصے میں بری طرح کھول رہا تھا۔'' 85

اس اقتباس میں تین طرح کی زبان مستعمل ہے۔ایک تو ناول نگار کا بیانیہ دوسرا امام عبدالصمد کی زبان جو اس ناول کا ضمنی کردار ہے اور تیسرے مسود خاں کی زبان۔یعقوب یاور نے حافظ عبدالصمد سے وہ زبان ادا کروائے ہیں جو ان کے عین مطابق ہے۔کیوں کہ یہ کردار پڑھا لکھا مسجد کا امام وخطیب ہے۔مسود خاں کی زبان بھوج پوری اور اودھی سے مشترک ہے، کیوں کہ یہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہے۔یہ گاؤں کا یتیم لڑکا ہے۔اس طرح کی زبان ناول جہاد میں کرداروں کی مناسبت سے ہے۔مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

''ضرغام اس کے سلام پر مسکرایا۔عبدالرحمٰن اسے چڑھانے کے لیے ہمیشہ اسلام علیکم کہتا تھا۔اس نے سن رکھا تھا کہ شیعہ حضرات سنیوں کے سلام کا واضح جواب دینا پسند نہیں کرتے۔لیکن ان دونوں کی دوستی ان کے رسمی اور روایتی قیود سے آزاد تھی ضرغام حیدر نے اسی طرح مسکراتے ہوئے اسے جواب دیا السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ ویری گڈ یعنی تقیہ شروع۔وہ مسکراتے ہوئے بولا۔مگر یہ آج یہاں کے ماحول پر محرم کیوں

طاری ہے میرے بھائی کتنی بار کہا ہے تم سے کہ باقی مہینوں میں باہر نکلتے وقت اپنا محرم اپنے گھر پر ہی رکھ کر آیا کرو لیکن میری کوئی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔عبدالرحمٰن کی چھیڑ جاری تھی۔ابھی وہ کافی ہاؤس کے پرسکوت ماحول سے خود کو ہم آہنگ نہیں کر پایا تھا۔اس کی آواز اتنی اونچی تو نہیں تھی لیکن پھر بھی ہر شخص اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔جی نارمل پلیز کچھ تو رحم کرو انسانیت پر میرے بھائی۔'' 86

مندرجہ بالا اقتباس میں ضرغام اور عبدالرحمٰن دونوں یونیورسٹی کے طالب علم اور دوست ہیں۔اس لیے ان کے مناسبت سے ایسی زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔جس میں انگریزی الفاظ کے ساتھ سلیس اردو زبان ہے۔یعقوب یاور کے یہ تینوں ناول مختلف موضوع پر لکھے گئے ہیں۔اس لیے انھوں نے الگ الگ اسلوب کو اختیار کیا ہے۔ادب میں اسلوب کی وہی اہمیت ہے جو انسانی جسم کے لیے روح کی ہے۔اسلوب کے سلسلے میں ایک بنیادی عنصر موضوع ہوتا ہے۔یہ ممکن نہیں کہ ہر موضوع ایک اسلوب میں لکھا جائے۔مصنف کے ذہن میں موضوع کی مطابقت سے اسلوب بھی ہوتا ہے۔یعقوب یاور کے ناولوں میں جو اسلوب ہے وہ موضوع سے میل کھاتا ہے اور وہ دلکش و فرحت بخش ہے۔

تکنیک:

ناول کچھ فنی اسلوب پر مبنی ہوتا ہے۔ہر ناول نگار قصے کو بیان کرنے اور کردار کے ظاہر کرنے میں خاص تکنیک سے کام لیتا ہے۔ہر ناول نگار واقعات و حادثات کو بیان کرنے میں اپنا الگ طریقہ اختیار کرتا ہے۔ساتھ ہی ناول کی پیش کش کے لیے الگ الگ تکنیک کا سہارا لیتا ہے۔یعقوب یاور نے اپنے ناولوں میں جس تکنیک کا استعمال کیا وہ بیانیہ ہے۔

بیانیہ جسے انگریزی میں narration کہا جاتا ہے۔یعنی تحریر کو مناسب الفاظ بہترین جملوں اور فقروں میں ترتیب دے کر واقعات و حادثات کو بیان کیا جاتا ہے۔بیانیہ کی تعریف ممتاز شیریں نے اس طرح کی ہے:

''بیانیہ صحیح معنوں میں کئی واقعات کی ایک داستان ہے جو یکے بعد دیگرے علی الترتیب

بیان ہوتے ہیں۔ بیانیہ بقول عسکری کہانیاں بھی کہہ سکتے ہیں۔'' 87

یعقوب یاور کے بیانیہ میں کہانی پن کے ساتھ ہی ترسیل قائم و دائم ہے ناول عزازیل کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جو بیانیہ انداز میں ہے۔ جس میں واقعہ کو علی الترتیب بیان کیا گیا ہے۔

''عناصر کا یہ کھیل اور ہنگام آخری کا یہ سلسلہ محض شہروں تک محدود نہ تھا۔ سارا سیارہ ہی اس کی گرفت میں تھا۔ دیو قد درندے ویرانوں سے بستی میں آ کر تباہی مچا رہے تھے۔ جن خورد درختوں کی بن آئی تھی اور وہ اپنی جگہ سے حرکت کرنے لگے تھے۔ یہاں کے آتش فشاں سرد ہو گئے تھے۔ زندگی بخش حرارت کی جگہ مہلک ٹھنڈک نے لے لی تھی آتش زادوں کی زندگی اب ممکن نہ رہ گئی تھی۔ ندیاں اپنے خوش گوار گرم پانی کے چشموں سمیت یا تو خشک ہو رہی تھی یا تو وہ برف بنتی جا رہی تھی۔ پہاڑ خود انتشار عناصر کی زد میں تھے اور ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں بکھر رہے تھے۔ سطح زمیں اعصابی تناؤ میں مبتلا مریض کی طرح بار بار اکڑ رہی تھی۔ اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ ہر طرف لوگوں کی بھاگ دوڑ جاری تھی۔ سب اپنے اپنے لیے جائے پناہ کی تلاش میں تھے۔ محبت کا جذبہ اٹھ گیا تھا۔ کسی کو کسی کی فکر نہ تھی۔ نفسی نفسی کا عالم تھا۔ رشتے ختم ہو چکے تھے۔ سب اپنے لیے پریشان تھے۔ لیکن اب کسی کو اپنے لیے بھی جائے پناہ تلاش کرنا ممکن نہ رہ گیا تھا اور رفتہ رفتہ سب لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو رہے تھے۔ یہ سب کیوں ہو رہا ہے، یہ سب جانتے تھے۔ انھیں آج ابوالجن حضرت طارہ نوث کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی جسے وہ عرصہ ہوا پس پشت ڈال چکے تھے۔ ابوالجن نے فرمایا تھا کہ جب زمین پر ابوالعجائب خدائے کائنات کا ذکر مفقود ہو جائے گا، جب خیر وشر کا توازن بگڑ جائے گا اور شر خیر پر غالب آ جائے گا، جب جن خود دوسرے جن کی جان کا درپے ہوگا، جب محبت، ہمدردی، خلوص، نیک نیتی اپنے مفاہم بدل کر محض ڈھونگ رہ جائیں گے، جب قوم جن آئین فطرت کو ترک کر کے قوانین اختراعی کی پیروی کرنے لگے گی، جب ہر شخص متضاد مزاج کا مالک ہوگا، اور فطرت سے رشتہ توڑ لینا باعث افتخار ٹھہرے گا، جب جن کی شناخت اس کی فطرت کی بنیاد پر نہیں اس کے

کارناموں کی بنیاد پر ہوگی، جب آتش فشاں سرد اور دریا خشک ہونے لگیں گے، تو سمجھ لینا کہ فنا کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ اور جب یہ دنیا ختم ہوگی تو ایک دائمی زندگی کا آغاز ہوگا۔ اس دائمی زندگی میں فرد کے آرام و آلام کا یقین اس کے سابقہ اعمال کی بنیاد پر ہوگا۔'' 88؎

مندرجہ بالا اقتباس میں یعقوب یاور نے ایک واقعے کو دوسرے واقعے سے اس طرح جوڑا ہے کہ اس میں کہانی پن ہے اور قاری کا تجسس باقی رہتا ہے کہ اب کیا ہوگا کہ اب کیا ہوگا۔ اس طرح ناول دل من میں بھی انھوں نے بیانیہ تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو جس میں کہانی پن کے ساتھ بیانیہ عنصر موجود ہے:

''تاریکی رفتہ رفتہ بڑھ رہی تھی۔ اس کے ایک طرف دل من کی حفاظتی دیوار تھی اور دوسری طرف دریائے سندھ، جس کا پانی برسات کے موسم میں سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ کہیں دور سے آتی ہوئی گیدڑوں کی اور شیر کی ملی جلی خوف ناک آوازیں سندھ کی لہروں کے شور میں گڈمڈ ہو رہی تھی۔ یہ آوازیں کسی بھی شخص کے ہوش و حواس چھین سکتی تھی مگر یہ عورت کمزور اعصاب کی نہیں تھی۔ اپنی نصف صد سالہ زندگی میں اس نے بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کیا تھا اور کبھی ہمت نہیں ہاری تھی۔ اس بھیانک موت کا اثر اس پر نہیں تھا لیکن وہ تین دن سے بھوکی تھی۔ بندی گھر کی گھٹن اور تاریکی نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اسے بخار بھی تھا اور رات کی پرتوں کے دبیز ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے وجود پر غنودگی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے پر قابو پانے اور خود کو بے ہوشی سے بچانے کی پوری کوشش کر رہی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کی یہ کوشش شاید زیادہ دیر تک کام نہ آسکے گی۔ گذشتہ چند دنوں کے دوران پیش آنے والے واقعات نے اس کے آہنی حوصلوں پر قاری ضرب لگائی تھی۔ وہ مایوس تھی۔ امید کی کوئی کرن اس تاریکی کا سینہ چاک کر کے اس کی مدد کو نہیں آ رہی تھی۔ آج کا دکھ اس کے لیے ناقابل برداشت تھا کیوں کہ آج اس کے عمل کا ذمہ دار یہ زمانہ نہیں اس کا اپنا بیٹا

تھا۔ وہی بیٹا جسے اس نے نہایت نامساعد حالات میں جنم دیا تھا۔ دشمنوں کی نظروں سے بچا کر اس کی پرورش کی تھی۔ اس وقت اگر کسی مرحلے پر بھی وہ چوک جاتی تو یہی دنیا والے، جن کے مشوروں سے آج اسے یہ سزا دی گئی ہے اسے زندہ نہیں رہنے دیتے۔'' 89؎

مندرجہ بالا سطروں میں اس واقعہ کو بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے۔ جس میں دیوانئ کو یہ سوچ کر بہت دکھ ہوتا ہے کہ یہی وہ بیٹا ہے جس کو میں نے بہت ہی تکالیف سے پالا پوسا تھا۔ لیکن آج اسی کی وجہ سے پھر قیامت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اسی طرح ناول جہاد میں بھی یعقوب یاور نے بیانیہ تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو جس میں بیانیہ طریقہ اپنایا گیا ہے:

''کانپور سنٹرل ریلوے سے لگے کلکٹر گنج سے چمن گنج کی سمت جانے والی سڑک پر ایک نوجوان پیدل چلا جارہا تھا اس کے جسم پر میلے کپڑے تھے۔ اس کی سست رفتار پر مردہ چہرہ اور کمزور جسم دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے کئی روز سے کھانا نصیب نہیں ہوا ہوگا۔ اس کے چہرے پر فکر کی گہری لکیریں تھیں۔ چلتے چلتے اس کی نظر سڑک کے کنارے ایک اوسط درجے کے ہوٹل پر پڑی وہ اس کے دروازے تک پہنچا تو اس کے قدموں نے جیسے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ پچھلے ایک ہفتہ سے وہ کام کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ جو پیسے لے کر وہ گھر سے نکلا تھا وہ تین دن کے اندر ہی خرچ ہو گئے تھے۔ اور اب اس کا ہاتھ خالی تھا کام مانگنے پر بار بار کی جھڑکی اور بے عزتی سے ٹوٹ کر اب وہ مایوسی کی حد میں داخل ہو چکا تھا۔ اپنے گاؤں میں رہ کر کبھی اس نے اندازہ نہیں کیا تھا کہ شہروں میں کام کی ایسی قلت ہو سکتی ہے۔ اس نے سوچا کہ اس ہوٹل میں ایک کوشش کر کے دیکھ لے۔ وہ آگے بڑھا کاونٹر کے پیچھے ایک داڑھی والا شخص گاہکوں سے لین دین میں مصروف تھا۔ دوپہر کے دو بجے تھے کھانے کا وقت تھا اس لیے بھیڑ بھی معمول سے کچھ زیادہ تھی۔ وہ ایک کونے میں ڈرا سہا کھڑا بھیڑ کے کچھ کم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ تاکہ وہ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص سے ہوٹل میں کام

کی درخواست کر سکے۔

ایک شخص جو کھانے کا بل ادا کرنے کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ اس اجنبی شخص نے نہایت نرم لہجے میں اس سے پوچھا کیا بات ہے۔ کوئی کام ہے کیا بابو بھائی سے اپنا نام سن کر کاؤنٹر پر بیٹھا شخص بھی ادھر متوجہ ہو گیا۔ لیکن وہ بولا کچھ نہیں تو نوجوان نے جواب دیا نہیں۔ ہم کام کی تلاش میں یہ الفاظ ادا کرتے کرتے اس کی آنکھیں گیلی ہو گئی۔ اس اجنبی شخص نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ایک کھالی میز پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی وہیں بیٹھ گیا۔۔۔ بھوک کی شدت سے پریشان نوجوان اس سے زیادہ تکلیف برتنے کی حالت میں نہ تھا۔ اس نے کھانہ کی طرف توجہ کی اسے لگ رہا تھا کہ وہ سارا کھانہ ایک ہی بار میں نگل جائیگا۔۔۔ نوجوان نے کھانہ ختم کر کے پانی پیا اجنبی نے پوچھا کیا نام ہے تمہارا۔ ''مسعود خاں'' نوجوان نے کہا میرا نام مہیش رائے ہے۔۔۔ بل کی ادائگی کے بعد وہ مسود خاں کو ساتھ لے کر پیدل ہی اپنے کارخانے کی طرف چل پڑا۔ مسود خاں کے چہرے پر اب کچھ بحالی آ گئی تھی۔'' 90

مندرجہ بالا اقتباس کو پڑھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ یعقوب یاور کا بیانیہ سادہ سلیس اور دلآویز ہے جس سے یعقوب یاور کے وسعت مطالعہ اور فن پر مہارت کا علم ہوتا ہے۔ ناول جہاد کا بیانیہ چست درست ہے اوپر کے سطروں میں بیانیہ انداز میں ناول کے مرکزی کردار مسعود خاں کی گھر سے بھاگنے کی روداد کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اس میں پوری طرح کہانی پن موجود ہے اور قاری کا تجسس برقرار رہتا ہے۔ کل ملا کر ان کے ناولوں کے بیانیہ تکنیک کی بات کی جائے تو ان کے ناول کا فارم بیانیہ کے لحاظ سے گتھا ہوا ہے جس میں کمی کم ہی نظر آتی ہے ناولوں کے پلاٹ چست درست ہیں واقعات سے واقعات ابھرتے چلے جاتے ہیں۔ ناول عزازیل کا بیانیہ ان کے مشہور اور مقبول ناول دل من سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔ ناول دل من میں ناول نگار کا بیانیہ اور کرداروں کا مکالمہ مختلف ہے کرداروں کے مکالمے موضوع اور واقعات کی مناسبت سے ہندی اور سنسکرت آمیز ہیں لیکن ناول نگار کا بیانیہ سادہ اور عام فہم ہے اس لیے کرداروں کے مکالمے کو اردو زبان کا

قاری پورے انہاک کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا ہے کیونکہ اس میں ہندی اور سنسکرت کے بھاری بھرکم الفاظ ہوتے ہیں۔ ویسے یہ ناول موضوع اور کہانی کے اعتبار سے اردو کے ممتاز ناولوں میں سے ایک ہے اس کی شہرت اور مقبولیت اردو ناول نگاری میں مستحکم ہے۔اردو ناول نگاری میں موضوع کے اعتبار سے یہ انفرادیت کا متحمل ہے اس موضوع پر ابھی تک کوئی مفصل ناول نہیں لکھا گیا ہے۔ پاکستان کے مستنصر حسین تاڑ نے ناول ''بہاؤ'' لکھا ہے جس میں سندھ کی تہذیب وثقافت کا مختصراً بیان ہے۔اس ناول میں تاڑ نے قدیم دریا سرسوتی کو موضوع بنایا ہے۔ساتھ ہے اس ناول کا اصل موضوع یہ ہے کہ دنیا سے ساری چیزیں مفقود ہوتی جارہی ہیں۔لیکن انسان کی ذات ایسی ہے جو قائم ودائم ہے۔اس لیے اس ناول میں سندھ کی تہذیب سرسری طور پر ہے لیکن 'دل من' میں سندھ کی تہذیب وثقافت کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1۔کرفیو،یعقوب یاور،ص:1

2۔کرفیو،یعقوب یاور،ص:2

3۔ Google Book Net

4۔شخصی انٹرویو،یعقوب یاور،16/دسمبر 2017

5۔Google Book Net

6۔پروفیسر مجیب،تاریخ تمدن ہند،ص:7

7۔ڈی ڈی کوسمبی،قدیم ہندوستان کی ثقافت وتہذیب تاریخی پس منظر،ص:18

8۔وادی سندھ اوراس کے بعد کے تہذیب،ص:21

9۔وادی سندھ اوراس کے بعد کے تہذیب،ص:21

10۔یعقوب یاور،دل من،ص:9

11۔ایضاً،ص:26

12۔ایضاً،ص:34-33

13۔ایضاً،ص:35

14۔ایضاً،ص:39

15۔ایضاً،ص:42

16۔ایضاً،ص:137

17۔ایضاً،ص:12

18۔ایضاً،ص:26

19۔ایضاً،ص:65

20۔ایضاً،ص:108

21۔ایضاً،ص:186

22۔ایضاً،ص:187

23۔ایضاً،ص:15

24۔ایضاً،ص:16

25۔یعقوب یاور،عزازیل،ص:9

26۔ایضاً،ص:9

27۔ایضاً،ص:12

28۔ایضاً،ص:100

29۔ایضاً،ص:101

30۔ایضاً،ص:114

31۔ایضاً،ص:121

32۔ایضاً،ص:198

33۔ایضاً،ص:83

34۔جہاد،یعقوب یاور،ص:

35۔اردو ناول کا تنقیدی جائزہ (1980) کے بعد،ص:234

36۔اردو ناول آزادی کے بعد،ڈاکٹر اسلم آزاد،ص:17

37۔ناول کیا ہے،احسن فاروقی،نورالحسن ہاشمی،ص:21

38۔داستان سے افسانے تک،وقار عظیم،ص:44

39۔دل من،یعقوب یاور،ص:43-42

40۔ایضاً،ص:39

41۔ایضاً،ص:193

42۔ ایضاً،ص:136

43۔عزازیل، یعقوب یاور،ص:107

44۔ ایضاً،ص:175

45۔ ایضاً ص:86

46۔ جہاد، یعقوب یاور،ص:90

47۔ دل من، یعقوب یاور،ص:211

48۔شخصی انٹرویو، یعقوب یاور، 17 دسمبر 2017

49۔ دل من، یعقوب یاور،ص:155

50۔اردو ناول کا تنقیدی جائزہ (1980 کے بعد)، احمد صغیر،ص:231

51۔عزازیل، یعقوب یاور،ص:85

52۔ ایضاً،ص:180

53۔ جہاد، یعقوب یاور،ص:80

54۔ ایضاً،ص:70

55۔عزازیل، یعقوب یاور،ص:23

56۔ دل من، یعقوب یاور،ص:13

57۔عزازیل، یعقوب یاور،ص:167

58۔ ایضاً،ص:171

59۔ دل من، یعقوب یاور،ص:15

60۔ ایضاً،ص: 96

61۔ ایضاً،ص:207

62۔ ایضاً،ص:205

63۔ جہاد، یعقوب یاور،ص:17

64۔ایضاً،ص:21

65۔ایضاً،ص:103

66۔عزازیل،یعقوب یاور،ص:25

67۔دل من،یعقوب یاور،ص:109

68۔ناول متعلقات ناول،ڈاکٹر مجید بیدار،ص:29

69۔دل من،یعقوب یاور،ص:195

70۔ایضاً،ص:88

71۔ایضاً،ص:178

72۔ایضاً،ص:18

73۔عزازیل،یعقوب یاور،ص:86

74۔ایضاً،ص:64-65

75۔ایضاً،ص:180

76۔جہاد،یعقوب یاور،ص:17

77۔ایضاً،ص:

78۔اردونثر کا تنقیدی مطالعہ،ڈاکٹر سنبل نگار،ص:83

79۔دل من،یعقوب یاور،ص:52

80۔ایضاً،ص:88

81۔ایضاً،ص:158

82۔عزازیل،یعقوب یاور،ص:87-88

83۔ایضاً،ص:195

84۔ایضاً،ص:178

85۔جہاد،یعقوب یاور،ص:19

86۔ایضاً،ص:22

87۔جدید افسانہ تجربہ اور امکانات،آصف اقبال،ص:22

88۔عزازیل،یعقوب یاور،ص:26

89۔دل من،یعقوب یاور،ص:14

90۔جہاد،یعقوب یاور،ص:

باب سوم

یعقوب یاور کی شاعری کا تجزیہ

(الف) عہد و ماحول

(ب) موضوع و مسائل

(ج) فنی لوازمات

(الف)عہدوماحول:

یعقوب یاور نے باضابطہ طور سے اپنی شاعری کا آغاز 1976 میں کیا اس وقت اردو ادب میں تبدیلی آرہی تھی ساتھ ہی سماج بھی اپنی کروٹ بدل رہا تھا۔یعقوب یاور نے اپنی شاعری کے بارے میں بتایا ہے:

> ''جب بات اپنی شاعری پر نکل ہی آئی ہے تو لگے ہاتھ یہ بھی بتادوں کہ شاعری کا ماحول مجھے بچپن سے نہیں ملا بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ میرے بچپن کا ماحول مذہب کی بالادستی کے تحت شاعری کا مخالف تھا۔اس دور میں میں نے کچھ غزلیں اور نظمیں لکھی تھیں جب میری عمر شاید بارہ سال کی تھی لیکن ان میں سے کوئی بھی چیز محفوظ نہیں ہے۔ باقاعدہ طور پر 1976ء میں میں نے شاعری کرنے کا آغاز کیا۔ جب میں سیفینہ کالج بھوپال میں زیر تعلیم تھا۔'' 1؎

یعقوب یاور نے 1980ء کے عشرہ میں شاعری کرنی شروع کی۔اس وقت سماج میں اس افراتفری، وقت کی تیزی، مشینی زندگی، کم وقت میں سب کچھ حاصل کرنے کی آرزو، دولت کی چمک دمک، میڈیا اور گلوبلائزیشن کا دور دورہ، دنیا سکڑتی اور سمٹتی جارہی تھی، سائنس اور ٹکنالاجی کا دور شروع ہوگیا تھا۔ گھنٹوں اور منٹوں میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہونے لگی تھیں ان ساری چیزوں کی خبر ہر انسان کو در وقت ملنے لگی تھیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ان ساری سہولیتوں سے انسانی زندگی میں عجیب وغریب واقعات رونما ہونے لگے تھے۔انسانوں کی زندگی گزارنے کے طریقے بدل گئے تھے،عزت و وقار کے طریقے، سماجی حیثیت، اخلاقی قدریں، یہ سب دولت پر منحصر ہوگئے،انسانی ہمدردی، بھائی چارگی،عزت واحترام سب انسانی زندگی سے غائب ہونے لگے۔ یہ ساری چیزیں یعقوب یاور کے شاعری میں موجود ہیں:

مروّت کا تیوری کا بل کھا گئی
صلاحیتیں سب غزل کھا گئی
نئی سوچ حیرت کدہ توڑ کر
ہمارے مسائل کا حل کھا گئی
اسے کھا گیا خوف قحط الرجال
مجھے اس کا نعم البدل کھا گئی
وہ تاریک شب ہے کہ جینا محال
وہ شب پھیل کر میرا کل کھا گئی

یعقوب یاور نے عصرِ حاضر کے تصادمات کے ساتھ سماجی، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی، تعلیمی عناصر کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ جس کو ان کے ہم عصر شعراء نے بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ جیسے شجاع خاور، عنبر بہرائچی، شہریار، یعقوب راہی، مظہر امام، بشیر بدر، منور رانا، راحت اندوری وغیرہ۔

یعقوب یاور جو ایک ناول نگار اور مترجم کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں لیکن جب ان کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں اپنے دور کے قد آور شاعروں کا ساتھ دیا ہے۔ مظفر حنفی یعقوب یاور کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''غزل کہنے والوں کی تازہ ترین کھیپ میں محبوب راہی، شجاع خاور کے بعد یعقوب یاور نے واشگاف گفتگو، بے محابا طنز کھردرے طرزِ بیان کے وسیلے سے شاد عارفی کی روایت کو آگے بڑھانے کی مستحسن کاوش کی ہے۔ مجھے بڑی طمانیت ہوتی ہے یہ سوچ کر کہ نئی غزل کا وہ پودہ جو یگانہ اور شاد عارفی جیسے دیو قامت فنکاروں نے تلخ حقائق کی سنگلاخ میں لگایا تھا، نہ صرف غزل کی حیثیت سے ایک چھتناز درخت بن چکا ہے بلکہ (جس کے سائے تلے آج کے تقریباً سبھی اہم اور بڑے غزل گو کبھی نہ کبھی ضرور ٹھہرے ہیں) محبوب راہی، شجاع خاور اور یعقوب یاور جیسے تازہ دم فنکاروں کی شگفتہ کاریاں اس کی مسلسل آبیاری بھی کر رہی ہیں۔'' [۲]

1980ء میں انسانیت کا جہاں گلا گھٹنا شروع ہوا وہیں خود غرضی، دھوکہ دھڑی اور استحصال جیسے گھناونے واقعات رونما ہونے لگے اور زندگی کے تقریباً تمام شعبوں میں سرمایہ پرستی اور سرمایہ داری دونوں کی گرفت مضبوط ہونے لگی نہ عدلیہ کے قوانین انسان کے محافظ اور امن وآشتی کے ضامن رہے اور نہ ہی کوئی انسان دوسرے انسان کا محافظ رہا۔ ہر آدمی خود کو ایک دوسرے سے غیر محفوظ محسوس کرنے لگا سماج دوراہے پر آ کر کھڑا ہو گیا چاہے وہ شہروں میں ہو یا گاؤں میں ان ساری چیزوں کو معاصر شعراء نے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے اس میں یعقوب یاور بھی شامل ہیں۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ان کے معاصرین شعراء کا مختصراً تعارف اور ان کی شاعری کا سرسری تجزیہ پیش کر دوں تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ یعقوب یاور کا ان کے معاصر شعراء میں کیا مقام ہے۔

یعقوب یاور کے اب تک تین شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ ''الف'' 1988ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ ''قلم گوید'' 2000ء میں، تیسرا مجموعہ ''بارزیاں'' 2020ء میں شائع ہوا۔ ان تینوں مجموعوں کو پڑھنے کے بعد یعقوب یاور کو ان کے معاصرین کی فہرست میں رکھا جا سکتا ہے۔ یعقوب یاور کے معاصرین میں جن چند شعراء کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

شجاع خاور:

شجاع خاور کی پیدائش 24 دسمبر 1948 کو دہلی میں ہوئی ان کا اصلی نام شجاع الدین ساجد ہے ادب میں شجاع خاور کے نام سے مشہور ہوئے۔ 20 جنوری 2012 کو دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔ عمر کے شروعاتی دور ہی سے شاعری کرنے لگے تھے۔ جب وہ 18، 19 سال کے تھے تبھی سے شاعری کرنے لگے تھے۔ 1968ء میں ان کی پہلی کتاب ''اردو شاعری میں تاج محل'' کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں تاج محل پر لکھے گئے دوسرے شعراء کی منتخب نظمیں شامل ہیں ساتھ ہی شجاع خاور کی بھی نظم شامل ہے۔ 1970ء میں ان کا دوسرا مجموعہ ''دوسرا شجر'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اولین دور میں شجاع خاور نظم کی طرف زیادہ راغب تھے۔ کچھ مدت گزرنے کے بعد شجاع خاور غزل کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کا نیا شعری مجموعہ

1982ء ''وادئین'' لوگوں کے درمیان مقبول ہوا۔ اس کے علاوہ ''بات''، ''رشک فارسی''، ''اللہ ہو''، ''غزل پارے'' اور ''غزلیہ'' ہیں۔ یہ سب ان کی غزلوں کے مجموعے ہیں۔

شجاع خاور کے کلام میں بیک وقت کلاسکیت جدید لب ولہجہ ان کے اسلوب میں انفرادیت کے ساتھ موجود ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں سماج میں ہو رہے ظلم وستم کو بھی موضوع بنایا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

تاریخ کی خاطر بھی دو ایک نشاں چھوڑو
اندر ہی جلو لیکن باہر تو دھوواں چھوڑو
کہتے ہیں کہ تب آنا جب آہ و فغاں چھوڑو
اس بزم میں جاؤ تو اس دل کو کہاں چھوڑو
ہر بات کہو کھل کر ذو معنی زباں چھوڑو
یا کعبے سے منہ پھیرو یا کوئے بتاں چھوڑو
اظہار کی خوبی کا اس پر نہ اثر ہوگا
ملنے کا سبب ڈھونڈو فرقت کا بیاں چھوڑو

شجاع خاور کہہ رہے ہیں کہ جو ظلم وستم ہو رہے ہیں آنے والے کل میں یہی تاریخ کا حصہ بنیں گے۔ آنے والی نسل یہ یاد کرے گی کہ کیسی کیسی زیادتیاں ہوتی تھیں۔ شاعر سماج کا نباض ہوتا ہے اور اس پر جو گزرتی ہے وہ رقم کرتا ہے۔ شاعر ان مسائل کو اپنے شاعرانہ انداز میں صفحہ قرطاس پر لاتا ہے۔ شجاع خاور نے طنزیہ پہلو کو اختیار کرتے ہوئے سماج کی بے حسی اور اس کے ظلم و جبر کو پیش کیا ہے۔

مٹی کی سنی خون کے رشتوں کو نہ دیکھا
اور اس پہ بھی کہلاتے ہیں غدار میاں جی
کچھ ہم وطنوں کی بھی نظر صاف نہیں ہے
کچھ تم بھی گراتے نہیں دیوار میاں جی
تنقید کی عظمت کو بھلا کیسے سمجھتے

تم پڑھتے رہے میر کے اشعار میاں جی

ان تینوں شعر میں طنز نظر آتا ہے ساتھ ہی شعر کو پڑھنے سے فکر کی کئی جہتیں ملتی ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے وقتی رویے کس طرح سے عصری تقاضوں سے متاثر ہوتے ہیں اور الفاظ کے استعمال میں ہم اکثر ذہنی سطح پر بداحتیاتی اور غلط روی کا شکار ہوجاتے ہیں اس میں جانبداریت بھی ہوسکتی ہے اور فخر بھی اس سلسلے میں مندرجہ بالا اشعار میں ''میاں جی'' کا الفاظ شجاع خاور نے محاورے کے طور پر استعمال کیا ہے اس سے مراد سماج میں ایک خاص طرح کی شخصیت مراد ہوتی ہے اور یہ مسلمانوں کا قدامت پرست طبقہ نئے شہری حلقوں میں میاں صاحب کم اور میاں جی زیادہ پکارا جاتا ہے۔اس میں تہذیبی طور پر طنز موجود ہے۔ پہلے شعر میں تقسیم ہند کے المیہ کی طرف اشارہ ہے وہ لوگ جنھوں نے اپنی مٹی کی خاطر ہندوستان سے ہجرت نہیں کی بلکہ اپنے اس ملک ہندوستان کے لیے اپنے خونی رشتوں کی قربانی دے دی اور وطن کی خاطر اپنے خونی رشتوں سے ہمیشہ ہمیش کے لیے جدا ہوگئے۔ان کی اس قربانی اور وفا کا صلہ اس ہندوستان میں دوسرے لوگ غدار کہہ کر دیتے ہیں ۔ اس سے بڑھ کر اور بدنصیبی کیا ہوسکتی ہے کہ سب کچھ لٹانے کے باوجود غدار کہلایا جائے۔شجاع خاور کا یہ شعر تقسیم ہند کے بعد سے اب تک کے منظر نامہ پر من وعن کھرا اترتا ہے۔ان اشعار میں شجاع خاور نے تقسیم ہند کے بعد ہندومسلم کے تصادمات کو بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح سے آپس میں ہر ہندوستانی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔تیسرے شعر میں بھی شجاع خاور کا شاعرانہ طنز موجود ہے۔

شجاع خاور کی غزل میں تنہائی کا لفظ بھی کئی بار استعمال ہوا ہے۔انھوں نے یہ لفظ رسمی طور پر استعمال نہیں کیا بلکہ اپنی زندگی میں جس طرح سے انھوں نے تنہائی کو محسوس کیا ہے اسے احساسات وتجربات سے پیش کیا ہے۔اس لیے یہ تنہائی اجنبیت محسوس نہیں کراتی بلکہ ذہنی قربتوں کا احساس کراتی ہے اس کے علاوہ وہ حسیاتی اکیلا پن جو بڑے بڑے شہروں کی دین ہے اور انسان بھیڑ میں ہونے کے باوجود بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔

ہر ایک شخص اکیلا دکھائی دیتا ہے

ہوئی ہے ذہن پہ جب سے سوار تنہائی
تمام شہر میں اپنے ہمیں نظر آئے
پڑی ہے گھر میں ہمارے غریب تنہائی
پھر آج شام کو گھر لوٹ کر ہم آئیں گے
ملے گی پھر وہی خانہ خراب تنہائی

شجاع خاور نے یہ بتایا ہے کہ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں جہاں پر انسان مختلف ذرائع سے ایک دوسرے کے رابطے میں رہتا ہے جس سے پوری دنیا ایک گھر کے مانند ہوگئی ہے لیکن پھر بھی انسان اپنے آپ کو اکیلا اور تنہائی کے کرب میں پاتا ہے۔ایک دوسرے سے نہ تو کوئی دلی لگاؤ ہے اور نہ ہی محبت،تنہائی وبے چہرگی کا عالم یہ ہے کہ ہماری سوچ پر بھی تنہائی کا پہرا ہے چاہے کوئی انسان مجمع میں ہو،سڑک پر ہو یا گھر پر ہو، ہر جگہ تنہائی اس پر مسلط ہے اور انسان اپنے آپ کو اکیلے پن سے دور نہیں کر پاتا ہے شہروں میں یہ حالت کچھ اور ہی زیادہ ہے اس تنہائی کا مطلب شجاع خاور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ انسان بھیڑ میں اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرتا ہے اور اس کے جذبات اور خیالات کو سننے اور سمجھنے والا کوئی نہیں ہوتا ہے۔اسی طرح سے یعقوب یاور کی غزلوں میں بھی تنہائی کا ذکر موجود ہے۔جس کو موجودہ دور کے ترقی یافتہ ذرائع اور سہولتوں نے وجود میں لایا۔جس کا ذکر مندرجہ ذیل اشعار میں موجود ہے:

مسئلوں کی بھیڑ نے انسان کو تنہا کردیا
ارتقا نے زندگی کا زخم گہرا کردیا
اک کرن تسخیر کل کی سمت تھا پہلا قدم
آگ اگلتی آندھیوں نے ہم کو اندھا کردیا
فکر کی لامرکزیت جاگتی آنکھوں میں خواب
ہم خیالی نے زمانے بھر کو اپنا کردیا
اک شجر کو جسم کی نم سبزہ گاہوں کی تلاش
اور اس تحریک نے جنگل کو سونا کردیا

خون کی سرخی سفیدی کی طرف محو سفر
کچھ نئے رشتوں نے ہر رشتے کو گندا کردیا

اس غزل میں یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے انداز میں سماج میں پھیلی ہوئی بے چہرگی بے چینی اور تنہائی کو بیان کیا ہے پہلے مصرع میں یعقوب یاور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آج کا زمانہ ایسا ہو چکا ہے کہ ہر کوئی اپنے میں حیران، پریشان نظر آتا ہے، تمناؤں کے حصول میں انسانی ہمدری، پیار و محبت کو بھلا دیا گیا ہے عصری زندگی کے مسائل اور ترقی کی ہوس، انسان کا دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی آرزو نے انسان کو آج کے دور میں تنہا کر دیا ہے اور انسان تنہائی کے کرب میں جی رہا ہے اس کے بعد کے اشعار میں یعقوب یاور نے یہ بتایا ہے کہ انسان حصول دولت اور اپنی عزت و ترقی کے خاطر ایک دوسرے کو کچلتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے اور انسانی رشتوں کا خیال تک نہیں کرتا جس کی بنا پر انسانوں میں محبت اور بھائی چارگی مفقود ہو چکی ہے۔

بشیر بدر:

بشیر بدر کی پیدائش 15 فروری 1935 کو یوپی کے ضلع کانپور میں ہوئی۔ ان کا اصلی نام سید محمد بشیر ہے۔ آزادی کے بعد جن شعراء کو مقبولیت حاصل ہوئی ان میں ایک نام بشیر بدر کا بھی ہے۔ ان کے اب تک چار مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ''آمد''، ''آسمان''، ''امیج اور آہٹ'' اور ان کا کلیات بھی شائع ہو چکا ہے۔ بشیر بدر کی شاعری میں کلاسکیت حسن و عاشقی کے ساتھ موجود ہے اور دوسری طرف نئے خیالات اور تصورات کو اپنی غزل میں شامل کیا ہے۔ بشیر بدر نے عشق و محبت کے ساتھ وقت کے بدلتے حالات اور آدمی کے ذہن اور سوچ کی تبدیلی کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔

خدایا میری صدی میں بھی معجزہ کردے
وہ پوچھتے ہیں کہ اس دور میں محبت کیا

اس شعر میں بشیر بدر نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آج کا ماحول ایسا ہو چکا ہے کہ یہاں سچی محبت

نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے اور آج کے انسان میں مصروفیت کا تصور کس طرح سے رچا بسا ہے اس کی بھی تصویر کشی کی ہے:

بے وقت اگر جاؤں گا سب چونک پڑیں گے
اک عمر ہوئی دن میں کبھی گھر نہیں دیکھا

پہلے بھی محنت مزدوری کرنے والے شام کو ہی گھر واپس لوٹتے تھے لیکن مصروفیت کا یہ عالم نہیں تھا جو آج کے دور میں ہے۔آج انسان دن کا سارا وقت دفتروں کارخانوں اور محنت مزدوری کے اداروں میں اس طرح گزارتا ہے کہ کبھی بھی دن میں گھر جانے کا وقت نہیں ملتا ہے اور گھر والے بھی اسی پر قناعت بھی کر چکے ہیں۔اگر اتفاق سے وہ دن میں گھر پہنچ جائیں تو سب چونک پڑتے ہیں۔بشیر بدر نے دور حاضر کے افراتفری کے ساتھ عشقیہ رمزات کو بھی اپنی شاعری میں پیش کیا ہے:

پتھر مجھے کہتا ہے مرا چاہنے والا
میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

اس شعر میں بشیر بدر نے صنعت تضاد کا استعمال کر کے بہترین الفاظ کو شاعری میں پرویا ہے۔ جس میں کلاسکیت ہے اور مجہول کیفیت اور جذبات کا بیان فصاحت و بلاغت کے ساتھ موجود ہے ایک ادیب ہونے کے ناطے انھوں نے بدلتے زمانے کے رنگ وروپ کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور ساتھ ہی گاؤں، دیہات اور شہروں کی منظر کشی بھی کی ہے۔

گھر کتنے ہی چھوٹے ہوں گھنے پیڑ ملیں گے
شہروں سے الگ ہوتی ہے قصبات کی خوشبو

شاعر نے قصبے کی زندگی کو پرکشش انداز میں پیش کیا ہے اور گاؤں وشہر کی ماحولیات کا ذکر اس طرح سے کیا ہے کہ گاؤں میں گھر جیسے بھی ہوں پر اس کے اردگرد پیڑ پودے ضرور ملیں گے جس کی بنا پر وہاں کی آب وہوا صاف ستھری ہے لیکن شہروں میں تا حد نظر مکانات بلڈنگیں آلات وموٹر جس کے سبب شہروں کی آب وہوا زہر آلود ہے۔اسی طرح گاؤں اور شہروں کے رشتوں میں بھی افتراق ہے:

کہاں سے آتی یہ خوشبو، یہ گھر کی خوشبو ہے
اس اجنبی کے اندھیرے میں کون آیا ہے

بشیر بدر نے اس شعر میں نیا لہجہ، نئی لفظیات کا استعمال کیا ہے اور موضوعی اعتبار سے یہ بتایا ہے کہ آج شہری زندگی ایسی ہو چکی ہے جس میں اجنبیت ہے کوئی کسی کو پہچاننے والا نہیں ہر کوئی اپنی زندگی میں افراتفری کا شکار ہے محبت رشتہ داری سب کا فقدان ہے۔ گھر کی خوبصورتی یہ تھی کہ اس میں رشتے کی پاسداری ہو بھائی چارگی کے ساتھ لوگوں کا آپس میں لگاؤ ہو پر عصرِ حاضر میں یہ سب ناپید ہو چکا ہے لیکن کبھی کبھار اگر کہیں سے شہری زندگی میں انسان کو محبت مل جاتی ہے تو وہ اس کو امرت سمجھتا ہے اور اسے اپنے ماضی کی یاد آجاتی ہے جس میں محبتوں کا سمندر رواں دواں تھا:

اسے کسی کی محبت کا اعتبار نہیں
اسے زمانے نے شاید بہت ستایا ہے

اس شعر میں شہری زندگی کی ان چیزوں کا محسوس کیا جا سکتا ہے جو شہروں میں مروج ہے۔ ہر آدمی دوسرے سے کھلے دل سے نہیں ملتا ہے اور یہی ہمارا شہری مزاج بھی بن گیا ہے اس کے پیچھے تجربے کی ایک لمبی کہانی چھپی ہوئی ہے۔ انسان آج معاشرے میں دوسرے انسان کے ذریعے اس قدر ستایا گیا ہے کہ اسے اب کسی فرد انسان پر بھروسا و اعتماد نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے پورا معاشرا خلفشاری کے سمندر میں غوطہ لگا رہا ہے۔

ترے ساتھ اتنے بہت سے دن تو پلک جھپکتے گزر گئے
ہوئی شام کھیل ہی کھیل میں کٹی رات بات ہی بات میں
کوئی عشق ہے کہ اکیلا ریت کی شال اوڑھ کے چل دیا
کبھی بال بچوں کے ساتھ آ، یہ پڑاؤ لگتا ہے رات میں
کبھی سات رنگوں کا پھول ہوں کبھی دھوپ ہوں کبھی دھول ہوں
میں تمام کپڑے بدل چکا ترے موسموں کی برات میں

ان شعروں میں نئی حسیت موجود ہے لیکن لفظ معنی کا تعلق فکر وخیال کے رشتوں اور جذبات وحسیت کے تہہ دار پہلوؤں کے اعتبار سے زبان کا استعمال کچھ حد تک غیر آشنا ہے۔اسی لیے اشارہ کی جو لوازمات ہوتی ہے وہ اس شعر میں دکھائی نہیں دے رہی ہے۔اگر اس طرف ہمارے جدید شعراء توجہ دیں تو ہماری نئی شعری حسیت زیادہ موثر ہوسکتی ہے۔فنی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو شجاع خاور نے استعارہ،تشبیہ وغیرہ کا استعمال اپنے اشعار میں بحسن خوبی کیا ہے۔

آنکھوں کی کشتیوں میں سفر کررہے ہیں وہ
جن دوستوں نے دل کے سفینے ڈبوئے تھے

اس شعر میں آنکھوں کی کشتیوں کو بطور استعارہ استعمال کیا گیا ہے وہ یہ کہ بہت قریبی اور عزیز کے معنی میں ہے اور دل کے سفینے کو بھی استعارہ کے طور پر شاعر نے لکھا ہے وہ آرزو اور ارادے کے معنی میں ہے۔زمانے کے تغیرات وحادثات ایسے ہیں کہ وہ انسان کے آرزو اور مقصد کو پورا نہیں ہونے دیتے ہیں یہ تبدلات انسان کو صرف دکھ اور تکلیف سے دوچار کرتے ہیں پر کبھی کبھی انسان اپنے دشمنوں کے بھی قریب ہوجاتا ہے جو اس کے لیے ضرر رساں ہوتا ہے۔

کہاں آنسوؤں کی یہ سوغات ہوگی
نئے لوگ ہوں گے نئی بات ہوگئی

وقت کی تبدیلیاں جذبات واحساسات کی دنیا کو بدل دیتی ہے۔معنی سے معنویت تک کے سفر میں بعض موڑ ایسے بھی آتے ہیں کہ ذہن ان کا ساتھ نہیں دے پاتا۔ جب نیا زمانہ آجاتا ہے تو ذہن میں نئی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔سوچنے کے انداز بھی ہمارے بدل جاتے ہیں۔ان تمام چیزوں کو بشیر بدر نے نرم لہجے میں شاعرانہ وصف کے ساتھ بیان کیا ہے۔عصر حاضر کی تصویر کشی بشیر بدر کے اس شعر میں عمدگی سے کی گئی ہے۔

خدا ہم کو ایسی خدائی نہ دے
کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے

اس شعر میں نئے ذہنی صورت حال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ آج کا انسان جب بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے تو وہ کسی کو اپنے برابر نہیں سمجھتا ہے۔ آدمی بعض حالات میں اتنا مغرور ہو جاتا ہے کہ اسے دنیا کے اور لوگوں اور ان کے دکھ درد سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے۔ یہاں شعر میں خدائی سے مراد طاقت، وقت اور ترقی ہے۔ بشیر بدر جدید غزل کے لب ولہجہ کو اپنانے اور اسے ہر دل عزیز بنانے میں ایک خاص کردار ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں انھوں نے جدید اردو غزل کو ایک خاص لب ولہجہ عطا کیا ہے اور یہی ان کی انفرادیت ہے جو انھیں ان کے معاصرین سے الگ کرتی ہے۔

عنبر بہرائچی:

ان کی پیدائش 5 جولائی 1949 کو یوپی کے ضلع بہرائچ میں ہوئی۔ ان کا اصل نام محمد ادریس تھا ان کی وفات 7 مئی 2021 کو لکھنؤ میں ہوئی۔ تقسیم ہند کے بعد جن اردو شعراء نے اردو شاعری کی تاریخ اور ارتقا میں اہم کردار ادا کیا ہے ان میں عنبر بہرائچی کا نام بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے اپنے معاصرین میں الگ مقام بنایا۔ ان کا ایک خاص اپنا لب ولہجہ تھا۔ گرد و پیش کے احوال وکوائف پر انکی گہری نظر تھی۔ عنبر بہرائچی کی بہت سی اہم کتابیں ہیں جیسے مہا بھشنکر من، دوب، سوکھی ٹہنی پر ہریل، لمیات نظیر کف فی نظر، یہ سب شعری مجموعے ہیں۔ سنسکرت شعریات، سنسکرت بوطیقا، چند جہات، آنند وردھن اور ان کی شعریات، سنسکرت شاعری یہ سب ان کے تنقیدی وتحقیقی سرمائے ہیں۔ ان کے علاوہ گمنام جزیروں کی تمکنت، ملنگ ملہار، سواپنکھی مٹیوں کی سوندھی گمک یہ سب بھی ان کے شعری مجموعے ہیں۔

آنکھیں کھلتے ہی سناٹے سرگوشی کر جاتے ہیں
سبز سحر کی گھات میں چھپ کر زرد بگولے بیٹھے ہیں

یہاں کچھ نئے تصورات اور ان سے وابستہ ذہنی تصویریں شاعر کی نظر میں ضرور ہوں گی لیکن صبح کا وقت سناٹوں کا وقت نہیں ہوتا ہے۔ ہوائیں اپنی جگہ ترنم ریز ہوتی ہیں پرندے چہچہاتے ہیں، پھول کھلتے ہیں، گویا کہ صبح کا وقت دل کو چھونے والے لمحوں سے گزرتا ہے اس کو سناٹوں سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا لیکن اگر

کسی خاص نفسیاتی دباؤ یا کرب واضطراب کی بنا پر اس کو سناٹا کہا گیا ہے تو اس کے معنی تک پہنچنا عام قاری کے لیے مشکل بات ہے لیکن اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو عنبر بہرائچی نے زمانے کی سفا کی کو اس شعر میں بیان کیا ہے اور زمانے پر ایک تیکھا وار کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آج انسان فطری چیز کو غیر فطری بنانے میں تلا ہوا ہے۔ انسان صبح میں جہاں تازہ دم ہوتا تھا لیکن آج سماج ایسا ہو چکا ہے کہ آنکھ کھولتے ہی انسانوں کے سامنے ظلم و جبر اور استحصال کا منظر ہوتا ہے جس بنا پر ہر طرف سناٹے چھائے ہوتے ہیں دوسرے مصرعے میں علامت کا استعمال کیا ہے۔ زرد بگولے کو عنبر بہرائچی نے ایک خاص علامت کے طور پر استعمال کیا ہے جو لوگوں میں خوف و دہشت کو پھیلاتے ہیں۔ ماحول کے بدلتے منظر نامے کو عنبر بہرائچی نے اپنے اس طرح میں پیش کیا ہے۔

پریم محل کے ہر کنگورے پر اترے گی شوخ دھنک
جذبوں کے آنگن میں ساون رات امرت برسائے گی

ماحول بدلے گا منظر بدلے گا اور نظریے کے زاویے بھی ان کے ساتھ بدل جائیں گے اور فکر و خیال خواب کے جو بھی گوشے یا تعمیری زاویے ہوں گے ان پر نئی روشنی آ کر نئی سمتیں پیدا کریں گی اور ذہن کی جو کھیتی کام نہیں کرتی اس مردہ زمین کو پھر زندہ کیا جائے گا۔ فکر تجربوں کی دین ہوتی ہے۔ نئے تجربے اگر نہیں کیے جائیں تو نئی فکر اور زاویے کیسے سمجھ میں آئیں گے۔ ایک عجیب بات ہے کہ نئے افکار کے بغیر نئے اعمال بھی سامنے نہیں آتے۔ عنبر بہرائچی نے اپنی بہت سی غزلوں میں نئی علامتوں اور نئی ترکیبوں کا استعمال کیا ہے اور غزل کو ایک نیا رخ دینے کی کوشش ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ عنبر بہرائچی نے غزل میں ایسی نئی تہہ داری پیدا کی ہے جس کی تعبیر و تشریح میں کچھ مشکلیں پیدا ہوتی ہیں۔

ٹھہرے پانی کی چادر میں کیا کیا بل آئے، پھاگن میں
سرگوشی نے ہر پیکر میں خنجر لہرائے پھاگن میں
امرائی میں بور کی خوشبو ہر پل ہوش اڑاتی جائے
متوارے نیناں سندوروی سے بل کھائے پھاگن میں

ہیر و رانجھا کے رتنائے نینوں میں ہی بھاؤ نہیں ہیں
بابا کی آنکھوں میں بھی تو شوخی لہرائے پھاگن میں
ذہن کی ہر جھڑ کی پر جوگی دل نے کوئی بات نہ مانی
پریم املتاسوں کے طرّے نس نس کو بھائے پھاگن میں

یہ ایک ایسی سطح کی نئی غزل ہے جس میں کلاسکی انداز کو سمیٹا گیا ہے اور گیت کے بعض عناصر کو بھی اس غزل میں جگہ دینے کی کوشش کی گئی ہے ساتھ ہی اس میں ہندوستانی مہینوں کے اثرات کو موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے جیسے پھاگن، ایک مہینہ ہے جس میں بہار کے ساتھ ہر طرف ہریالیاں ہوتی ہیں۔عصر حاضر کی ناروا سلوک کو عنبر بہرائچی نے اپنے اشعار میں کچھ اس طرح سے پرویا ہے۔

روٹی بن کر آجاتا ہے چاند مرے چھپر کے اوپر
لال پری میرے بچوں کو عنبر تھپکی دے جاتی ہے

عنبر بہرائچی نے اس شعر میں ماضی کے ایک لوری جسے غریب اپنے بچے کو سلانے میں گاتا ہے۔ پیش کر کے یہ بتایا ہے کہ یہ سماج کس طرح سے بے حس ہو چکا ہے کہ اس کو اپنے اغل بغل انسان نہیں دکھتے ہیں۔عنبر بہرائچی اپنے آپ کو معاصرے کی عائد کردہ پابندیوں سے آزاد رکھتے ہیں اور روایتی سوچ کی فضا سے اپنے آپ کو الگ رکھتے ہیں۔عنبر بہرائچی نے غزل، گیت، نظم، سب کچھ لکھا ہے اور اس میں کلاسکیت سے لے کر جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے لوازمات کو برتا ہے۔ان کے اشعار میں ہندی الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔

آخر مٹی نے ان کو بھی ڈھانپ لیا
ہاتھوں پر آکاش لیے جو پھرتے تھے

شعر میں آسمانوں پر کمند ڈالنے اور ستارے توڑ لانے کا ذکر ملتا ہے لیکن اس شعر میں ہاتھوں پر آسمان لیے پھرنا ایک طرح کی نئی بات ہے اور اس سے یہ مراد ہے کہ آسمان ان کے اشاروں پر ناچ رہا تھا لیکن آسمان کو اپنے ہتھیلیوں پر رکھ کر گھمانے والوں اور ستارے توڑنے والوں کا انجام مدت تھا۔

اردو زبان و ادب نے ہندی روایت کا اثر قبول کیا ہے۔ اس کے تحت عشق و محبت کا کردار بدلا ہے۔ عنبر بہرائچی کے پاس ایسی بہت سی مثالیں ہیں جن میں محبت کچھ بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ محبت کی بے قراریاں اور عشق وتمنا کے لمحوں کی خواہش، محبت کرنے والوں کے دامن میں نہیں آتے بلکہ خود معشوقہ کے آنچل میں گرے ہیں۔ محبت بھرا کردار مرد کا نہیں عورت کا ہے یہ صورت ہندوی شاعری میں ہمیشہ سے شامل ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اشکوں میں ڈوبا خط صدیوں بعد ملا
یاد نہیں کچھ ہم کب اس سے روٹھے تھے
زرد دو پہری میں سکھیوں سنگ ہولا بھون رہی ہے گوری
یاد اچانک آیا کوئی آنسو بن جائے پھاگن میں
ہاتھوں میں سورج لے کر کیوں پھرتے ہو؟
اس بستی میں اب دیدہ ور کتنے ہیں

ادیب جس طرح سوچتا ہے اس طرح سے اس کو اپنی شاعری میں ڈھالتا ہے چاہے وہ انسانی زندگی کے مراحل ہوں یا انسان کے اندر بھائی چارگی شاعر اس کو سنجیدہ ہو کے لکھتا تو کبھی طنزاً۔

چہروں پر زر پوش اندھیرے پھیلے ہیں
اب جینے کے ڈھنگ بڑے ہی مہنگے ہیں

یہاں شاعر آج کے معاصرے پر طنز کر رہا ہے کہ آج کے دور میں انسانوں کو سونا چاندی سے تولا جاتا ہے۔ جس کے پاس جتنا مال وزر ہے وہ اتنا ہی بڑا آدمی ہے اسی مال و دولت کی بنا پر آج کے انسان پر اندھیرا چھا گیا ہے جس کی بنا پر وہ اچھائی و برائی کی تمیز نہیں کر پاتا۔ اب انسان کی زندگی گزارنے کے طور طریقے بدل گئے ہیں وہ بہت مہنگے ہو گئے ہیں۔ روپئے پیسے کے فراوانی نے انسانی زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس طرح کے اشعار یعقوب یاور نے بھی لکھے ہیں جو زمانے کی دین ہیں۔ اس میں انسان پوری طرح سے الجھا ہوا ہے اور فریب خوردہ زندگی سے اداس ہے۔ مثال میں چند شعر ملاحظہ کریں:

فریب خوردہ زندگی کے درمیاں اداس ہے
وہ آج اپنے سچ کے سامنے ہی بے لباس ہے
وہ شخص اپنے غم کی تازہ کاریوں میں مبتلا
صحیفۂ حیات کا برہنہ اقتباس ہے
وہ حوصلہ کبھی رگ گلو سے بھی قریب تر
کبھی طلسم روز و شب میں گمشدہ حواس ہے

ساتھ ہی عنبر بہرائچی ایک ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب وثقافت رچا بسا ہے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان کے یہاں ہندوستان کی دیہی علاقوں کی ایسی تصویر ملتی ہے۔ جس میں خالص ہندوستانی ممیّزات موجود ہیں ان میں شادی بیاہ کے رسم و رواج لوگوں کے رہن سہن کے طور طریقے، ان کے مذہبی عقائد، عید وتہوار وغیرہ ہیں۔ عنبر بہرائچی نے اپنی شاعری میں ہندوستانی بولیوں کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔ جس میں اودھی، برج بھاشا اور بھوج پوری کے خوش آہنگ الفاظ ہیں۔ عنبر بہرائچی کی شاعری میں فطرت کا حسن ہے، ہندوستان کے صوبہ مشرقی یوپی کی بو باس ہے۔ ان کی شاعری پر علاقائیت کا گہرا اثر ہے۔ ہندوستان کے اندر بہت ساری تہذیبیں الگ الگ طریقے سے الگ الگ وقت میں الگ الگ جگہوں پر پائی جاتی ہیں۔ گاؤں دیہات میں کچھ ایسے رسومات ہوتے ہیں جس کا تعلق وہاں کے لوگوں کے ذات اور کام سے جڑا ہوتا ہے اور ان کے تقاریب میں ایسے گیت وغیرہ گائے جاتے ہیں جو الگ الگ موقعوں کے لیے الگ الگ ہوتا ہے جسے ہم لوگ گیت کہتے ہیں اور اس کا اپنا الگ نام ہوتا ہے۔ جیسے بچے کی پیدائش پر جو گیت گاتے ہیں اس کا نام ''سوہر'' ہے، بارش میں جو گیت گاتے ہیں اس کا نام ''پچرا'' ہے، شادی میں جو گیت گاتے ہیں اس میں ایک نام ''گاری'' ہے۔ عورت اپنے شوہر کی یاد میں جو گاتی ہے اس کا نام 'برہا' ہے۔ اس طرح کی تمام چیزیں عنبر بہرائچی کی شاعری میں موجود ہیں جو خالص ہندوستان کی تہذیب ہے۔ ان کی شاعری میں کسانوں کا ذکر، کھیتوں کی مٹی کی چمک اور دیہی

علاقوں کی اشیا اوران کے مناظر موجود ہیں جس کو آج شاید جدید دور کے لوگ بھول چکے ہیں۔ان کی شاعری میں ہندوستان کے ایسے عناصر ہیں جس میں ہل ہے، بیل ہیں، سچائی وغیرہ ہیں جس سے ہندوستان کے تہذیبی حسن کی معرفت ہوتی ہے۔ ان کی شاعری میں ہندوستان کی ان گنت رنگوں ، بہاروں ،میلوں اور تہواروں کا ذکر ہے۔ ہندوستانی رہنماؤں اوراماموں کا تذکرہ ہےان کی شاعری میں عطر کی خوشبوتونہیں ہے لیکن جنگلی گلابوں کی بھینی بھینی لطیف اور روح پرورسگندھ ہے، پیڑ پودوں، دریاؤں اور کھیتوں، کھلیانوں، جنگلوں، کچے مکانوں، تالابوں، آنگنوں، معصوم شیریں امنگوں اور تلخ حقائق کی دھوپ چھاؤں ان کے یہاں موجود ہیں۔ ہندوستان کی وہ تمام ممیّزات جو ہندوستان کی اپنی دین اوراس کی اپنی پہچان بھی ہے یہ ان کی شاعری میں موجود ہیں۔عنبر بہرائچی ہمارے دور کے پہلے جدید ہندوستانی دیہی شاعر کہلاتے ہیں اور یہی ان کا مضبوط قلعہ ہے دیہی شاعری کے جیسے اعلیٰ نمونے ان کے یہاں ملتے ہیں ویسے اردو کے دوسرے شعراء کے یہاں دکھائی نہیں دیتے ہیں۔کچھ اشعار ملاحظہ ہو جس کے اندر انھوں نے ان تمام مناظر کو پیش کیا ہے۔

ہل کی موٹھ ہاتھ میں اور چمکیلی دھوپ برستی ہے
ایک انگوچھے کے گوشے میں بھنے چنے کی ایک پوٹلی بندھی ہوئی
ہے
روہو، ٹینگن ، بھاکر جب بہتے پانی میں
سیدھی، آڑی، ترچھی اندھی دوڑ لگا کر
اپنے چاندی جیسے جسموں کے خال وخط دکھلاتے ہیں
جسم برہنہ، تیکھی بوچھاروں میں وہ ہنستا رہتا ہے
شوخ مچھلیوں کی یلغاروں سے گھنٹوں دل بہلاتا ہے
دھان کی فصلیں پانی پا کر اپنے طرلے لہراتی ہیں
کھرپی لے کر بیچ کھیت، وہ خوش ہو کر ساون گاتا ہے

سینے میں خوشبو کا تازہ جھونکا دھوم مچا جاتا ہے

عنبر بہرائچی کی یہ نظم مٹی سے جڑی ہوئی ہے جس میں کسانوں کے افعال اور کھیتوں وفصلوں کے مناظر موجود ہیں۔ان کی شاعری قریہ جاتی تہذیب سے ملی ہوئی ہے جس میں گھر آنگن کی فضا ہے گلی اور محلے کی ہوا ہے، نیم اور پیپل کا سایا ہے جو ذہن کو سکون بخشتا ہے، بیٹی کی رخصتی اور بچوں کی لوری ہے ۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہو:

میں کیکر کا پیڑ اکیلا آج مری قسمت جاگی ہے
اک ہلکی پھلکی سی چڑیا میرے سینے سے لپٹی ہے
مٹی،دھوپ،ہوا،پانی کی اشکوں بھری دعائیں لیکر
میرے گاؤں کی بیٹی اپنے بابل سے رخصت ہوتی ہے
کچھ مٹی خوشبو اینٹوں کے جنگل سے گزری
گلدانوں میں دھڑکن جاگی،لانوں کی رنگت بدلی ہے

عنبر بہرائچی کی شاعری میں ہندوستانی موسموں اور پچھتروں اور پرندوں کے ذکر کے ساتھ قدیم تہذیب کی آواز ہے ندی کا پنگھٹ ہے صبح وشام کے مناظر ہیں۔جس سے ہندوستان کی وہ تمام خوبصورتی ان کی شاعری میں پائی جاتی ہے جو ہندوستان کی اپنی خوشبو اور انفرادیت ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہو:

بے ستوں اندھی خلا کی قید سے چھوٹے کہاں
ہم سوا پنکھی زمینوں پر بھلا اترے کہاں
عمر بھر ہم جیٹھ کی تپتی دوپہری میں رہے
نیم کے سائے میں پل بھر کیلئے ٹھہرے کہاں
ہاتھ کا پانی ہوا میں بھاپ بن کر اڑ گیا
جب یہ سوچا یہ ندی تھی آج سے پہلے کہاں

ہم کو عنؔبر دور کے منظر لگے اچھے مگر
اپنی مٹی تھی بہت پیاری بھلا جاتے کہاں

عنبر بہرائچی کی شاعری میں عوامی اور علاقائی روایتوں کے آغوش سے ہم مسرتوں اور لزتوں کے خزانے سے مستفید ہوتے ہیں۔علاقائی زبانوں کے ایسے الفاظ ان کی شاعری میں ہیں جو اردو میں آسانی سے کھپ سکتے ہیں۔ ہندوستان کے علاقائی ماحول کی حدنظر تک پھیلی ہوئی جنت کے نظاروں سے ان کی شاعری مالا مال ہے۔ان کی شاعری پڑھنے اور سننے کے بعد ہندوستان کے الگ الگ علاقے کی سیر ہوجاتی ہے۔ان کی شاعری کی تازہ کاری اور لالہ کاری سامع اور قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔

بھری رین مھوا چویں،جھومت چلے بیار
نینوں سے ندیا گئی،پیتم گئے ھمار

غرض کہ عنبر بہرائچی ہندوستان کے جدید دور کے خالص ہندوستانی اور دیہی شاعر ہیں جنھوں نے گاؤں کے ماحول و مناظر کو شاعری کے ذریعے نئی نسل کے سامنے رکھا ہے۔ ہندوستان کے ان تمام خصوصیات کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے جس میں اماوس ہے، ہولی ہے، پیڑ پودے ہیں، دادی اماں، نانی کی کہانی ہے، ملنگ ملہار اور سوندھی سوندھی بولیاں بھی ہیں۔

شہریار:

شہر یار کی ولادت 16 جون 1936 کو یوپی کے ضلع بریلی میں ہوئی۔ان کا اصل نام کنور محمد اخلاق خاں تھا ان کی وفات 13 فروری 2012 کو ہوئی۔اب تک ان کے جو شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں ان میں ’اسم اعظم‘، ’ساتواں در‘، ’ہجر کے موسم‘، ’خواب کا در بند ہے‘، ’’نیند کی کرچیں‘‘ قابل ذکر ہیں۔شہر یار نے جس وقت اپنی شاعری کا آغاز کیا اس وقت تقسیم ہند کا المیہ اور اس کا سانحہ ہر طرف خون اگل رہا تھا۔ سیاسی اور سماجی حالات بدل چکے تھے۔اس اعتبار سے شعر و ادب کے منظر نامے میں بھی تبدیلی آچکی تھی تو ضروری تھا کہ شاعر اس سے دور نہ جائے۔شہر یار نے بھی ان چیزوں کو اپنی شاعری میں بروئے کار لایا ہے۔

اس کے علاوہ زمانے کی بے حسی اور بے چینی و بے چہرگی کو شہریار نے آج کی حسیاتی فکر و فن کے ساتھ پیش کیا ہے۔ نیچے لکھے گئے چند اشعار اس بات پر دال ہیں:

سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے
دل ہے تو دھڑکنے کا بہانہ کوئی ڈھونڈے
پتھر کی طرح بے حس و بے جاں سا کیوں ہے
سارے چراغ بجھ گئے سب نقش مٹ گئے
پھر بھی سفر حیات کا جاری ہے کیا کروں

آج کا انسان ایک ایسے ذہنی اضطراب میں مبتلا ہے اب کوئی شئے ویسی نظر نہیں آتی جیسے پہلے نظر آتی تھی۔ خوشی و غم، کامرانی و ناکامی، وصل و فراق اب کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ ہر چہار جانب عجیب و غریب کشمکش ہے جسے ہم بے حسی کہہ سکتے ہیں۔ ان تمام چیزوں کو شہریار نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے شہریار کی شاعری میں خواب، آگہی، وقت اور مدت بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ شہریار کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک متوازن قاری اس بات پر اپنے ذہن کے دروازے کو کھولے گا کہ شہریار کو آج کے دور کے زندگی گزارنے کے طور طریقے بہت دکھ دے رہے ہیں جس میں انسان اپنے آپ کو دکھ اور غم میں تنہا پاتا ہے اور انسان بھیڑ میں رہ کر بھی تنہائی کا شکار ہے۔

سینہ بختوں کو روشنی بانٹتی تھی
جو تنہائی کی کھائی کو پاٹتی تھی
اس آواز کو بھی ہوا کھا گئی ہے
قیامت بہت ہی قریب آ گئی ہے

ان اشعار میں شاعر اپنے زمانہ کے حالات، ماحول اور فضا کی بے زاری، جو حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے اور ایک مرض کی حیثیت اختیار کر چکی ہے ان کو سب پیش کیا ہے جس میں صرف مایوسی و محرومی ہے یہ شاعر

کا صرف تلخ لہجہ ہی نہیں بلکہ حالات کا تجزیہ ہے شہر یار نے سماج کی ان تمام چیزوں کو بحسن خوبی شاعری میں پرویا ہے۔

زندگی جیسی توقع تھی نہیں، کچھ کم ہے
ہر گھڑی ہوتاہے احساس کہیں کچھ کم ہے
گھر کی تعمیر تصور ہی میں ہوسکتی ہے
اپنے نقشے کے مطابق یہ زمین کچھ کم ہے

شہر یار نے ان اشعار میں زمانے کی حقیقی تصویر کھینچی ہے کہ آج ہر انسان اپنی زندگی میں کسی نہ کسی کمی کا احساس ضرور کرتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ میں کیا سے کیا حاصل کرلوں جس بنا پر اس میں کمی باقی رہتی ہے آج حرص ولالچ اتنی بڑھ گئی کہ قناعت مر چکی ہے۔اسی طرح یعقوب یاور نے زمانے کی قتل وغارت ،ظلم و ستم ،استحصال،حرص ولالچ کو اپنی شاعری میں قلم بند کیا ہے۔

زخم ہی زخم بدن پر ہیں دوابھی چپ ہے
ہم پہ وہ وقت پڑا ہے کہ خدا بھی چپ ہے
گھر میں جلتاتھا تو آندھی سے رہا خوف زدہ
اب سرِ راہ گزر ہوں تو ہوابھی چپ ہے
لمحہ لمحہ مرے اندر کوئی مرتا ہے مگر
میں بھی چپ ہوں مری محدود فضا بھی چپ ہے
اتنے دریا ہیں مگر مائی بے آب ہوں میں
سر بہ زانو ہے سلیمان سبا بھی چپ ہے

یعقوب یاور سماج میں ہورہے ظلم وستم سے تنگ آکر جذباتی انداز میں یہ اشعار کہنے پر مجبور ہیں کہ ہم پر جب وقت پڑتا ہے تو خدا بھی چپ ہے۔زمانے کی وحشیانہ سلوک،ظلم و بربریت ، بھائی چارگی اور ہمدردی کا فقدان اس اشعار میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

محمد علوی:

محمد علوی کی پیدائش احمد آباد گجرات میں 10 اپریل 1927 کو ہوئی۔آزادی کے بعد بہت سے شعراء نے اپنا لوہا منوایا ہے ان میں ایک نام محمد علوی کا بھی ہے۔ان کی وفات 29 جولائی 2018 کو احمد آباد گجرات میں ہوئی۔ان کے چار شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ان کی پہلی شعری تصنیف ''خالی مکان'' 1963 میں دوسرا مجموعہ ''آخری دن کی تلاش'' 1968 میں تیسرا مجموعہ ''چوتھا آسمان'' 1991 میں لوگوں کے درمیان آیا۔1995 میں اردو ساہتیہ اکادمی گجرات نے ان کی کلیات ''رات ادھر ادھر روشن'' شائع کروایا۔اس کلیات میں جہاں ان کے شعری مجموعے شامل ہیں وہیں ان کے غیر مطبوعہ کلام بھی شامل ہے۔

نظم، غزل دونوں اصناف پر محمد علوی نے قلم اٹھایا ہے۔دونوں اصناف میں وہ کامیاب بھی ہیں ان کی شاعری کی تین جہتیں ہیں۔پہلے میں انھوں نے عالم فطرت کو شاعری بنایا ہے دوسرے میں معاصرتی ماحول سے اخذ مسائل کو اور تیسرے میں دونوں جہت کو جوڑ کر شاعری بنایا ہے۔انھوں نے اپنی شاعری میں شہر، قصبے، گاؤں، دیہات کے منظرنامے کو پیش کیا ہے۔

یونہی اڑتے نہیں آبی پرندے
کہیں نزدیک ہی بہتا ہے پانی
اندھیرا ہونے سے پہلے پرندے آئیں گے
اجالا ہونے سے پہلے ہی جاگ اٹھوں گا میں
جنگل جنگل ایک پرندہ روئے گا
بستی میں آنے کو پر نہیں کھولے گا
ایک پرندہ دیر سے بیٹھا ہے ننگی شاخ پر
پیڑ کے چاروں طرف میدان ہی میدان ہے
دور تک بے کار سی اک دوپہر
اک پرندہ بے سبب اڑتا ہوا

اس میں پرندے کی کیفیت اور فطری مناظر کو محمد علوی نے پیش کیا ہے۔ یہ ایک طرح سے نئے شعر ضرور ہیں لیکن ان کا نیا پن ایک حد تک بناوٹی بھی ہے پرندے کو علامت بنا کر ضرور پیش کیا ہے لیکن اس کے ساتھ بہت سوال ذہن میں ابھرتے ہیں جو عام قاری شاید نہ سمجھ سکے لیکن اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو اس شعر میں بھی کہیں نہ کہیں شاعر نے اپنے زمانے کی بے حسی اور حیوانیت کو دبے اور مضمر انداز میں پیش کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ایک پرندہ جنگل میں گرچہ روتا ہے لیکن انسانوں کی بستی میں نہیں آنا چاہتا۔ کیوں کہ اسے معلوم ہے کہ اس جنگل سے بڑا جنگل انسانوں کی بستی ہے جہاں ہر کوئی ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے۔ درمیانی متوسط طبقہ کے لوگوں کی تہذیب و ثقافت کے اچھے نمونے علوی کی شاعری میں موجود ہیں جس کو ہم مندرجہ ذیل اشعار میں دیکھ سکتے ہیں:

رہ سمجھاتی تھی اندھیری گلیاں
لوگ پہچانے ہوئے لگتے تھے

اس سے ہاتھ ملا کر جی کب بھرتا ہے
ہاتھوں پہ اس کے دستانے ہوتے ہیں

وہ میرے پاس آتا ہے لیکن اس نے
اور کسی کو خط لکھوانے ہوتے ہیں

حنائی ہاتھ دروازے سے باہر
اور اس میں چوڑیاں اچھی لگتی ہیں

پہلے شعر میں شاعر نے اس طرف اشارہ کیا ہے جب پڑوسی، پڑوسی کو جانتا تھا سب ایک دوسرے کی عزت و احترام کرتے تھے کون کس محلے اور کس گلی کا ہے ہر کوئی جانتا تھا۔ الغرض ہر کوئی ایک دوسرے کے بارے میں بخوبی جانتا تھا آج کے معاشرے کا ایک بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ ایک بلاک یا ایک گلی کوچے کے لوگ ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔ اس شعر میں ماضی کی تہذیبی روش اور تمدنی ماحول کی عکاسی ہے جس میں اخلاقی و رشتے کی قدریں تھیں۔

یعقوب یاور کے اِن معاصرین کے بعد بنارس کے کچھ مقامی شاعروں کا ذکر کرنا مناسب ہے۔

یعقوب یاور کا تعلق یو پی کے ضلع فتح پور سے ہے لیکن وہ مختلف شہروں سے ہجرت کر کے بنارس کی سرزمین پر بس گئے ہیں اس لیے کچھ ناقدوں نے ان کو بنارس کے شاعروں میں شامل کیا ہے۔زبیر احمد قادری کی کتاب ''شعرائے بنارس کا تعارف وتبصرہ''میں بنارسی شعراء کے ساتھ یعقوب یاور کا نام بھی ہے۔

محضرؔ بنارسی:

محضر بنارسی کی پیدائش 1928 کو مالتی باغ، مدن پورہ بنارس میں ہوئی۔ان کا اصل نام عبدالقیوم تھا،تخلص محضر تھا،ان کے والد کا نام امین محمد تھا۔محضر کی ابتدائی تعلیم مدرسے سے ہوئی جب وہ دس سال کے تھے تو مدرسے میں داخل کرایا گیا مگر بہت ہی جلد ان کو پیشہ بنکاری میں لگا دیا گیا۔انھیں مطالعے کا بہت شوق تھا۔بنکاری کے شغل سے فرصت پاتے ہی مطالعے میں مشغول ہو جاتے تھے۔اورانھیں ناولوں کے مطالعہ کا بہت شوق تھا۔شاعری میں انھوں نے مسلم الحریری کو اپنا استاد بنایا اوران سے شعر کے بارے میں کچھ جانا سمجھا اور پھر شعر کہنے لگے تھے۔ان کے وقت میں مدن پورہ میں جو بھی مشاعرہ ہوتا تھا اس میں ان کی شرکت لازمی ہوتی تھی۔ابتدا سے محضر کا رجحان صرف غزلوں اور نعت کی جانب تھا۔ان کے کچھ اشعار نمونے کے طور پر ملاحظہ ہوں:

برق تپاں نے ان دنوں ڈھایا ہے مجھ پہ وہ ستم
میری چمن کی رونقیں ساری اجڑ اجڑ گئیں
آنکھوں سے نیند اڑ گئیں دل کا سکوں چھن گیا
دو دو شریک زندگی مجھ سے بچھڑ بچھڑ گئیں

محضر نے اپنی دو رفیقۂ حیات سے جدائی کے صدمے میں یہ اشعار کہے ہیں۔ان دونوں سے بچھڑ نے کے بعد ان کی زندگی کے چمن سے تمام رونقیں اجڑ گئیں اور ساتھ ہی ساتھ آنکھوں سے نینداور دل کا چین وسکون سب جاتا رہا۔اپنی اسی تنہائی کے کرب اور حزن کے درد کا بیان کیا ہے۔ان کا کوئی بھی مجموعہ کلام منظر عام پر نہیں آیا۔ان کی غزل کے چند اشعار بطور مثال کے ملاحظہ ہو:

راہیں جو ہر خطر ہیں تو منزل ہے بے نشاں
تارے بھی ہیں بجھے بجھے مہتاب بھی نہیں
جس میں بہ جز گناہ کے کچھ نیکیاں بھی ہوں
ایسا کتاب زیست کا اک باب بھی نہیں
محضؔر میرے چمن کی نرالی ہے کیفیت
ہے مرکز بہار بھی شاداب بھی نہیں

شورش بنارسی:

بنارس کے مشہور شاعروں میں شورش بنارسی کا شمار ہوتا ہے۔ یہ 1937 کو بنارس کے محلّہ مدن پورہ میں پیدا ہوئے اور 2015 میں ان کا انتقال ہوا۔ شورش بنارسی بچپن سے ہی شعر کہنے لگے تھے، کیوں کہ ان کا میلان شاعری کی طرف فطری تھا۔ ابتدا میں گیت لکھتے تھے اور اسے مشاعروں میں ترنم کے ساتھ سناتے تھے۔ ان کی غزلوں کا صرف ایک مجموعہ ''لفظوں کا سفر'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ان کی شاعری میں عشقیہ موضوعات کے ساتھ زمانے کے حالات ومسائل موجود ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

راہ دیکھے نظر تیری شام و سحر
دل کو آئے نہ اک پل قرار اب تو جا
میری جان جگر تجھ پہ لعل و گوہر
کردوں سب کچھ نثار اب تو آجا
حسرتِ دید کی موت آئی نہیں
زندگی کی ادا دل کو بھائی نہیں
اک تو تنہائیاں اور یہ رسوائیاں
اک دل اور غم بے شمار اب تو آجا
وہ آئیں گے وہ آئیں گے
جب چاندنی بڑھ کر چھائے گی

پھولوں پہ جوانی آئے گی
ایسے میں تبسم فرمائے
وہ آئیں گے وہ آئیں گے

وسیم حیدر ہاشمی:

وسیم حیدر ہاشمی 2 جولائی 1955 کو جون پور میں پیدا ہوئے۔لیکن بعد میں وہ بنارس آ کر سکونت اختیار کر لی۔انھوں نے اردو سے ایم۔اے کرنے کے بعد بنارس ہندو یونی ورسٹی میں ملازمت اختیار کی۔وہ شاعری کے ساتھ افسانے بھی لکھے ہیں۔ان کے افسانوں کے کئی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ان میں پہلا ''کرچیاں'' 2007 میں دوسرا افسانوی مجموعہ ''مریخ کا سفر'' 2010 میں اور تیسرا مجموعہ ''گوہر لیس انداز'' 2015 میں۔اس کے علاوہ ان کے ترجمے وتصانیف بھی ہیں۔عبداللہ کے ناول ''جھینی جھینی بینی رے چدریا'' کا اردو ترجمہ 1993 میں کیا۔''رسائی ادب کے چند پہلو'' 2013 میں مضامین ہاشمی 2014 میں اور 2016 میں ''ڈاکٹر جعفر حیات اور شاعری'' کے نام سے ان کی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ملکی اور غیر ملکی رسالوں میں بھی ان کے مضامین اور اشعار شائع ہوتے رہے ہیں۔

نذیر بنارسی:

نذیر بنارسی کا اصل نام نذیر احمد اور تخلّص نذیر تھا۔ان کی ولادت بنارس کے محلّہ مدن پورہ میں 1909 کو ہوئی۔اور وفات 1996 کو بنارس میں ہوئی۔نذیر بنارسی کے چھ مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ان کے پہلے مجموعہ کلام کا نام ''گنگ وجمن'' ہے۔یہ مجموعہ اپریل 1959 میں شائع ہوا۔اسے مدن پورہ بنارس سے غالب اکیڈمی نے شائع کیا۔یہ مجموعہ نظموں،غزلوں،قطعات اور رباعیات پر مشتمل ہے۔اس پر اتر پردیش حکومت نے نذیر بنارسی کو انعام سے نوازا۔ان کا دوسرا مجموعہ ''جواہر سے لال تک'' 1967 میں شائع ہوا۔جس کو علمی الیکٹرک مشین پریس بنارس نے اردو اور ہندی میں شائع کیا۔اس میں نظموں اور گیتوں کے ساتھ رباعیات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔نذیر کے تیسرے مجموعہ کلام کا نام ''غلامی سے آزادی تک'' ہے۔

ان کے اس مجموعے کو انفارمیشن ڈپارٹمنٹ اتر پردیش نے آزادی کے سلور جبلی کے موقع پر شائع کیا جو نظموں پر مشتمل ہے۔ اس پر بھی یو پی حکومت کی طرف سے انعام دیا گیا۔ ''چتنا کے سور'' نذیر بنارسی کا چوتھا مجموعہ ہے۔ اس کتاب پر بھی یو پی حکومت نے ان کو انعام سے نوازا۔ ان کا یہ کلام صرف دیوناگری رسم الخط میں موجود ہے۔ ان کے پانچویں مجموعہ کا نام ''کتاب غزل'' ہے۔ یہ 1982 میں شائع ہوا۔ یہ غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اس پر بھی اتر پردیش حکومت نے ان کو انعام سے نوازا۔ ''راشٹر کی امانت کے حوالے'' نذیر بنارسی کا آخری مجموعہ کلام ہے۔ یہ 1992 میں شائع ہوا۔ اسے بابو گل موہن داس شاہ چیریٹیبل ٹرسٹ، بنارس نے شائع کیا۔ اس میں نظموں، غزلوں کے ساتھ قطعات کو بھی شامل کیا گیا۔ یہ بھی دیوناگری رسم الخط میں موجود ہے۔ بطور مثال ان کی شاعری کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اگر ظالم پہ خنجر آزما لیتے تو اچھا تھا
لہو میں ڈوب کر بیڑا بچا لیتے تو اچھا تھا
ہمارے دیش کے دامن پہ دھبہ ہے غلامی کا
یہ دھبہ خوں بہا کر بھی چھڑا لیتے تو اچھا تھا

ان اشعار میں نذیر بنارسی کے فکر و فن کے ساتھ ان کے حب الوطنی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کے بارے میں فراق گورکھپوری لکھتے ہیں:

> ''نذیر بنارسی کا حب وطن اتنا تربیت یافتہ جذبہ ہے جس پر محبان وطن کو رشک ہوگا یہ سعادت خاموش روحانی ریاضت سے پیدا ہوتی ہے۔ حقیقی شاعری کا راز خلوص شعور میں پنہاں ہے۔ اور اس امر میں جو کامیابی نذیر بنارسی کو حاصل ہوئی ہے۔ وہ بہت کم شاعروں کے پلے پڑی ہے۔ نذیر بنارسی نے بھارت کی دھرتی کے سنگیت کی آواز میں اپنی آواز ملا دی ہے۔''3

نذیر بنارسی اردو کے ان شعرا میں سے ایک ہیں جنھوں نے شاعری کے کئی ادوار دیکھے ہیں۔ ان کی شاعری میں متنوع موضوعات پائے جاتے ہیں۔ عصری مسائل، عشقیہ بیان، حب الوطنی ان کی شاعری میں

جگہ جگہ ملتی ہیں۔

راشد بنارسی:

ان کا اصل نام عبدالحیٔ اور قلمی نام راشد بنارسی وتخلص راشدؔ تھا۔ان کی ولادت 1925 میں مدن پورہ بنارس میں ہوئی اوران کی وفات 2014 کو ہوئی۔راشد بنارسی مسلم الحریری کے شاگرد تھے۔راشد بنارسی نیک اورشریف انسان تھےان کے گھر کا ماحول خوش گوارنہیں تھالیکن محنت کی روٹی کھا کرعلم وادب کی خدمت کرتے رہےاورغیرت وخودداری کی زندگی گزارتے رہے۔وہ اسپتال میں ملازمت کرتے تھے اورایک ملنساراورخوش مزاج طبیعت کے مالک تھےرفاہی کاموں میں بڑھ چڑھ کرحصہ لیتے تھے۔ان کا پہلا شعری مجموعہ ''سبزوسرخ'' کےنام سےشائع ہوا۔ان کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

تیری یادوں سے زخمی ہوگئی ہیں خلوتیں میری
لہو سے تر ہے تنہائی کی چادر کیا کیا جائے

--

بنام رحمت اسی کا چرچا ہوا صورت بدل بدل کر
وہ ایک عنواں جو ذہن قدرت میں تھا نہاں داستاں سے پہلے

ناطق بنارسی:

ان کا اصل نام عبدالحق اورتخلص ناطقؔ تھا۔یہ محلّہ مدن پورہ بنارس کے رہنے والے تھے۔ان کی پیدائش 1926 میں اوروفات 1991 میں ہوئی۔معاشی تنگی کی بناپرناطق بنارسی کوان کے والدین نے بچپن ہی سے تانے بانے کی گھتی سلجھانے کی راہ پرلگادیا۔اپنے ذاتی مطالعے اور ماحول سے استفادہ کی بنیاد پر وہ شاعری کرنے لگے۔علمی وادبی بیٹھک کی دلچسپی کی بناپران کی شاعری میں پختگی آگئی تھی۔اشتراکی ومارکسی نظریات کے حامل تھےساتھ ہی اسلامی اقدارکی پاسداری ان کی زندگی میں مکمل طور سے رچی بسی تھی۔ان کا ایک شعر بطورنمونہ ملاحظہ ہو:

شہرِ صنم میں آج بھی رہنے کے باوجود
شکر خدا کے صاحبِ ایما رہا ہوں میں

☆☆☆☆☆

(ب) موضوع ومسائل

یعقوب یاور نے اپنی شاعری میں جن چیزوں کو موضوع بنایا ہے اس میں زمانے کی تبدیلی کے ساتھ میڈیا اور مشینی دور کے منفی اثرات، تہذیب وتمدن کی گراوٹ، انسانی ہمدردی کا زوال اور حکومت کا مظلوموں کے ساتھ ناانصافی اور ظلم و جبر رشتے کی پامالی، عصمت دری، رشوت خوری، بے چینی، تنہائی وغیرہ ہیں۔ یعقوب یاور کا پہلا مجموعہ ''الف'' پہلی بار جون 1988 میں شائع ہوا۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں نئی تہذیب کی شکایت کے ساتھ قوم وملت کا درد ہے۔ قوم وسماج کی بدحالی اور بدتہذیبی سے وہ بے چین سے لگتے ہیں۔ انھوں نے ان خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے جہاں دوسرے اصناف کا سہارا لیا ہے وہیں شاعری کے ذریعے بھی ان چیزوں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

یعقوب یاور کی شاعری ادبیت سے بھی جڑی ہوئی ہے اور کچھ اکھڑی اکھڑی سی بھی ہے۔ یعقوب یاور ان مخلص شاعروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے غزل کے فن اور جمالیات کا احترام کیا ہے اور سماج کی باتوں کو شاعری کی فنیت کو پورا کرتے ہوئے شیریں الفاظ کے ساتھ لوگوں کے سامنے لایا ہے۔ یعقوب یاور نے اپنے پہلے مجموعے کی شروعات دوسرے شعراء کی طرح مذہبی عقیدے کی بنا پر نعت سے کیا ہے اور بہترین انداز میں نعت کے اوصاف ان کے مجموعے میں موجود ہے جس میں انھوں نے رسول محمدﷺ کی تعریف اور ان کے اوصاف کو بیان کیا ہے۔

پھولوں میں بس گیا محمدؐ
گلشن بادصبا محمدؐ

عصیاں کی کالی دنیا میں
دھوپ بنا کھل گیا محمدؐ
انا اعطینک الکوثر
کوثر کار رہنما محمدؐ
جس کو خواہش خوش وقتی تھی
خوشبو سا آگیا محمدؐ

اس نعت میں یعقوب یاور نے نبی محمدﷺ کی اوصافِ حمیدہ کے ذکر کے ساتھ ان کی بعثت کے مقصد کو اجاگر کیا ہے اور اچھے انداز میں انھوں نے نبی محمدﷺ کے معجزہ کا بھی بیان کیا ہے۔ان کے اس نعتیہ شاعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو نبیﷺ سے بے حد عقیدت اور محبت ہے۔شاعر حساس ہوتا ہے اور وہ اپنے اردگرد ہورہے واقعات وحادثات پر گہری نظر رکھتا ہے اور اسے اپنے تخیلات میں ضرور بساتا ہے چاہے وہ غربت کی زندگی ہو یا زمانے کی بے حسی وغیرہ۔

کسی اجڑے ہوئے گھر میں کوئی مہمان بے معنیٰ
رگوں میں خوں نہ ہو تو جسم میں ہیجان بے معنیٰ
زمانہ ابرہہ ہے کعبۂ دل توڑ جائے گا
ابابیلوں کے لشکر کا کوئی امکان بے معنیٰ
میں اپنی بے ضمیری پر نہ خوش ہوں اور نہ شرمندہ
مری بے چہرگی بس دیکھ لو پہچان بے معنیٰ
کہاں یاؔور کہاں عشرت کدے کا خواب دل خوش کن
یہاں سب فلسفے سب منطقیں بے جان بے معنی

شاعر نے پہلے مصرع میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اگر غربت زدہ گھر ہے تو اس میں خوشی نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی ہے۔جس طرح سے وہ جسم جس میں خون نہ ہو اور اس کا چلنا پھرنا محال ہو تو وہ جسم بے کار ہوتا ہے زمانے پر شاعر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے کہ انسان اس قدر گر چکا ہے کہ آج طاقت ور انسان غریب و

لاچار کا استحصال اس طرح سے کرتا ہے کہ ان کے گھر خوشی اور سرور نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ دوسرے شعر میں انھوں نے تلمیح کے ذریعے یہ بتایا ہے کہ آج کے دور کا انسان ابرہہ بن چکا ہے اور ہر کوئی ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے اور بے گناہ کو ستانے میں لگا ہے۔ تیسرے شعر میں انھوں نے عصر حاضر میں انسانوں کے اندر سے محبت، ملن ساری، مفقود ہو جانے کی وجہ سے جو تنہائی اور بے چہرگی ہے اس کو بیان کیا ہے۔

وہ ہے کہ گیت محبت کے گارہاہے میاں
زمانہ اور ہی نغمے سنارہاہے میاں
میں خالی جیب کا غم لے کے قید ہوں گھر میں
سڑک پہ کوئی لٹیرا بلارہاہے میاں
زمیں نے پاؤں میں زنجیر ڈال رکھی ہے
اور آسمان الگ جان کھارہاہے میاں
ہے آج جینے نہ جینے کا فیصلہ مشکل
وہ کھوگیا ہے جو کل تک خدارہاہے میاں

شاعر نے عصری دور کے مسائل نیز انسان کی زندگی سے محبت کے غائب ہو جانے کا ذکر کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اگر کوئی اس زمانے میں سماج کو بہتر بنانے کی بات کرتا ہے تو اہل زمانہ اس کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ حرص و ہوس سے بھری اس دنیا میں اگر کوئی محبت یا بھائی چارگی کو عام کرنا چاہتا ہے تو زمانے کو وہ راس نہیں آتا ہے۔ یعقوب یاور نے زمانے کی شکوہ شکایت کے ساتھ جابر و ظالم کے اوصاف کو اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔

غرور بد خصال انکسار کیسے ہوگیا
یہ سنگ رہ گزار آب دار کیسے ہوگیا
بھنور کے گرد، سطح آب، کشتیوں کا بانکپن
سمندری ہوا کا اشتہار کیسے ہوگیا
ببول سبز، خار پیرہن میں مست چار سو

جنوں شکار مرددشت پار کیسے ہوگیا

شاعر نے لطیف انداز اپناتے ہوئے صنعت تضاد کے ذریعے سے زمانے میں پھیلی ہوئی برائی جیسے غرور، گھمنڈ، کی حقیقت کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے کہ جس میں غرور جیسی بری عادت ہو اس میں انکساری نہیں آسکتی ہے اور انھوں نے زمانے میں پھیلی ہوئی ناخوش گوار تبدیلیوں کو ان اشعار کے ذریعے سے واضح کیا ہے۔اس طرح کی تراکیب کا دوسرے شاعروں نے کم ہی استعمال کیا ہے لیکن یعقوب یاور نے غرور بدخصال کے ساتھ انکسار کا اور سنگ رہ گزار کے ساتھ آبدار کا بہترین طریقے سے استعمال کیا ہے۔زمانے میں جس طرح سے ناانصافی اور ہر انسان کے اندر کم وقت میں سب کچھ حاصل کرنے کی آرزو، دولت کی چمک دمک اور اس کے خاطر تمام انسان کا اچھا برا نہ دیکھنا چاہے وہ نیچے طبقے کا ہو یا اوپر چاہے وہ ظالم ہو یا منصف، چاہے چور ہو یا امین اچھا ہو یا برا یہاں ہر کوئی کسی نہ کسی طریقے سے ہوس کا شکار ہے اور ظلم و جبر کا قائل بھی ہے۔

زباں لکنت زدہ اظہار ننگا
ملاحمام میں ہر یار ننگا
صحیفوں کی نمائش کررہا ہے
فریبی راہ زن غدار ننگا
قلم کچھ کھردرا کاغذ سنہرا
لکھا تو ہوگیا کردار ننگا
مری ننگِ زمانہ خواہشوں نے
کیا مجھ کو سر بازار ننگا

یعقوب یاور کو نئی تہذیب اور مشینی دور کی ضرر رساں چیزیں بہت ستاتی ہیں جس میں انسان کی ناقدری وقت کی تیز رفتاری کے سبب انسان سے انسان کی دوری ہوئی ہے۔انھیں اس تہذیب سے شکایت ہے اس کا اظہار انھوں نے اپنی شاعری میں کیا ہے اور اس تہذیب کو ماضی کی وراثت کو کھا جانے والی تہذیب

بتائی ہے۔جس کواشارہ اور کنایہ سے انھوں نے مندرجہ ذیل اشعار میں بیان کیا ہے۔

کرے گی دھوپ سے جب پیار پگلی
گراڈالے گی ہر دیوار پگلی
نئی تہذیب اس کے پیٹ میں ہے
نہ بے غیرت نہ غیرت دار پگلی
بڑی رسمی ہوائیں چل رہی ہیں
ذرا ماحول پر اک وار پگلی

سائنس اور ٹکنالوجی کے ذریعے سے انسان اس دنیا سے دوسری دنیا تک پہنچ چکا ہے۔ چاند پر کمندیں ڈال چکا ہے ہر میدان میں اپنی ذہنی ارتقا اور صلاحیت سے ترقی کے مراحل کو طے کرلیا ہے لیکن اس ترقی یافتہ دور میں بہت سارے لوگوں پر ظلم وستم کے پہاڑ بھی ٹوٹے ہیں چاہے وہ رشتے کے حوالے سے ہو یا پھر نئے زمانے میں سرمایہ داری کے ذریعے،جس کی بنا پر بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کو آئے دن آنسوں بہانے پڑتے ہیں۔اس چیز کی عکاسی یعقوب یاور نے اپنی شاعری میں اس طرح سے کیا ہے۔

قدم خلا پہ رکھ کے کامیابیوں میں کھوگیا
یہ ارتقا نہ جانے کتنی دستیاں بھگوگیا
حصار میرے جسم کی نمی کو جو ستارہا
خیال اڑتے بادلوں کا ذہن میں تھا سوگیا

ادب اپنے دور اور حالات کی ایجاد ہے۔خوشحالی،غم،سیاسی پیچ وخم،انسانی افراتفری کے زیر اثر نئے اور اجنبی شیڈس کے درمیان ادبی تخلیقات وجود میں آتے ہیں اور سماج وحالات کے پیٹ ہی سے جنم لیتے ہیں۔زمانے کے ہر عشرہ میں کچھ نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کے درمیان جن ادیبوں اور فنکاروں نے اپنی ادبی تخلیقات کو منظر عام پر لایا اس وقت ان کے سامنے جو اہم مسئلے تھے ایک تو بے روزگاری اور بے روزگاری کے سبب ہونے والے جرائم،دوئم بابری مسجد کا تنازعہ اور فسادوں کا منظر،وقت کی

تیز رفتاری مشینی زندگی، کم وقت میں سب کچھ حاصل کرنے کی آرزو، وانسانیت ہمدردی کا فقدان، مدد ومروت کا اختتام۔ انہی چیزوں کو اس دہائی کے شاعروں نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ اپنے ہم عصر شاعروں کی طرح یعقوب یاور نے بھی اپنی شاعری میں ان چیزوں کو جگہ دی ہے۔

زخم ہی زخم بدن پر ہیں دوا بھی چپ ہے
ہم پہ یہ وقت پڑا ہے کہ خدا بھی چپ ہے
گھر میں جلتا تھا تو آندھی سے رہا خوف زدہ
اب سرِ راہ گزر ہوں تو ہوا بھی چپ ہے
لمحہ لمحہ مرے اندر کوئی مرتا ہے مگر
میں بھی چپ ہوں مری محدود فضا بھی چپ ہے

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یعقوب یاور نے موجودہ دور میں واقع ہونے والے حادثات اور ان کے سبب وجود میں آنے والے، جرائم، خودغرضی، دھوکہ دھڑی، بے ایمانی، رشوت ستانی وغیرہ کو اپنی شاعری میں تکرار کے ساتھ لکھا ہے اس زمانے کے دکھ و پریشانی کو وہ لاعلاج سا دیکھ رہے ہیں اور بتایا ہے کہ آج انسان کے اندر سے انسانیت ختم ہو چکی ہے کمزور و مظلوم پر ظلم وستم کیے جا رہے ہیں۔

وہ بیٹھے ہیں لہو انساں کا پی کے
لبادے اوڑھ کر سنجیدگی کے
صنم خانوں سے دشت آرزو تک
ہزاروں نقش پائے آزری کے

اس میں آج کے دور کے انسانوں کی عیاری و چالبازی کو دکھایا گیا ہے کہ آج انسان خود ہی انسانی زندگی کو تباہ کر رہا ہے اور اس کے لیے الگ الگ طریقے اور حربے استعمال کرتا ہے۔ جس سے دوسرا انسان لاچاری اور بے بسی کا شکار ہو جاتا ہے اور خود کو انسان کے ذریعے سے کیے گئے ظلم سے نہیں بچا پاتا ہے۔

پروفیسر عنوان چشتی یعقوب یاور کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یعقوب یاور کی شاعری بیک وقت روایت سے انحراف بھی کرتی ہے اور اس کی

پاسداری بھی ہے یہ دو سرکش گھوڑوں پر ایک ساتھ سواری کرنے جیسا خطرناک عمل ہے۔ لیکن جب فنکار ایسے خطروں سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ نظر آئے تو نہ چاہتے ہوئے بھی لوگوں کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو جاتی ہیں اور دوست تو خیر دوست ہوتے ہیں باضمیر دشمن اسے داد سے نوازنے پر مجبور ہوتا ہے۔'' 4

یعقوب یاور کی شاعری میں فکر و احساس کی نئی جہتیں ملتی ہیں۔ جس سے ان میں ندرت اور تازگی کے ساتھ ان کی ذہنی وسعت اور سماج کی باریک بینی کا پتا چلتا ہے۔ مندرجہ ذیل سطروں میں یعقوب یاور کے کچھ ایسے اشعار ہیں جس کے اندر ان کی ذہنی تصادم موجود ہے:

ہر لمحہ امکان حوادث پھر بھی گھر اچھا لگتا ہے
شیشے کے شوکیس میں بیٹھا آہن گر اچھا لگتا ہے
میری دنیا کو بے سر کا دانش ور اچھا لگتا ہے
مجھ کو بھی اپنے ہاتھ میں اپنا سر اچھا لگتا ہے
تنہائی کی جنت سے جی اوب گیا اس کے بدلے میں
بھانت بھانت کے انسانوں کا چڑیا گھر اچھا لگتا ہے

ان اشعار میں شاعر کا خوف وطنز دونوں موجود ہے۔ خوف سے زیادہ وہ زمانے کے حاکموں اور رہبروں پر طنز ہے اور ساتھ ہی بے چہرگی کی زندگی سے پریشان انسانی روداد ہے۔

لڑ کھڑاتا، کانپتا، سب کچھ لٹا کر آ گیا
صبح کا بھولا ہوا دل شام کو گھر آ گیا
مسئلوں کی دلکشی ہے ٹوٹتے سپنوں کے بعد
ہم کہ دریا پار اترے تھے سمندر آ گیا
زندگی بیمار تھی سوچا غزل میں ڈھال دوں
نبض پر انگلی کا رکھنا تھا کہ چکر آ گیا

شاعر زندگی کی اس حقیقت کو قاری کے سامنے پیش کیا ہے جو ایک امر مسلّم ہے۔ اس دور کی گھڑی کی

سوئی نے آدمی کے اندر ایسے خرمان ڈالے ہیں کہ انسان کی داخلی و خارجی زندگی مختلف قسم کے ہیجان میں مبتلا ہے یہ وقت ایسا ہے کہ اگر کسی طرح سے چین وسکون نصیب آ بھی جائے تو زمانے کے حرکات وسکنات ایسے ہیں جس سے انسان دوسرے لمحے میں کرب و بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے۔''زندگی بیمار تھی'' شاعر کے یہ الفاظ معنی سے معنویت کی طرف لے جاتے ہیں۔نبض کا انگلی پر رکھنا تھا کہ چکرآ گیا۔ یہ مصرعہ وقت کی اس تیزی کو بتاتا ہے کہ جس سے آج انسانی زندگی پوری طرح سے کھوکھلی ہو چکی ہے۔

چیخوں میں بے بسی تھی حمایت نہ کرسکے
بستی بستی کی سائیں میں ہمت نہ کرسکے
کہنے کو سرخرو ہی سچائی کی صلیب
افسوس پھر بھی سچ کی حفاظت نہ کرسکے
فردا کی فکر ننھے دماغوں کو ڈس گئی
بچے ہمارے گھر کے شرارت نہ کرسکے

مذکورہ بالا اشعار میں شاعر نے ظلم وستم کی انتہا کو دکھایا ہے کہ سماج کا ہر طبقہ اپنی ذمہ داریوں کو فراموش کر کے بے ایمانی اور ظلم وستم کی دنیا کو اختیار کر لیا ہے۔زندگی کے تقریباً تمام شعبوں میں سرمایا پرستی اور سرمایا داری دونوں کی گرفت مضبوط ہو چکی ہے یا ہوتی جارہی ہے اب نہ منظّم سماجی نظام ہے اور نہ عدلیہ کے قوانین ہی انسان کی حفاظت کے ضامن ہیں ہر آدمی خود کو اس سماجی نظام میں غیر محفوظ محسوس کر رہا ہے اور ظلم اس قدر بڑھ چکا ہے کہ مظلوم کی مدد کرنے کا راستہ بھی مسدود ہو چکا ہے۔ ساتھ ہی انسان اپنی زندگی کو سنوارنے میں اس قدر لگا ہوا ہے کہ اس کے پاس اپنے بچوں و گھر والوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ مستقبل کے سنوارنے میں انسان اس طرح لگا ہوا ہے کہ اسے اردگرد کچھ دکھائی نہیں دیتا ہے۔جس کی بنا پر بچوں کی تربیت صحیح طور پر نہیں ہو پارہی ہے۔والدین کے پیار سے آج کی اولاد محروم ہے جس کا نفسیاتی طور پر اثر انکی صحت و ذہن پر پڑتا ہے۔

ان کے اشعار کا مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے استاد شعراء کی تتبع میں بھی شاعری

کی ہے جیسے میر، غالب، اقبال، فیض اور شاد عارفی وغیرہ۔

خوابوں میں جھومتی ہوئی جنت کا کیا کریں
زخموں کی سرکشی سے طبیعت بحال ہے

......

ہر لمحہ امکانِ حوادث، پھر بھی گھر اچھا لگتا ہے
شیشے کے شوکیس میں بیٹھا آہن گر اچھا لگتا ہے

......

سحر آئی تو شب دیدہ عناصر
دروں بینِ سحر دیکھے گئے ہیں

......

میری تنگِ زمانہ خواہشوں نے
کیا مجھ کو سرِ بازار ننگا

......

زندگی بیمار تھی سوچا غزل میں ڈھال دوں
نبض پر انگلی کا رکھنا تھا کہ چکر آ گیا

اس طرح کے اشعار یعقوب یاور نے تخلیق کیے ہیں جس میں خوابوں میں جھومتی ہوئی جنت کا تذکرہ اور پھر اس سے دست برداری اور دوسرے اشعار میں شیشے کے شوکیس میں بیٹھ کر آہن گری، شب دیدہ عناصر کی سحر میں تنگ زمانہ خواہشوں کے ہاتھ سر بازار رسوائی اور بیماری زندگی کو غزل میں ڈھالنے کی کاوش پر چکر آنا اس طرح کی باتیں ہمارے بڑے شاعروں کے کلام میں موجود ہے۔ جیسے

''باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں'' (اقبال)

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام (میر)

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر (فیض)

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا (غالب)

تیری زندگی کے لیے زہر پیا ہے میں (شاد عارفی)

اس روایت کو یعقوب یاور نے بھی اپنی شاعری میں پیرو دیا ہے۔

مظفر حنفی یعقوب یاور کی شاعری کے بارے میں کچھ اس طرح سے لکھتے ہیں۔

''غزل کہنے والوں کی تازہ ترین کھیپ میں محبوب راہی شجاع خاور کے بعد یعقوب یاور نے واشگاف گفتگو، بے محابا طنز اور کھردرے طرز و بیان کے وسیلے سے شاد عارفی کی روایت کو آگے بڑھانے کی مستحسن کاوش کی ہے۔'' 5

3/دسمبر 1984 کو بھوپال میں ایک خطرناک واقعہ رونما ہوا جس کو دنیا بھوپال گیس کانڈ کے نام سے جانتی ہے۔ اس میں تقریباً 8ہزار سے زائد اموات ہوئیں اور لاکھوں لوگ کو اس سے متاثر ہوئے یعقوب یاور نے بھوپال گیس المیہ سے متاثر ہو کر مندرجہ ذیل اشعار لکھے ہیں:

قابل دید تھی بے بسی دکھ سے لپٹی خوشی رو پڑی

ارتقاء کی بھیانک گھٹا لو مرے شہر تک آگئی

پتھروں میں اگائیں کنول ریت میں چل پڑی سے ندی

زہر کا رقص سر پر مرے اک قیامت کی تمہیدسی

موسموں کے خدا ہم ہوئے سونی سونی ہوئی ہر گلی

آسماں کے ستائے تھے ہم اب زمیں سر سے اوپر اٹھی

ان اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یعقوب یاور اپنے گرد و بیش میں ہو رہے واقعات سے بے حد متاثر ہیں اور نئے زمانے کی ارتقاء سے جو تباہی و بربادی آئی ہے اس پہ وہ ناراض و غصہ ہیں ان تمام چیزوں کو وہ جگہ جگہ اپنی شاعری میں بیان کرتے ہیں۔ نئے دور کی ارتقا کے منفی اثرات پر ان کے کچھ اشعار اس طرح سے ہیں:

ریل میں دلچسپ منظر رہ گیا گھر کا سب سامان باہر رہ گیا

ارتقاء تیرے قدم رکتے نہیں میں سمٹ کر اپنے اندر رہ گیا
پھر ہے نخشب میں طلوع ماہ نو میرا گھر تاریک ہوکر رہ گیا

ان اشعار میں موضوعاتی سطح پر یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ آج انسان جتنا بھی ترقی کر لے اور وہ ترقی کرتے ہوئے بھلے ہی تھکے نا، پر اس کے نصیب میں تنہائی و بے چینی ہی ہے۔ درج بالا اشعار میں ایک لفظ ''نخشب'' مکتوب ہے جو ایک ترکسان نام کا شہر ہے جہاں حکیم عطا ابن مقنع جادوگر نے اپنے جادو سے چاند نکالا تھا (ایسا عام لوگوں کا خیال ہے) یعقوب یاور خوشیوں بھری گاؤں دیہات کی زندگی کو تمام پہلوؤں کے ساتھ اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔

دیہاتوں کی کھیلی تھی دلہن نئی نویلی تھی
اونچا اٹھا پرکھتا کون گھر کے پاس حویلی تھی
چنچل نینا من کو مل نار بڑی البیلی تھی
رات کی رانی روٹھ گئی مرنے ساتھ چنبیلی تھی
دانشور سا لگتا تھا مٹھی کھلی ہتھیلی تھی
یاورؔ بچپن بھول گیا دنیا ایک پہیلی تھی

مندرجہ بالا اشعار میں شاعر نے اپنے بچپنے کی زندگی کو علامت و استعارے سے بیان کیا ہے اور بچپن کی زندگی کی معصومیت اور بھولے پن کو اجاگر کیا ہے۔ خوشی اس زندگی کا مقصد تھا اس کو یعقوب یاور نے شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

آج سماج میں خاص طور پر بڑے شہروں میں خوف، عدم تحفظ کی فضا مزید گہری ہوتی جا رہی ہے۔ مظلوم پر ظلم کی زیادتی، معصوم کا قتل عام، ناحق ستانے کا عمل یہ سارے افعال آج سماج میں عام ہو چکے ہیں۔ اس سے یعقوب یاور بے حد متاثر ہیں اس پر انھوں نے اپنے جذبات کا اظہار مندرجہ ذیل اشعار میں کچھ اس طرح سے کیا ہے:

خزینہ ذہن و فکر، حسنِ لب گہر بار مانگتا ہوں
حقیر قطرہ ہوں اور دامن میں بحر ذخار مانگتا ہوں
نہیں ہے نیرنگ ہائے عالم کی خوشنمائی سے عار مجھ کو
مگر میں کانٹوں کی ہوشمندی کے ساتھ گلزار مانگتا ہوں
مرا قلم امن و آشتی کے پیام لکھ لکھ کے تھک چکا ہے
میرے خدا میں لرزتے ہاتھوں میں پھر سے تلوار مانگتا ہوں
ترے کرم کے غرور میں خاک زاد گاں سر اٹھارہے ہیں
میں عاجزی سے ترے غضب کا حسین اظہار مانگتا ہوں

ان اشعار کو پڑھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ یعقوب یاور جہاں اپنے اکثر اشعار میں زمانے کی ترقی سے سماج میں جو نقصان آئد ہوئے ہیں اس پر وہ نالاں ہیں۔لیکن کلی طور پر ان کی شاعری صرف ان ہی چیزوں پر منحصر نہیں ہے بلکہ ان میں موضوعاتی وسعت بھی ہے۔ان کے کچھ اشعار میں جذباتی پہلو بھی دیکھے جاسکتے ہیں لیکن یہ جذبات کسی فساد یا جنگ وجدال کے متمنی نہیں ہیں بلکہ یعقوب یاور نے بڑی سلیقہ مندی سے حقیقت پر مبنی سخت باتوں کو اپنے اشعار میں پیش کیے ہیں۔بے پردگی برہنہ نمائش کے سبب ہماری تہذیب وتمدن کے چہرے مسخ ہوئے ہیں اور فحش فیشن کو بڑھاوا ملا ہے۔جسم فروشی وعصمت دری میں اضافہ ہوا ہے۔طوائف کا پیشہ کوئی نیا تو نہیں ہے مگر اس پیشے نے اب بدترین صورت اختیار کرلی ہے۔کم سن بچیاں جسم فروشی پر مامور ہیں۔لوٹ گھسوٹ، مار پیٹ، غلط کاری کا بازار گرم ہے۔قانون کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے ہر طرف تباہی عام ہے۔اس طرح ہمارا معاشرہ برائی کے جال میں پھنسا ہوا ہے۔ان تمام کو یعقوب یاور نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

ارتقا کی یہ نئی تہ داریاں
جسم اوڑھے پھر رہی ہیں ناریاں
ہر ملک ورد اناالحق میں مگن
مل گئیں ابلیس کو سرداریاں

حسن لامحدود مرکز ایک ہے
جسم کی اپنی شگوفہ کاریاں

اس طرح ان اشعار میں ارتقائی فیشن سے جو بے پردگی عام ہوئی ہے اور اس سے جو خرابیاں رونماں ہوئی ہیں اس کو یعقوب یاور نے اس طرح سے بتایا ہے کہ آج ترقی کے نام پر عورتیں اپنے آپ کو برہنہ کرتی جارہی ہیں اور اس کو اپنا حق سمجھتی ہیں اور ساتھ ہی انھوں نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ شیاطین صفت لوگ ان کے اس عمل سے بہت خوش بھی ہیں اور ان کو اپنے ہوس کا شکار بھی بناتے ہیں:

ابھی گذر گاہِ سرمدی اختلاف پر ہے
کہ فیصلہ کاروباردیں کا طواف پر ہے
روایت عشق نقطۂ انحراف پر ہے
نگاہ عشاق خطۂ زیر ناف پر ہے
کسی کے لب ہیں مگر کوئی اور بولتا ہے
کوئی نہیں ہے جواز میرے خلاف پر ہے
عمل سے خون جگر کا رشتہ سراب جیسا
یقین کا انحصار کل اعتکاف پر ہے
سفید پریوں کا سبز سایہ حریص جاں کا
مری تمنا کا ہر قدم کوہ قاف پر ہے

یعقوب یاور نے اپنی شاعری میں عشق ومحبت و مذہب کی پاکیزگی کو بڑے ہی سلیقہ مندی سے بیان کیا ہے لیکن زمانے نے جو گل کھلائے ہیں پاک کو ناپاک بنا کر وعزت کو بے عزت بنا کر ان چیزوں کو انھوں نے مندرجہ بالا اشعار میں کھلے اور بھدّے الفاظ میں پیش کیا ہے پر وہ حقیت پر مبنی ہے۔غزل میں ''کوہ قاف'' مستعمل ہے۔ایک مشہور پہاڑ ہے جو ایشائے کوچک کے شمال میں ریاست آرمینانیا میں واقع ہے یہاں کی عورتیں اپنی خوبصورتی کے لیے مشہور ہیں اس پہاڑ سے بہت سے اساطیری واقعات اردو ادب میں مشہور ہیں۔

یعقوب یاور سماج میں ہو رہے ظلم و جبر کو اپنی آواز بنائے ہیں۔ ترقی پسند شاعروں کی طرح یہ بھی شاعری کو عوام کی بات کو رکھنے کا وسیلہ مانتے ہیں۔ ان سب کے باوجود یعقوب یاور کی شاعری میں تنہائی، عشق مجازی و عشق حقیقی اور فنی جمالیات موجود ہیں۔

تیرے کوچے کا چکر آج بھی بے کار جاتا ہے بساط دل پہ کوئی اور بازی مار جاتا ہے
کوئی تو یاس کا دامن نہ چھوڑے نامرادی تک کسی تک کامرانی کی گھٹن کا بار جاتا ہے
جمال لب کشائی تیری ترغیبات کا حصہ وہ چہروں کی بلاغت پر محبت ہار جاتا ہے
یہاں اقرار پر سو مسئلے ہیں سارے لاینحل یقیں کا کارواں پھر جانب انکار جاتا ہے
میں اپنا سچ کہیں محفوظ رکھ پاتا ترے سچ سے کہ مرا سچ ہمیشہ تیرے سچ سے ہار جاتا ہے

ان اشعار کو پڑھنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یعقوب یاور نے شاعری کو صرف عوام کے مسائل کا وسیلہ ہی نہیں بنایا ہے بلکہ شاعری کے فن کو اہمیت دیتے ہوئے جمالیاتی عناصر کو اپنی شاعری میں رکھا ہے ساتھ ہی انفرادی اور وجودی زندگی، تنہائی بے چہرگی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔

اکیلے تھے تو کیا تم اپنی کوشش تیز تو کرتے فضا کے زہر میں لہجہ شکر آمیز تو کرتے
تمناؤں سے رخش عمر کو مہمیز تو کرتے نتیجہ کچھ بھی ہوتا جہد رستا خیز تو کرتے
سحر کی آرزو برحق مگر غم تو کچھ کم ہوتا اندھیرا کچھ تو چھٹتا شمع کی لو تیز تو کرتے
ہمیں خود ہی افاقے کی کوئی پروا نہ تھی ورنہ دل بیمار کا کچھ حسن سے پرہیز تو کرتے

عصرِ حاضر کی ان چیزوں سے یعقوب یاور پریشان ہیں جس میں رشتے کی پامالی کے ساتھ انسانوں کی ناقدری، مظلوموں اور بے کسوں پر زیادتی ہے۔ استحصال، بے حیائی، بے پردگی، بے چینی و بے چہرگی، فتنہ و فساد، سیاسی ریشہ دوانیاں مذہبی عصبیت، حکمرانوں کی بے حسی ان تمام چیزوں کو یعقوب یاور نے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے اور سماج کو بہتر بنانے کا ہنر بھی اپنی شاعری میں بتایا ہے۔

چار دیواروں کو گھر میں نے کہا تھا خود ہی کو پھر بے خبر میں نے کہا تھا

اور بھی چیزیں جلا جاتی ہیں دل کو ‏ آگ ہی کو معتبر میں نے کہا تھا
زندگی ہے بیت جائے گی ہنسی میں ‏ تم بھی چپ تھے اگر میں نے کہا تھا
اگتے سورج کی سیاہی سامنے ہے ‏ شب کے پیچھے ہے سحر میں نے کہا تھا
دھوپ میں چلنا قیامت ہوگیا ‏ باپ کو بوڑھا شجر میں نے کہا تھا
یہ کہاں سے لے آئے کچھ تو سوچ لیتے ‏ تم کو آخر راہ بر میں نے کہا تھا

یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔ان اشعار میں شاعر نے انسانی زندگی کی خوش فہمی، خامی کو اس انداز میں لکھا ہے کہ انسان سوچتا ہے کہ اس پر وہ وقت نہیں آئے گا جو کسی مجبور آدمی پر ہے لیکن یہ انسان کی بھول ہے۔اس کو کسی نہ کسی دن وہی چیزیں ضرور دیکھنے کو ملتی ہیں جو اس کے خیال سے بعید ہوتی ہیں۔

مرنا تو یوں اب نسبتاً آسان ہے ‏ زندہ رہو یہ وقت کا فرمان ہے
ٹوٹے دلوں میں حوصلے موجود ہیں ‏ مایوسیوں کی انتہا امکان ہے
مذہب بھی ہے اک سلسلہ ادراک کا ‏ ویدوں کا اگلا مرحلہ قرآن ہے
قانون ہے ٹوٹا کھلونا جبر کا ‏ شہروں پر جنگل کا سماں قربان ہے
طے کرچکی اپنی جبلّت کا سفر ‏ میری صدی وحشی صفت انسان ہے

انسانی زندگی کا عالم یہ ہے کہ اس ترقی یافتہ دور میں وہ مایوسی و بے حسی کا اس قدر شکار ہے کہ وہ مرنے اور جینے کے دریا میں ہچکولے کھا رہا ہے۔ پریشانی کا عالم یہ ہے کہ زندگی پر موت کو شاعر نے فوقیت دے دی ہے کہ اس زمانے میں زندگی گزارنے سے بہتر مرنا ہے۔زمانے جدید کی مایوسی کو یعقوب یاور نے اپنی شاعری میں اس طرح سے پیش کیا ہے کہ کہیں کہیں یاسیت اپنے حدود سے آگے بڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور یہ مایوسیت غلو کے درجہ میں پہنچ جاتی ہے جو کہ شاعری میں کچھ حدتک معیوب سمجھی جاتی ہے۔اس اعتبار سے یعقوب یاور کی شاعری میں کہیں کہیں کمی دکھائی دیتی ہے لیکن یعقوب یاور جہاں اپنے آپ کو ترقی پسند

ادیبوں میں شامل کرتے ہیں وہیں لکھتے لکھتے وجودیت کے اس راہ پر نکل جاتے ہیں جو جدیدیت کی پہچان ہے۔ زمانے کی تغیرات کو یعقوب یاور نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور اس کے مضر اثرات کو بھی دیکھا ہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں یہ چیزیں موجود ہیں۔

نہ زلفیں کالی رات سی نہ چہرے آفتاب سے
کہاں نکل کے آگئے ہیں زندگی کے باب سے

میں سورجوں کے شہر کا وقار ہوں یہ راز ہے
کہ میں کب کا مر چکا نجوم کے حساب سے

معانئ جمال پیرہن بدل کے آگئے
لطافتوں کے سلسلے بھی مل گئے عذاب سے

وہ میرے خط میں سنگ دل کا زخم رکھ کر بھیجنا
وہ نازکی، کہ جان نکل گئی مرے جواب سے

یعقوب یاور زمانۂ جدید پر دکھ جتاتے ہوئے ماضی میں جو لوگوں کے اندر محبت وایثار تھا اور جس کی وجہ سے لوگوں میں خوشیاں تھیں، اطمینان وسکون تھا لیکن اب وہ ساری چیزیں مفقود ہیں اور انسانوں کے اندر حرص وہوس گھر کر چکا ہے اور انسان اپنی ماضی کی تہذیب کو کھو بیٹھا ہے۔

زباں والا یہاں کم بولتا ہے
مگر گونگا دمادم بولتا ہے

حیات جاودانی سن رہی ہے
خوشی خاموش ہے غم بولتا ہے

کبھی اخبار کا اخبار چپ ہے
کبھی ایک ایک کالم بولتا ہے

مجھے سورج بھی سورج لگ رہا ہے
کوئی آنسو کو شبنم بولتا ہے

ان اشعار میں دور حاضر کی ترجمانی اس طرح سے کی گئی ہے کہ آج وہ انسان جس کے اندر ہنر وصلاحیت ہے مگر رشوت ستانی اور چاپلوسی کے اس دور میں گونگا ہو جاتا ہے اور جس کے اندر کوئی صلاحیت اور ہنر نہیں وہ رشوت اور چاپلوسی کے ذریعہ اپنے آپ کو اعلیٰ وافضل گردانتا ہے اور وہ اس چیز کو منوانے میں کامیابی کے ساتھ اعلیٰ عہدے پر فائز بھی ہو جاتا ہے۔ زمانے کے خدوخال کو اس طرح بیان کیا کہ آج وہ دور ہے جس میں خوشی کی چوری ہے اور غم کی سینہ جوری ہے۔

میں سچ کہہ دوں مگر جوکھم بہت ہے
خدا سے آدمی کا دم بہت ہے

ہوس ہوگی تو دریا کم پڑیں گے　　قناعت کے لیے شبنم بہت ہے
نمائش کھاگئی سوزدروں کو　　حقیقی غم ہے کم ماتم بہت ہے
سبھی کو اپنے اپنے غم مبارک　　بسر کرنے کو اپنا غم بہت ہے

یعقوب یاور نے اپنی شاعری میں عصری مسائل کا نقشہ بہت اچھے انداز میں کھینچا ہے زمانے کی تغیرات اوراس کے منفی اثرات سے رونما ہونے والی برائیوں کو اپنی شاعری میں بڑی بے باکی سے پیش کیا ہے۔ساتھ ہی انھوں نے ایسے مسائل کوبھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے جس میں انسان کی کاہلی اور آہ وبقا کو اپنے شاعرانہ نظریہ سے لوگوں کے سامنے لایا ہے۔اورایک پیغام دیا ہے کہ دور کیسا بھی ہوانسان کوگھبرانہ و مایوس نہیں ہونا چاہیے دکھوں و مصیبتوں کا ڈٹ کر سامنا کرنا ہی کامیابی کی ضمانت ہے اور انسان کی زندگی کا مقصد ہی جہد مسلسل ہے۔

مرے اشعار کسی لب کے حوالے نہیں ہیں
یہ وہ ہیں جو کسی دربار کے پالے نہیں ہیں
سرد لمحوں کی کسک خوف گر فتنہ ہوئی ہے
یا خدا آگ،کہ اب اور سنبھالے نہیں ہیں
سادہ فطرت ہیں گنہ کیا ہے نہیں جانتے
یہ عزازیل ہیں جنت کے نکالے نہیں ہیں

یہ اشعار تعلّی کے ہیں جس میں یعقوب یاور اپنی شاعری کے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ میری شاعری کسی دباو و دربار کے وجہ سے نہیں کہی گئی ہے اور نہ ہی کسی حرص ولالچ میں، میں نے وہی کہا ہے جو حقیقت پر مبنی ہے۔جس میں وقت پر طنز کے ساتھ خوف وہراس کا بیان ہے۔اورشاعر نے قلندر صفت انسان کی سادہ طبیعت کا بیان بھی بہتر انداز میں کیا ہے۔

عشق کی خواہش بھی تھی اور خواہش و دیدار بھی
تجھ سے مل کر ایسے پچھتائے ہنسیں اغیار بھی

میں نے تجھ سے تجھ کو مانگا تھا تیری آنکھ میں
دائمی انکار بھی تھا عارضی اقرار بھی
تیرے ملنے سے ہوئی محرومی دل لاکنار
رات تیرا ساتھ میری جیت بھی تھی ہار بھی

یعقوب یاور کی شاعری میں عصری مسائل کے ساتھ عشقیہ بیان بھی موجود ہے جس میں عشق و محبت کی کشمکش اور تصادمات کے ساتھ معشوق کے وصل کی آرزو و محرومی ہے۔ عشقیہ صفات کی مجہول کیفیت ان کی شاعری میں کلاسکیت کو وجود میں لاتی ہے۔

پیٹ اک کا مسئلہ تھا عیش اک کا مسئلہ تھا
مسئلے کو مسئلے سے کر چکا حل آدمی
کل رکھے گا ورثہ عقل وخرد نیلام پر
آگہی سے فخر موجودات تھا کل آدمی
گاؤں جنگل سے اُگے پھر گاؤں سے شہر بلا
مانگتا ہے شہر سے پھر اپنا جنگل آدمی

ان میں شاعر انسانی زندگی کے ایسے فلسفہ کو پیش کیا ہے جس کے ذریعے انسان کی نفسیاتی جبلت و عادت کو جانا جاسکتا ہے انسان کی ایک آرزو و تمنا پوری ہوتی ہے تو وہ اس سے بہتر کی امید کرنے لگتا ہے۔ بہتر سے بہتر زندگی کی امید میں انسان جہد مسلسل کرتا ہے لیکن جب وہ بہتری اپنے حدود و قیود سے مبرا ہو جائے تو اس میں ترقی تو ہوگی لیکن انسانیت مفقود ہوگی جس کی وجہ سے انسان سکون واطمینان سے عاری ہوگا جس کو ہم عصرِ حاظر میں دیکھ رہے ہیں کہ انسان ترقی کرتے کرتے اتنی اونچائیوں کو پہنچ گیا ہے کہ وہ بڑے بڑے شہروں میں محلات، عمارتوں اور ائیر کنڈیشن بلڈنگوں میں زندگی بسر کر رہا ہے لیکن پھر بھی سکون واطمینان اسے نصیب نہیں ہے۔ جس کی عوض میں آج پھر انسان اپنی ماضی کی طرف جانا چاہتا ہے جس میں ایثار و محبت اور ملنساری تھی۔

وہ تنہا شخص کتنا معتبر ہے

سفر اوڑھے ہوئے خود سفر ہے
مرے ہاتھوں کا سایہ میرے سر پر
ہما کی دسترس سے دور تر ہے
ابلنا خون کا تری رگوں میں
مری بے خواب راتوں کا ثمر ہے
ہوئی چہرے کی ہر تحریر واضح
مگر شک اس کو عکس آب پر ہے
وہ سورج پر سبز کمندیں ڈال دے گا
وہ جس کے ساتھ دست بے ہنر ہے

ان اشعار میں شاعر نے انسانی زندگی کے فلسفہ کو وسعت فہمی کے ساتھ پیش کیا ہے جس سے شاعر کی انسانی زندگی اور سماج کی آگہی کا پتا چلتا ہے۔شاعر نے انسانی تشخص اور اس کی اہمیت کو پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ انسان کی زندگی ایک سفر کی طرح ہے جو کبھی بھی ختم ہوسکتی ہے۔اس کا ختم ہونا حتمی امر ہے ساتھ ہی ان اشعار میں انسانی زندگی میں جو واقعات و حادثات درپیش ہوتے ہیں ان کو بھی قلم بند کیا گیا ہے۔عصرِ حاضر کی تہذیب کی عکاسی بھی غزل کے ان اشعار میں موجود ہے جس میں یہ باور کرایا گیا ہے کہ آج ایسا انسان اعلیٰ عہدے پر فائز ہو جاتا ہے جس کے سر پر سیاسی اور بڑے لوگوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ پر وہ انسان اس عہدے کے لائق نہیں ہوتا ہے:

میں کس کا ہم خیال ہوں اچھا سوال ہے
خود اپنے ساتھ ہی مرا جینا محال ہے
وہ وقت کی یاد کے سائے بھی ناگوار
وہ کشمکش کہ تیرا تصور وبال ہے
باغوں کے بعد پھر وہی جنگل کا سلسلہ
لوہے کے بعد پھر وہی پتھر کی ڈھال ہے

خوابوں میں جھومتی جنت کا کیا کروں
زخموں کی سرکشی سے طبیعت بحال ہے
چہرے کی دسترس میں نہیں حوصلوں کی دھوپ
راہوں کے پیچ و خم سے مسافر نڈھال ہے
یہ مرا چہرہ ہے مرے قول کا امین
جو اس کا حال ہے وہ مرے دل کا حال ہے

یعقوب یاور نے انسانی زندگی کی کشمکش اور ذہنی تصادمات کو بہتر طریقے سے پیش کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج انسان بے چہرگی و بے اطمینانی کا اس قدر شکار ہو گیا ہے کہ جس سے اس کا جینا مشکل ہو گیا ہے۔ تھوڑے وقت کے لیے اس کو خوشی میسر ہوتی ہے تو فوراً دکھ اس کا انتظار کرتا ہے غزل میں یعقوب یاور نے الفاظ کا استعمال اچھے طریقے سے کیا ہے جیسے باغ اور پھر جنگل۔ لوہا اور پھر پتھر غزل میں طنز کا ایک ایسا وار ہے کہ وہ لکھتے ہیں مجھے جنت سے کیا وابستہ میں تو زخموں کی سرکشی سے خوش ہوں ایسا اس وقت ہوتا ہے جب کوئی چیز اپنی حد پار کر دے۔ دکھ والم اس طرح بڑھ گیا کہ اس کا اثر الٹا ہونے لگا جو سماج پر زبردست طنز ہے۔ شہر کی طرح آج انسان بھی ویرانی کی زندگی گزار رہا ہے۔ اس کو کسی طرح قرار نہیں ہے اس کلام میں یعقوب یاور کی شاعرانہ صلاحیت کا عکس موجود ہے۔

آگ لگی ہے موسم کتنا اچھا ہے
شہروں شہروں ذہن فرشتوں جیسا ہے
ایک طرف سے دشمن ساری دنیا ہے
پھر بھی ہم کو اس دنیا میں رہنا ہے
تنہائی کی لوح کو دیمک چاٹ گئی
ملنے والا بھی دو دن کا بھوکا ہے

گلوبلائزیشن کے دور کی زندگی کو شاعر نے غزل کے ان اشعار میں اس طرح سے پیش کیا ہے کہ آج انسان بھیڑ میں تو ہے لیکن اس بھیڑ میں بھی وہ تنہا ہے۔ اس کو بے اطمینانی اور بے سکونی ہے کیوں کہ آج

کا ہرانسان اپنے اپنے میں پریشان ہے۔اسے اپنے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا ہے اس لیے جب انسان آج کے دور میں دوسرے سے ملتا ہے تو وہ بھی پریشان اور بے چینی کا شکار ہوتا ہے۔اس دور میں نفرت وحسد کے بازار گرم ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان کو پھر بھی اسی میں جینا ہے۔شاعر کا اس پر تیکھا طنز ہے۔ظلم وستم و بربادی کی منظر کشی کو یعقوب یاور نے اپنی شاعری میں اکثر جگہوں پر بہتر انداز میں پیش کیا ہے جس میں ان کی بے حسی و مایوسی صاف طور پر جھلک رہی ہے۔

لرزاں ترساں منظر چپ
آرامیدہ گھر گھر چپ
یہ کیسی ہے راہ بری
راہی چپ تو رہبر چپ
گوپی چندر ڈوب گیا
سہما ہرا سمندر چپ
اندر ہلچل باہر چپ

ان اشعار میں زمانے کے اس رویہ کو پیش کیا گیا ہے جس میں ہر کوئی ظلم و ناانصافی پر خاموش تماشائی بنا ہوا ہے اس میں سیاسی رہنماؤں کے ساتھ عام لوگ بھی شامل ہیں۔ ہر جگہ جبر وظلم کا سماں ہے لیکن کوئی بھی اس کے خلاف آج بولنے والا نہیں ہے۔ شاعر کے مشاہدات و تجربات ان اشعار میں پنہاں ہیں۔یعقوب یاور نے انسان کی آرام طلبی اور کسالت کو بھی اپنے اشعار میں جگہ دی ہے۔

چال کچھوے کی ہے لیکن　　　ہر ارادہ عرش پر ہے
سن کر شرمندہ بھی خوش بھی　　　تیری گلیوں میں گزر ہے
ابتدا سورج سے کی تھی　　　انتہا تاریک تر ہے

غزل کے ان اشعار میں ایسی معنویت ہے جو حقیقت پر مبنی ہے انسان جو کام بغیر سوجھ بوجھ کے

کریگااوراس میں محنت ومشقت کودر کنار کر دیگا تو اس کا آغاز کتنا بھی اچھا ہولیکن انجام برا ہوگا۔اور شاعر نے بتایا ہے کہ صرف خواب وخیال سے بلندیاں حاصل نہیں کی جاسکتی ہیں اس کے لیے یقین محکم وعمل پیہم ضروری ہے۔

جو تو نہیں تو موسم ملال بھی نہ آئے گا — گئے دنوں کے بعد عہد حال بھی نہ آئے گا
مری سخن سرائیوں کا اعتبار تو نہیں — جو تو نہیں تو ہجر کا سوال بھی نہ آئے گا
اگر وہ آج رات حد التفات توڑ دے — کبھی پھر اس سے پیار کا خیال بھی نہ آئے گا

ان اشعار میں عشقیہ بیان کے ساتھ محبوب کی چاہت اور اس سے ملنے کی آرزو ہے اور عشق کی کیفیت کا بیان اس طرح سے ہے کہ جس میں عشق مجازی کے ساتھ جنسی رمزات ہیں۔

ارباب ہوس نے ہاتھوں میں لے لی ہے بے صیقل تلوار
اور اہل جنوں کے خیموں پر کرتے ہیں شب خونی یلغار
میں افسردہ ہو جاؤں تو دشمن کی مرادیں بر آئیں
اب سوچ رہا ہوں دشمن کا یہ سپنا کر دوں سا کار
فرداًفرداً مل کر سب سے اپنی قیمت کم کر ڈالی
میں سستا مہنگا جو بھی تھا میری منزل ہوئی بازار

غزل کے ان اشعار میں یعقوب یاور نے زمانے کے ظلم کی داستان کو اس طرح بیان کیا ہے کہ آج حرص وہوس کے پجاری معصوم لوگوں کو بھی نہیں چھوڑتے ہیں ان پر طرح طرح کے ظلم وستم ڈھاتے ہیں اور انھیں اپنا اسیر بنالیتے ہیں۔اس طرح کے موضوعات کو یعقوب یاور نے جگہ جگہ اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔

دل کی بستی میں جب سورج آیا کرتا ہے
تیرا تصور بادل بن کر سایا کرتا ہے
راتیں اشکوں کی سوغاتیں لے کر آتی ہیں

دن بھی زخموں کے گلدستے لایا کرتا ہے
اپنے ماضی پر جب ہم اترایا کرتے ہیں
تب مستقبل خطرے میں پڑ جایا کرتا ہے
آئینے کا سچ بھی میرے سچ کو مانے گا
ظاہر باطن سے یوں ٹکرایا کرتا ہے
جس کے ہونٹوں پر سچائی نازاں رہتی تھی
سڑکوں پر اللہ کی قسمیں کھایا کرتا ہے
اپنی انا کو پھر پہروں سمجھایا کرتا ہے
یاور چاند کو پالنے کی بات کرتا ہے

غزل کے پہلے شعر میں عشقیہ بیان اس طرح سے ہے کہ جب عاشق کے دل میں بے چینی و بے قراری ہوتی ہے تو محبوب کی یاد سے اسے سکون مل جاتا ہے۔ غزل کے دوسرے اشعار میں انسان کے شب و روز کی جو حالت ہے اور اس میں جو کرب و بے چینی ہے اس کو موضوع بنایا ہے ساتھ ہی اس غزل میں یہ پیغام دیا ہے کہ کسی قوم کا ماضی کتنا بھی تابناک اور بہتر رہا ہو اگر وہ قوم اپنے مستقبل کے بارے میں نہ سوچے گی تو وہ قوم برباد ہو جائے گی اور اس کا مستقبل اندوہ ناک ہوگا۔ زمانے کے تغیرات کے ساتھ انسانی زندگی میں جو تصادمات پیدا ہوئے ہیں اس کو بھی شاعر نے اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔

آندھی کی دھمکی سے یاور مت گھبرانہ
جہاں اندھیر دکھے وہاں اک دیا جلانا
سچ کے جانے کتنے چہرے دیکھے بھالے
سچ پوچھو تو سچ اب بھی ہے انجانہ
سائے سے امید رکھی تو پچھتاؤ گے
سورج کی بھی مجبوری ہے دھوپ کھلانا
آنکھوں نے کچھ صنم تراشے دل نے پوچھے

صرف زباں نے ہی شاید رب کو پہچانا

یعقوب یاور نے موزون وقافیہ بند اشعار میں جہاں سماج کی باتوں کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے وہیں انھوں نے آزاد نظم میں سماج کی اور آج کے دور کے زخم کو اچھے سے کریدا ہے۔ چاہے دور حاضر میں مظلوم پر ظلم کا پہاڑ ہو یا کمزور مخلوق پر استحصال چاہے عورت کی شکل میں ہو یا غریب ومزدور کی شکل میں۔اور تلمیحات کے ذریعے ان چیزوں کو موثر بنایا ہے۔ان کی نظم ''آج کی شکنتلا'' ملاحظہ ہو:

مجھے لگا

جیسے میرے چاروں طرف کھڑے ہوں

ہزاروں ترکش بدوش کیوپڑ

نظر اٹھائی تو میں نے دیکھا

سنہری رنگ کا اک ہرن مرے سامنے سے گزر رہا تھا

پھر اس کے پیچھے میں چل پڑا تھا

نہ راستوں کی نہ اپنی منزل کی کچھ خبر تھی

مگر یہ سپنا تھا

آنکھ کھولی

تو سامنے ایک بھولی بھالی اداس لڑکی

بدن دریدہ

لباس کے تار گن رہی تھی

جو میں نے پوچھا کہ کون ہو تم

تو آنسوؤں نے زبان کھولی

میں بھولی بسری شکنتلا

کالیداس کی باٹ جوہتی ہوں

نہ جانے کس نے

مری کتاب حیات کے ہر ورق کو تاریک کر دیا ہے

میں اک گلی ہوں

اور ایک دشینت

ابھی ابھی اس گلی سے گزرا ہے

تم بھی آؤ

یعقوب یاور نے اس نظم میں دیومالائی تلمیح کے ذریعہ سے آج کے سماج پر کاری ضرب لگائی ہے جس میں آئے دن عورتوں کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے اوران کا جنسی استحصال ہوتا ہے اس طرح سے یہ دیکھ سکتے ہیں کہ عورت ہر دور میں مجبور تھی اور آج جب عورتوں کو مساویت کا درجہ دینے کے لیے ہر جگہ آوازیں بلند ہوتی ہیں اور ترقی کے ڈھنڈورے پیٹے جاتے ہیں۔اس دور میں بھی عورت کمزور اور بے کس ہے ہر جگہ ان کا استحصال ہوتا ہے۔یعقوب یاور کی آزاد نظموں میں یہ ایک اچھی نظم ہے جو شروع سے آخر تک معانی کے پرت کو کھولتی چلی جاتی ہے۔اس کے الفاظ میں دلکشی و جاذبیت ہے اور تلمیح کے ذریعے واقعات کو نظم کی شکل میں پیش کیا گیا ہے جو مہابھارت کی کہانی کے اعتبار سے ماخوذ ہے جس میں سوامی وشوامتر اور افسرا کی بیٹی شکنتلا ہے جس کو ہستنا پور کے راجہ دشینت سے پیار ہو جاتا ہے پھر راجہ دشینت شکنتلا کو چھوڑ کر ہستنا پور واپس چلا جاتا ہے جس کی بنا پر شکنتلا کو بہت ساری اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

نظم (میرا گھر)

بہت پیارا تھا میرا گھر

مرے سپنوں کا اک سنسار تھا

میں اس کا خالق تھا

مرے تخلیق کردہ قہقہے اس گھر میں رہتے تھے

غموں سے دور

میں اپنے عزائم پر کمر بستہ

بہت خوش تھا

مگر میری خوشی کی پشت میں روپوش تھے

سانپوں کے کچھ لشکر

جنھیں سپنوں کا یہ سنسار شاید کاٹتا تھا

اور وہ آہستہ روی سے

اس کے ہر درو دیوار کو

اپنی زہریلی زبانوں سے مسلسل چاٹتے تھے

آج میرا گھر

جو گھر تو ہے

مگر دیوار در سے ماورا ہے

مجھے خود کاٹتا ہے

اس نظم کے سارے الفاظ دیکھنے میں تو ہلکے معلوم ہوتے ہیں پر یعقوب یاور نے ان کو اس نظم میں ایسے پرویا ہے کہ پڑھنے اور سننے کے بعد دل کو چبھتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں جیسے ''زہریلی زبانوں سے مسلسل چاٹنا'' یہ الفاظ ظاہری طور پر تو کچھ نہیں کہہ رہے ہیں پر شاعری میں یہ بتا رہے ہیں کہ کیسے آدمی کا گھر خود اس کے قریبی لوگ برباد کر دیتے ہیں۔ اس چیز کو انھوں نے اشارہ و کنایہ میں سانپ کے کچھ لشکر سے تعبیر کیا ہے جس میں معنویت اور تاثیر ہے۔ گھر میں زہر پھیلنے سے مراد گھر کے افراد میں اختلاف، رشتے کی پامالی ومحبت سے دوری ہے۔ اس نظم میں شاعر نے تہذیبی زوال و رشتوں کی بے قدری کے ساتھ ان اسباب کو پیش

کیا ہے جس سے آج گھروں میں بے چینی، اختلاف و اجنبیت ہے۔

تاریخ سے لگاؤ کے ساتھ آثار قدیمہ سے یعقوب یاور کو خاصہ دلچسپی ہے اور اس پر ان کا گہرا مطالعہ ہے جس کو انھوں نے اپنے ناولوں کا موضوع بھی بنایا ہے۔ یہ چیزیں ان کی شاعری میں بھی جا بجا موجود ہیں۔ موہن جوداڑو کے نام سے ان کی یہ نظم ملاحظہ ہو:

نظم (موہن جوداڑو)

موہن جودارو شاہد ہے
کہ مرے فرق پر تہذیب کا آنچل پرانا ہے
تمدن سے مرا قرنوں کا رشتہ ہے
زمین نے آج اگلی ہے مری عظمت
مگر میری یہ دیواریں
یہ در یہ کھڑکیاں
تالاب
معبد و سڑکیں
یہ سکے
اور ان کے پشت میں پنہاں
مرا آدابِ شہریت
یہاں پر دفن تھا صدیوں سے
قرنوں سے
یہ سب کچھ تھا مری تحویل میں
اس وقت سے

جب فرد ویران جنگلوں میں
اپنی اپنی زندگی کی جہد میں سرگرم تھا
جبلت خون پینے کی
تحفظ کے لیے ہر پل پریشان تھا
تو میں شہروں میں رہتا تھا
مہذب وشائستہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

یعقوب یاور نے مندرجہ بالا نظم میں موہن جوداڑو کی ترقی اوران کی تہذیب وثقافت کی اونچائی کو بیان کی ہے جس وقت انسان آدیواسی ہوا کرتے تھے اوراپنی زندگی جنگلوں میں جانوروں کی طرح گزارتے تھے اس وقت موہن جوداڑو نام کی ایک ایسی تہذیب موجود تھی جس میں وہاں کے لوگ اپنی لیاقت وصلاحیت کا لوہا منوار ہے تھے۔ان کے شہروں اور پختہ عمارتوں، تالابوں ونالیوں اوررہن سہن کے طور طریقے سے یہ بات اجاگر ہوتی ہے۔

نظم (عید)

عید کا کیا ہے
یہ آئی چلی جائے گی
جب بھی آتی ہے تو لاتی ہے مرے دل کی گھٹن
سر پہ یادوں کا عتاب
خوف فردا کا عذاب
ڈوب جاتا ہے یہ دل
ایسے ماضی کے سمندر میں
جہاں

نہ تو موتی ہے نہ مونگا ہے کہیں
سپیاں ریت بھری
اور زہراب کی گہرائی
میری خواہش کے لیے
ایسے مستقبل ویراں کے پہاڑ
جس میں دیوار مسلسل تو ہے در کوئی نہیں
حال
جینے پہ نہ جینے کا گماں
عید بھی کیا ہے
یہی
دی وفردا کی لٹکتی تلوار
جس سے ہو جاتا ہے امروز کا خوں
عید کا کیا ہے یہ آئی ہے چلی جائے گی

اس ''عید'' نظم کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کو یعقوب یاور نے اکثر شعراء کی روش سے ہٹ کر لکھا ہے۔ دوسروں کے یہاں عید کی خوشیوں میں نئے کپڑوں کے ساتھ مختلف النواع کے پکوان کا ذکر ملتا ہے لیکن یعقوب یاور نے اپنی اس نظم میں غریب زدہ انسان کی تکلیف کو بیان کیا ہے کہ جب عید آتی ہے تو اس کے اندر کس طرح کا ہیجان ہوتا ہے۔ یہ یعقوب یاور کی اپنی انفرادیت ہے کہ وہ اکثر چیزوں کو اپنے معاصرین سے الگ بیان کرتے ہیں لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اتنا بھی الگ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ عوام الناس کو غیر مانوس لگے جس کی وجہ سے عوام وقارئین کی توجہ ان کی طرف کم ہو جاتی ہے۔ پر مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ جو بھی لکھے ہیں اس کا حق ادا کیے ہیں چاہے ناول ہو یا تراجم یا شاعری۔ اسی وجہ سے ان

کی شاعری کے بارے میں پروفیسر عنوان چشتی لکھتے ہیں:

''یعقوب یاور ان محتاط اور مخلص شاعروں میں شامل ہیں جنھوں نے غزل کی فنی اور جمالیاتی قدروں کا احترام کرتے ہوئے اپنی تخلیقی طاقت کا ثبوت فراہم کیا ہے ان کی شاعری میں ان کے سائے اور ہم سائے پوری طرح جلوہ گر ہیں میری مراد ان کی ذات اور کائنات سے ہے مجھے یقین ہے کہ غزل کے مزاج داں اور ادا شناس ان کی شاعری کو محبت کے ساتھ پڑھیں گے'' 6

یعقوب یاور نے ''امید گاہ'' کے نام سے ایک نظم لکھی ہے۔ یہ بالکل الگ نوعیت کی ہے جس میں آج کے دور کے نوجوان کا ذکر ہے۔ اس میں ان کی بے راہ روی، مقصدیت سے دوری وقت کے بے جا استعمال کا ذکر موجود ہے۔

نظم (امید گاہ)

سنو!

سنو سنو! یہ بیسویں صدی کے نوجوان ہیں

انھیں عرض نہ ملک سے نہ قوم سے

کھلنڈروں کی طرح اپنے رات دن گزارنا

کسی گلی

کسی سڑک کے موڑ پر

جو محفلیں جمیں

تو دوستوں میں گفتگو ہے

عورتوں کے جسم کے سڈول پن کی

سیب جیسے گال

اور رات جیسے بال کی

گرم گرم آنچ اگلتی چھاتیوں میں ہاتھوں کی طواف کی
اوراس کے بعد
زیرناف وادیوں کی سیر کی
بس اور کیا
کہ بس اسی میں زندگی کا لطف ہے
سنو
سنوسنو! کہ بیسویں صدی کا نوجوان مری امیدگاہ ہے
میں حال سے گریز پا
میں عبرتوں کا کارواں
اسیر آگہی ہوں
وائے بے بسی

سماج کی آگہی و تفہیم کے ساتھ یعقوب یاور کی نظر آج کے نوجوان پر گہری ہے اس زمانے کے نوجواں جو عیاشی اور بدمعاشی کے جام پیتے ہیں اوراس کو اپنا مستقبل سمجھتے ہیں اس کو انھوں نے پوری حقیقت کے ساتھ کھلے طور پر پیش کیا ہے اوراس کے خطرات کو بھی اجاگر کیا ہے۔منٹو کے افسانوں کی طرح ان کی نظم میں بھی حقیقت نگاری ہے لیکن ان کی اس حقیقت نگاری سے ان کی شاعری میں کھردرا پن آیا ہے کیونکہ شاعری میں رمز وایماں کو مرکزیت حاصل ہوتی ہے جس کے ذریعے شاعری میں دلکشی و معنویت بڑھ جاتی ہے۔

یعقوب یاور کی شاعری میں ماضی کی وراثت واسلاف کی میراث موجود ہے انھوں نے دانشوروں، ادیبوں، اور رہنماؤں کے نام سے ان کی خدمت اور کارنامے کے اعتراف میں نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں۔

نظم (یادمولانا ابوالکلام آزاد)

ہمارے عہد زریں میں
سیاست کیا، ادب کیا، فلسفہ کیا اور صحافت کیا
جدھر دیکھو ادھر تاریکیوں کی حکمرانی ہے
محی الدین
ہم سب بھول بیٹھے ہیں
کہ کیا کچھ تھی سیاست تیری نظروں میں؟
ادب کیا تھا؟
صحافت میں تیرے کیا کارنامے تھے؟
تیری نظروں میں رمز زندگی کیا تھا؟
یہاں تو اب سیاست شعبدہ بازی ہے
کرتب ہے مداری کا
ادب اک جھوٹ ہے جو سچ پہ غالب ہے
صحافت مصلحت پرور
فلسفہ ہے صرف عیاشی دماغوں کی
یہ سب کچھ ہے

....

....

اس میں نظم نگار نے مولانا آزاد کی سیاسی، سماجی وادبی صلاحیت کو اجاگر کیا ہے ساتھ ہی ذہن کو اس طرف مبذول کرایا ہے کہ آج تعلیم یافتہ لوگ کس ڈگر پر جارہے ہیں وہ اپنے ماضی واسلاف کو چھوڑ دیے جس کی بنا پر ہر شعبہ میں کمیاں وبرائیاں عام ہورہی ہیں۔یعقوب یاور نے کچھ نرالے انداز میں شاعری کے فن پر

شاعری کی ہے۔وہ یہ ہے کہ غزل پہ انھوں نے نظم لکھی ہے۔جس کے اندر غزل پر لگے عیوب کے ساتھ اس کی اوصاف واہمیت کا بھی ذکر ہے۔ان تمام چیزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یعقوب یاور کی ادبی نظر میں زندگی وادب کے تمام شعبہ ہیں جس کو انھوں نے شاعری میں اتارا ہے۔غزل پر ان کی نظم (غزل) ملاحظہ ہو:

غزل
نیم وحشی صنف
ایک مجذوب کی بڑ
عنقا توازن
ایک حرف نقد
چھو گیا تنقیص کی حد
''سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا''
غزل
ابروئے شاعری
عکاس تہذیب زماں
جاوداں
ایک حرف نقد
چھوتا ہوا تحسین کی حد
ایک حق وجہ شر
ایک حق وجہ خیر
''رفع شر کے واسطے کہنے کو صدقنا کہیں''

غزل

ایک صنف سخت جاں

دامن تنقیص سے

دامن تحسین سے

یعنی فرسودہ اصول نقد سے

پہلو بچا کر ہے رواں

انتہا تا انتہا

اس میں یعقوب یاور نے غزل پر کی گئی تنقید کو بیان کرتے ہوئے اس کی مقبولیت کو نرالے انداز میں پیش کیا ہے جس سے ان کی جدت ذہن و وسعت علم کا پتہ چلتا ہے۔

یعقوب یاور کی شاعری زمانے کے شکوے شکایت اور اس پر مایوسی و طنز کے ساتھ متنوع موضوعات کی متحمل ہے جس میں عصری مسائل و انسانی زندگی کے فلسفے کے ساتھ عشقیہ بیان وغیرہ موجود ہیں۔ یہ موضوعی تنوعات اس بات پر دال ہے کہ یعقوب یاور کی شاعری صرف یاسیات کی شاعری نہیں ہے۔ رجائیت اور جوش و ولولہ بھی ان کی شاعری میں موجود ہے۔ اور یعقوب یاور نے بتایا ہے کہ انسان کو اپنے ذات نفس کو پہچاننا ہوگا تبھی کامیابی حاصل ہوسکتی ہے۔ انسان کو کسی بھی انسان کا مجبور نہیں ہونا چاہیے۔ اپنے پر بھروسا ہونا اشد ضروری ہے۔ مجموعی طور پر یعقوب یاور کی شاعری کی بات کی جائے تو اس میں عصری مسائل کے ساتھ بدلتے سماج میں رونما اخلاقی قدروں کی گراوٹ، ظلم وستم، تنہائی، نئے زمانے کی مشینی و آلاتی ترقی کے سبب بے روزگاری اور اس کے منفی اثرات وغیرہ ہیں۔ جن سے لوگوں پر برا اثر پڑا۔ انسان انسان کو بھول گیا، رشتے پامال ہوگئے۔ ساتھ ہی ان کی شاعری میں تغزل۔ جس میں غزل کے لوازمات کے ساتھ عشق و عاشقی کی روداد پنہاں ہوتی ہے موجود ہے اور معاملہ بندی جس میں نجی واقعات کا بیان ہوتا ہے۔ اردو ادب میں اکثر شعراء کے یہاں معاملہ بندی کے نام پر عریاں مضامین پائے جاتے ہیں۔ یعقوب یاور کی

شاعری میں بھی اس طرح کی چیزیں موجود ہیں۔ساتھ ہی عشق مجازی اور عشق حقیقی کے رمزات سے ان کی شاعری پیوست ہے۔موضوعاتی سطح پر ان کے کچھ اشعار میں شعریت کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔کہیں کہیں ان کے شعر کا پہلا مصرعہ بہت دلکش اور خوبصورت ہے لیکن دوسرا مصرعہ پھیکا پڑ جاتا ہے۔

خوشی کی میزبانی کر کبھی کھو کر کبھی پا کر
کبھی مردہ تمناؤں سے مایوسی کا سودا کر

مندرجہ بالا شعر میں پہلا مصرعہ جاذب نظر ہے خوشی کی میزبانی کھو کر یا پا کر لیکن دوسرے مصرعے میں کمی کچھ اس طرح سے دکھ رہی ہے۔کہ مردہ تمنا بھی ہے اور اس کا سودا بھی مایوسی سے کرنا کچھ حد تک نقص کی طرف اشارہ کرتا ہے۔لیکن شاعر کا الگ اپنا خیال ہوگا مایوس اور مردہ دونوں کو یکجا کر کے تاکید کا معنی پیدا کرنا ہوگا۔ان کے مجموعوں کا مطالہ کرنے کے بعد معلو ہوتا ہے کہ یعقوب یاور ایک اچھے شاعر ہیں۔

☆☆☆☆☆

فنی لوازمات

شاعری کے لیے موضوع کا اہم ہونا جس طرح ضروری ہے ویسے ہی شاعری کے لیے فن بھی ضروری ہے۔ کیونکہ فن شاعری کی بنیاد ہوتا ہے۔ اسی پر شاعری کو پرکھا اور جانچا جاتا ہے اسی کے ذریعے سے شاعری میں دلکشی اور نکھار پیدا ہوتا ہے۔ یعقوب یاور نے اپنی شاعری میں عصری مسائل کے ساتھ مختلف النوع موضوعات کو رکھا ہے۔ اور ان موضوعات کو شاعری کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے شاعری کے فنی لوازمات کو بھی بخوبی برتا ہے۔ ان کی شاعری میں فن کی خوبیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کو نئے پرانے تجربات سے منعکس کیا ہے جس میں دلکشی اور رعنائی کے ساتھ تاثیر موجود ہے۔ اور اس میں خیال آفرینی اور معنی آفرینی کے ساتھ جدت طرازی، تخیل پردازی بھی ہے۔ ان کے کلام میں اکثر چیزوں کو واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اشارات و کنایات کے ذریعے سے بھی واقعات کو حادثات کو عمدگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ جس سے ان کی شاعری میں دلکشی اور خوبصورتی پیدا ہوئی ہے۔ فصاحت و بلاغت ان کی شاعری میں پنہاں ہے۔ ساتھ ہی پیکر تراشی اور منظر کشی بھی ان کی شاعری میں موجود ہے۔ جس سے ان کے کلام تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ علم بیان اور علم بدیع کی اصطلاحیں بھی ان کی شاعری میں ملتی ہیں جس سے ان کی شاعری کے حسن میں دوبالگی آتی ہے۔

علم بیان:

علم بیان وہ علم ہے جس کے تحت کسی معنی کو ادا کرنے کے لیے نئے نئے انداز نکالے جاتے ہیں۔ علم بیان ہمیں یہ سیکھاتا ہے کہ کسی بات کو کس طرح سے مختلف انداز میں بیان کیا جائے کہ ایک معنی دوسرے

سے زیادہ دلکش اور واضح ہو۔اور جس سے اشعار میں رنگینی وتازگی پید ہوتی ہے اس کے ذریعہ سے سادہ بیان کو دلکش اور پر اثر بنایا جاتا ہے۔اس علم میں کئی اجزاء شامل ہوتے ہیں ان میں تشبیہ، استعارہ، مجاز، مرسل، کنایہ وغیرہ ہیں۔جس کے ذریعہ شاعری میں دلکشی، حسن ولطافت اور معنی میں وسعت پیدا ہوتا ہے۔یعقوب یاور نے اپنی شاعری میں فن شاعری یعنی علم بیان وعلم بدیع کو جگہ جگہ استعمال کیا ہے جس سے ان کی شاعری میں نکھار، رعنائی، شگفتگی اور تازگی پیدا ہوئی ہے۔

تشبیہ:

تشبیہ کے معنی ہیں ''باہمی مشابہت'' جب کسی مشابہت کے باعث ایک چیز کو دوسری چیز سے مشابہ قرار دیا جائے تو وہ تشبیہ کہلاتا ہے۔علم بیان میں تشبیہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔یہ صنعت اکثر شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہے جس کے ذریعہ شعراء اپنے کلام میں بڑی سے بڑی چیز سے کسی چھوٹی سے چھوٹی چیز کی تشبیہ دیتے ہیں جس سے اس چھوٹی چیز کی وقعت واہمیت بڑھ جاتی ہے۔یعقوب یاور کے یہاں تشبیہات کا استعمال کم ملتا ہے۔کیونکہ انھوں نے زیادہ تر ایسی شاعری کی ہے جس میں عصری مسائل کے بیان کے ساتھ زندگی کے رموز واوقاف کو علامت، استعارہ اور تلمیحات کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ان کی شاعری کے تصوراتی اور خیالاتی عناصر انسانی زندگی سے جڑے ہوئے ہیں۔جس کی وجہ سے ماورائی چیزیں ان کی شاعری میں نہیں ملتی ہیں۔کچھ تشبیہات ان کی شاعری میں اس طرح سے ہیں:

تمہارا گھر مجھے لگتا اپنے گھر جیسا
وہ گھر کہ جس کا حقیقت سے واسطہ ہی نہیں

اس شعر میں یعقوب یاور ایک انسان کے گھر کی تشبیہ دوسرے انسان کے گھر سے دی ہے۔جس میں زمانے کی بے سکونی و بے چہرگی کو پیش کیا گیا ہے۔شاعر نے اس شعر میں آفاقی پریشانی کو پیش کیا ہے۔اور بتایا ہے کہ آج ہر انسان کا گھر ایک جیسا ہے جس میں بے سکونی کے ساتھ اجنبیت ہے۔یعقوب یاور کی نظموں میں کچھ اس طرح کی تشبیہات موجود ہیں:

ہر رات

بستر پر لیٹتے ہی

جاگتی آنکھوں میں کچھ خواب اترتے ہیں

پھولوں کی طرح حسین اور دلکش

پھر یہ پھول ایک ہیولیٰ سے لگتے ہیں۔۔۔۔

اس نظم میں خواب کو پھول سے تشبیہ دیا گیا ہے۔ جو پھول کی طرح حسین اور دلکش ہے جس میں یعقوب یاور نے ایک انسان کی آرزو اور تمنا و خیال کو علامت اور اشارہ میں پیش کیا ہے۔

مثل اطلس

ایک بوڑھا

اپنے کاندھوں پر اٹھائے سینکڑوں صدیوں کا بار

بس کہ آدم زاد تھا وہ۔۔۔۔۔۔۔۔

اس نظم میں ایک بوڑھے کو ریشم کے کپڑے سے تشبیہ دیا گیا ہے۔ جو بوڑھا ماضی کی تہذیب کی علامت ہے اور وہ اپنے اندر بہت سارے اثاثے اور پرانی قدروں کو پیوست کیے ہوئے ہے۔

استعارہ:

استعارہ کے لغوی معنی مستعار لینا ہے۔ انگریزی زبان میں اس کے لیے لفظ Metaphor استعمال کیا جاتا ہے جو یونانی زبان سے ماخوذ ہے اس کے معنی آگے بڑھانا۔ استعارہ دراصل مجاز کی ایک قسم ہے جس میں اپنے لغوی معنی کو ترک کر کے لسانی سیاق وسباق سے نئے معنی مستعار لیتے ہیں۔ جس سے زبان میں دلکشی اور وسعت پیدا ہوتی ہے شاعری میں اس کا سہارا زیادہ لیا جاتا ہے۔ یعقوب یاور نے بھی اپنی شاعری میں اس کا استعمال کیا ہے۔

نتیجہ کچھ تو نکلا کشتیوں کی سازش و شر کا

سمندر کے مقابل آگیا قطرہ سمندر کا

-

کیوں بھٹکتا رہا میں چمن چمن

بھول کر اپنے دل کی حسین انجمن

مذکورہ بالا اشعار میں صنعت استعارہ کا استعمال ہوا ہے اشعار میں کشتیوں کو استعارہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔اس سے مراد زمانے کے وہ افراد ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ پھر دوسرے شعر میں بھی چمن کو استعارہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔شعر میں چمن کا معنی باغ نہیں بلکہ مدد کے لیے انسان کا دوسرے لوگوں کے پاس جانا ہے۔

علامت:

علامت کے لغوی معنی نشان، پتا، چھاپ،مہر،آثار وغیرہ ہیں۔شاعری میں علامت سے مراد ایسے الفاظ کا استعمال کرنا جس کے حقیقی اور مجازی دونوں معنی نکل سکتے ہوں۔یعقوب یاور کی شاعری میں علامت کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔جس کے ذریعے انھوں نے شاعری میں اپنے نقطہ نظر و خیالات کو پیش کیا ہے۔انکی شاعری میں جو علامتیں مستعمل ہیں ان میں چند یہ ہیں۔آسمان،سورج، چاند،صحرا، ساحل، چراغ،دھواں، رات، بوڑھا،موج، کنواں،سمندر، ندی، سانپ،عقاب، دھوپ،موتی،لہو،سفر،زخم،آنگن، ریت، پتھر،آگ،سائبان وغیرہ ہیں۔ان کا استعمال یعقوب یاور نے عمدگی سے اپنی شاعری میں کی ہے۔

نظم (عید)

اپنے ماضی کے سمندر میں

جہاں

نہ موتی ہے نہ مونگا ہے کہیں

سیپیاں ریت بھری

اور زہراب کی گہرائی ہے
مری خواہش کے لیے
ایسے مستقبل ویراں پہاڑ
جس میں دیوار مسلسل تو ہے در نہیں
حال
جینے پہ نہ جینے کا گماں
دی وفردا کی لٹکی تلوار
جس سے ہوتا ہے امروز کا خون

اس نظم میں کئی علامتیں موجود ہیں۔ماضی کی یاد، حال کے احوال ،مستقبل کی بیش خیماؤں کو علامتوں کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔سمندر کو زندگی کی علامت کے طور پر یعقوب یاور نے اپنی نظموں میں استعمال کیا ہے۔سمندر اور زندگی میں یکسانیت ہے وہ یہ کہ سمندر میں طوفان آتا ہے اور زندگی میں بھی۔سمندر ساکت رہتا ہے۔تو اسی طرح زندگی میں بھی ٹھہراؤ آجاتا ہے۔اور موتی، مونگا کو خوشی کی علامت کے طور پر اس نظم میں لکھا گیا ہے۔اور پہاڑ علامت ہے انسان کی ویرانی بھری زندگی کا۔

الاماں کی سوچ ہے میری جان کے پیچھے
اور سانپ بیٹھا ہے سائبان کے پیچھے
خوش گوار موسم پر کامیابیاں مبنی
منچلا سمندر ہے بادبان کے پیچھے

غزل کے ان اشعار میں سورج ،سانپ،سائبان، بادبان،کو علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے سورج علامت ہے دکھاوے کا،سورج سے روشنی کا مستعار اس طرح سے ہے کہ روشنی سے چیزیں ظاہر ہوتیں ہیں'الاماں کی سورج ہے میری جان کے پیچھے' اس میں امن وشانتی صرف دیکھاوے کے لیے ہے۔سانپ علامت ہے دشمن اور ظلم کا، جو انسان پر وار کرتے ہیں۔اور سائبان علامت ہے انسان کی عدم موجودگی

کا،سائبان سایا سے بنا ہوا ہے۔ جیسے انسان کا سایا ہوتا ہے لیکن انسان اس سے الگ ہوتا ہے۔انسان کے عدم موجودگی میں انسان دوسرے انسان کے لیے سانپ جیسا عمل کرتا ہے۔ یہ معنی اشعار میں مراد لیے گئے ہیں۔منچلا سمندر شور بھری زندگی کی علامت ہے،اور بادبان سے مراد انسان کی ذات ہے۔شعر میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس زمانے میں انسان خود اپنی ذات کے پیچھے اس طرح پڑا ہوا ہے۔ کہ انسان اپنے آپ کو ایسی ترقی کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔جس میں صرف مادیت ہے اور انسانیت و رشتے کی پاسداری مفقود ہے۔

دھوپ میں چلنا قیامت ہو گیا ہے
باپ کو بوڑھا شجر میں نے کہا تھا

اس شعر میں دھوپ علامت ہے نئی تہذیب کا جس میں افراتفری ،حرص و ہوس ہے۔باپ اور بوڑھا شجر علامت ہے ماضی کی تہذیب کا جس میں رشتے کی پاسداری اور سکون وخوشی تھی۔

اس طرح یعقوب یاور نے علم بیان کے اجزا کو اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے جس سے ان میں دلکشی،شگفتگی اور تاثیر پیدا ہوئی ہے۔

علم بدیع:

علم بدیع بلاغت کا ایک اہم شعبہ ہے اس کو علم معنی بھی کہتے ہیں۔ یہ کلام میں مطابقت ،فصاحت و بلاغت پیدا کرتا ہے۔غیر مناسب چیزون سے بچاتا ہے اس کے استعمال سے شاعری میں حسن و لطافت اور معنی میں وسعت پیدا ہوتا ہے۔علم بدیع دو حصوں پر مشتمل ہے۔ایک معنوی دوسرے لفظی ،معنوی صنعتیں یہ ہیں۔صنعت تضاد، مراعات النظیر ،ابہام ،تجاہل عارفانہ،تلمیح ،غلوع ،مبالغہ،مکر شاعرانہ وغیرہ ہیں۔اسی طرح لفظی صنائع میں تجنیس ،تکرار،تقلیب وغیرہ۔یعقوب یاور نے اپنی شاعری میں جن صنعتوں کا استعمال کیا ہے ان میں اکثر یہ ہیں مراعات النظیر ،تضاد،تلمیح،تجنیس ،تکرار وغیرہ۔جس سے ان کے کلام میں حسن ،لطافت اور معنی میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔

تکرار:

دو ایسے لفظوں کو شعر یا مصرعوں میں جمع کرنا جس کے معنی ایک ہوتے ہوں وہ تکرار کہلاتا ہے۔ یہ کسی بات پر زور دینے اور تاکید کا معنی پیدا کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یعقوب یاور نے اپنی شاعری میں جگہ جگہ اس صنعت کا استعمال کیا ہے۔ جس سے ان کی شاعری میں تاکیدی معنی پیدا ہوئے ہیں اس صنعت کو یعقوب یاور نے اس وقت استعمال کیا ہے جب وہ کسی بات کو زور دے کر پیش کرتے ہیں۔ نمونے کے طور پر کچھ اشعار ملاحظہ ہوں جس میں یہ صنعت موجود ہے:

چیخوں میں بے بسی تھی حمایت نہ کر سکے
بستی بستی کی سائیں سائیں میں ہمت نہ کر سکے

اس شعر میں بحسن خوبی صنعت تکرار کا استعمال ہوا ہے۔ جو بستی بستی اور سائیں سائیں ہے شعر میں اس صنعت سے بے بسی کی انتہا معلوم ہوتی ہے۔ بے بسی کی انتہا کو بتانے کے لیے اس صنعت کو اس شعر میں پیش کیا گیا ہے۔

لمحہ لمحہ مرے اندر کوئی مرتا ہے مگر
میں بھی چپ ہوں مری محدود فضا بھی چپ ہے

اس شعر میں لفظ لمحہ لمحہ تکرار کے طور پر مستعمل ہے جس سے شعر میں تاکید کا معنی پیدا ہوا ہے۔ لمحہ لمحہ سے مراد ہمیشہ، ہر وقت ہے۔

تضاد:

شعر میں ایسے الفاظ کا استعمال ایک ساتھ کیا جائے جس میں بہ اعتبار معنی تضاد پایا جائے۔ اس صنعت کو یعقوب یاور نے اپنی شاعری میں کثرت سے استعمال کیا ہے۔

لڑکھڑاتا کانپتا سب کچھ لٹا کر آ گیا
صبح کا بھولا ہوا دل شام کو گھر آ گیا

میں اندر کچھ ہوں اور باہر کچھ
سچائی سے آنکھ ملانے والا میں

ماضی کی کوتاہ نظر کا خمیازہ
مستقبل کے خواب سے ڈرنے والا میں

دن بھر تیرے ساتھ ہنسی تو رات چپکے چپکے رونا
میری خوشیاں میرے غم ہیں تیرا ہونا اور نہ ہونا

اس طرح سے یعقوب یاور نے اپنی شاعری میں صنعت تضاد کا استعمال کیا ہے ان میں دن رات، صبح شام، موت زندگی، ماضی مستقبل، ہونا نہ ہونا، زمین آسمان، اندھیرا اجالا، خزاں بہار، ہنسنا رونا، خوشی غم، آگ پانی، سورج چاند، قید آزادی، اقرار انکار، وغیرہ۔ ان کے ذریعے سے یعقوب یاور کی شاعری میں وسعت اور گہرائی کے ساتھ مناظر فطرت اور انسانی جبلتیں موجود ہیں۔

مناسبت لفظی:

اس کو مراۃ النظیر بھی کہتے ہیں۔ شاعری میں اسے تناسب، توفیق اور تلفیق بھی کہتے ہیں۔ جس کے اندر ایسے الفاظ جمع کیے جاتے ہیں جن کے معنی ایک دوسرے سے مناسبت رکھتے ہیں۔ مگر یہ مناسبت تضاد اور تقابل کا نہیں ہوتا ہے۔ اس صنعت سے شاعری میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ یعقوب یاور کی شاعری میں اس صنعت کے ذریعے جامعیت اور دلکشی پیدا ہوئی ہے۔ نمونے کے طور پر کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

آئینے کا سچ میری تصدیق نہیں
اپنے سچ پر ٹھیک اترنے والا

صبح میں سچ کا زہر ملا کر

میں نے کافی کڑوی کر لی

تشنگی گر سنگی خواہشیں احساس خراج
اگر میں ڈوب گیا ہوں تو گھٹا بھی چپ ہے

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یعقوب یاور نے مناسبت لفظی کا استعمال عمدگی سے کیا ہے۔جس سے ان کی شاعری میں نغمگی اور دلکشی پیدا ہوئی ہے۔

تلمیح:

کلام میں کسی مشہور تاریخی واقعہ قصہ یا مسئلے کی طرف اشارہ کرنا۔شاعری میں اپنی بات کو موثر بنانے کے لیے اس صنعت کا استعمال کیا جاتا ہے۔یعقوب یاور نے بھی اس صنعت کا استعمال بہتر طریقے سے کیا ہے۔جس میں اسلامی تلمیحات کے ساتھ دیو مالائی تلمیحات بھی موجود ہیں۔جیسے حضرت ابراہیم وآزر کے واقعے موسی کے واقعے ،ہندی دیو مالائی میں راج کماری شکنتلا اور راجا دشینت وغیرہ کے واقعات ان کی شاعری میں اشارتاً موجود ہیں۔

براہمی سراسیمہ کھڑی ہے
خدا کے سامنے ہے ابن آزر

براہیمی اور ابن آزر دونوں تلمیح ہے براہیمی حضرت ابراہیم کی طرف منسوب اچھائی اور نیکی ہے۔ جو گھبرائی ہوئی ہے۔اور ابن آزر بھی حضرت ابراہیم کی طرف منسوب ہے۔لیکن بطور انسان ہے۔یہ دونوں اسلامی تلمیحات ہیں آزر حضرت ابراہیم کے والد کا نام ہے۔

نگہ یار تھی عصا شاید
چھپ گئے میرے آستین میں سانپ

اس شعر میں عصا بطور تلمیح مستعمل ہے حضرت موسی کی لاٹھی جو اللہ کے حکم سے سانپ بن جاتی تھی۔شعر میں محبوب کی نگاہ کو حضرت موسی کی لاٹھی سے تعبیر کیا گیا ہے۔کہ محبوب کا نگاہ عاشق کے اندر سانپ

بنکر چھپ جاتی ہے۔جس طرح موسی کی لاٹھی سانپ بن جاتی تھی اور پھر وہ سانپ لاٹھی میں تبدیل ہو جاتا تھا۔

نظم (آج کی شکنتلا)

جو میں نے پوچھا کون ہو تم

تو آنسوؤں نے زباں کھولی

میں بھولی بسری شکنتلا

کالی داس کی باٹ جوہتی ہوں

نہ جانے کس نے

میری کتاب حیات کے ہر ورق کو تاریک کر دیا ہے

میں ایک گلی ہوں

اور ایک دشینت

ابھی ابھی اس گلی سے گزرا ہے

تم بھی آؤ۔۔۔

اس نظم میں شکنتلا، دشینت ہندی دیو مالائی تلمیح ہیں۔شکنتلا سوامی وشوامتر اور مینکا اپسرا کی لڑکی ہے جس کو ہستنا پور کے راجا دشینت سے پیار ہو جاتا ہے پھر دشینت اس کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے کے بعد اس کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔جس کی وجہ سے راجکماری شکنتلا کو بے عزتی اور پریشانی جھیلنی پڑتی ہے۔یہ واقعہ مہابھارت میں موجود ہے۔اس تلمیح کے ذریعہ یعقوب یاور نے آج کے عورتوں کی بے بسی کو پیش کیا ہے۔ان صنعتوں کے علاوہ اور دوسری صنعتوں کو بھی یعقوب یاور نے اپنی شاعری میں برتا ہے۔جس میں لف ونشر، اشتقاق، مقابلہ، سوال جواب، تصحیف، وغیرہ ہیں۔غرض کہ یعقوب یاور کی شاعری میں بیان کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری میں اچھے تشبیہات عمدہ تلمیحات وتکرار اور تضاد کا استعمال بحسن خوبی کیا ہے۔جس سے ان کی شاعری میں معنویت پیدا ہوئی ہے۔

رہی بات بحروں کی تو یعقوب یاور نے اپنی شاعری میں بحر ہزج، بحر وافر، بحر متقارب، بحر رمل، وغیرہ کا استعمال کیا ہے ۔ساتھ میں ہندی ماتروں کا بھی استعمال ہے مجھے علم عروض سے کچھ خاص واقفیت نہیں ہے جو تھوڑی بہت ہے اس بنا پر میں نے ان کی شاعری کو دیکھا ہے۔کچھ اشعار کی تقطیع حسب ذیل ہیں:

کسی اجڑے ہوئے گھر میں کوئی مہمان بے معنی
کسی اجڑے۔ ہئے گر مے۔کئی مہما۔نبے مع نا
مفاعیلن ۔مفاعیلن ۔مفاعیلن ۔مفاعیلن
رگوں میں خوں نہ ہو تو جسم میں ہی جان بے معنی
رگومے خو۔نہوتو جس۔ممے ہیجا۔نبے مع نا
مفاعیلن ۔مفاعیلن ۔مفاعیلن ۔مفاعیلن

شعر میں بحر ہزج کا استعمال ہوا ہے اس بحر میں چار بار مفاعیلن جس میں ایک وتد دو سبب ہے۔

یعقوب یاور شاعری میں ان تمام اصول وضوابط کو برتتے ہیں جو شاعری میں برتی جاتی ہے جیسے رمز وایماں، کنایہ وغیرہ ساتھ ہی استاد شاعروں کے نقش قدم پر چلنے کی سعی بھی کیے ہیں اور اس میں کہیں کہیں کامیاب بھی ہوئے اور کہیں ناکام بھی ہوئے ہیں۔شہر آشوب، اس شاعری کو کہتے ہیں جس میں کسی شہر کی پریشانی و بربادی کا ذکر ہو یہ ایک صنف شاعری کی حیثیت رکھتی ہے۔اس میں سودا کا شہر آشوب بہت ہی عمدہ مانا جاتا ہے جس میں بربادی و ہنگامہ کا ذکر ہے۔اس راہ پر یعقوب یاور نے بھی چلنے کی کوشش کی ہے اور اپنے زمانے اور شہر کی تباہی و بربادی کو اپنی شاعری میں قلم بند کیا ہے۔جو شہر آشوب کی حیثیت رکھتا ہے۔اس ضمن کے اشعار ملاحظہ ہوں:

کل خواب میں آئے تھے میری ذات کے منظر — جس بات پہ نازاں تھا اسی بات کے منظر
سوکھے ہوئے جسموں سے بڑھے ٹوٹے ہوئے ہاتھ — ہاتھوں سے پھسلتی ہوئی خیرات کے منظر
انسان کے پیروں میں تھی زنجیر قناعت — اور ذہن میں پیروں کی کرامات کے منظر

تاریخ کے اوراق میں سوئے ہوئے فتنے / تدبیر کے جاگے ہوئے خطرات کے منظر
آکاش کو چھوتی تھی کمینوں کی بلندی / بازار میں بکتے ہوئے سادات کے منظر
سوئی کے اشارے پہ تھرکی ہوئی دنیا / گھڑیوں سے الجھتے ہوئے لمحات کے منظر
ملبوس سے چھپتی ہوئی مدہوش جوانی / سڑکوں پہ نظر آئے خرابات کے منظر

مذکورہ اشعار میں زمانے کی بربادی کا ذکر ہے اور ساتھ ہی اس کے اسباب وعلل کو بھی بتایا ہے اور لوگوں کی توہم پرستی کو بھی اجاگر کیا ہے۔ فیشن کے نام پر آوارگی کا ذکر ہے اور اس کے سبب عائد جرائم کی طرف اشارہ ہے انسانی قدروں کی گراوٹ نااہلوں کو عہدہ ملنا جس کی بنا پر سماج بربادی کے دہانے پر ہے ان چیزوں سے پورا سماج چاہے وہ شہر ہو یا گاؤں سب برباد ہو رہے ہیں۔ اسی طرح یعقوب یاور نے دوہے اور ترائیلے بھی لکھے ہیں۔

دوہا:

یہ سنسکرت لفظ دوگوہک سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہوتے ہیں فریاد کرنے کے اور یہ شاعری میں ایک صنف کی حیثیت اختیار کر چکی ہے یہ ہندی شاعری میں پیدا ہوئی ہے۔ دو مصرعے والے اشعار کو دوہے کہتے ہیں اور اب اردو میں بھی مروج ہے۔ یعقوب یاور نے اس پر بھی کوشش کی ہے جو مندرجہ ذیل ہے:

گاؤں کے رسیا دیکھ کے تڑپے لاگت آپ
گھر سے نکری چھوکری جیسے بل سے سانپ
اوپر والا کھس رہے بانٹت رہت ہے کھیر
جھکا جھکا بھوک ہے آوت جائیں پھکیر
دوئی لوگن کے گاؤں ماں جلت رہت ہی آگ
سب کی آپن باسری سب کا آپن راگ
دکھیا سارا گاؤں ہے رب سے کر پھر یاد
منہکا تنکا بھول جا ہم کا کرے یاد

مندرجہ بالا اشعار میں یعقوب یاور نے بولی میں دوہے کہے ہیں اور دوہے میں اس بات کا خیال کیا گیا ہے کہ وہ بولی کی حد میں رہے جس میں اودھی اور بھوجپوری کا سنگم موجود ہے جو الفاظ دوہے میں استعمال کیے ہیں اس کی نشاندہی کرنا ضروری سمجھا جو اودھی اور بھوجپوری میں مستعمل ہیں ''لگنا'' کو ''لاگت'' مستعمل ہے۔ ''نکلنا'' جو اردو الفاظ اودھی اور بھوجپوری میں ''نکرنا'' ہے اسی کو یعقوب یاور نے شاعر میں نکری استعمال کیا ہے۔ ''جن'' جن، کا متبادل بھوجپوری اور اودھی میں ''جھکا جھکا'' ہے۔ جس کو یعقوب یاور نے دوہے میں استعمال کیا ہے۔ ''دؤ'' کو دوئی ہے۔ ''جلنا'' کو ''جلت'' ''اپنا'' کو ''آپن'' استعمال کیا ہے اور ساتھ ہی میں تلفظ کا بھی خیال کیا ہے وہی املا لکھا ہے جو بولی میں بولی جاتی ہے جیسے فقیر کو پھکیر لکھا ہے۔ فریاد کو پھریاد لکھا ہے جیسے کو جئیسے۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یعقوب یاور اپنی علاقائی زبان پر واقفیت رکھتے ہیں۔ لیکن متذکرہ الفاظ کا صرف اودھی و بھوجپوری بولی میں ہونا ضروری نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اور بولیوں میں مستعمل ہوں اور مجھے اس کا علم نہ ہو کیوں کہ بولیاں الگ الگ مقام پر کچھ بگڑی شکل میں بولی جاتی ہیں اور کہیں نہ کہیں معنی میں یکسانیت بھی ہوتی ہے۔ جدید دور کے دوہا نگاروں نے غزل کی طرح سے اس میں بھی وسعت پیدا کی ہے اور دوہے میں ہر طرح کے موضوعات کو جگہ دی ہے۔ یعقوب یاور نے دوہا کو فن اور موضوع کے اعتبار سے وسعت دینے کی کوشش کی ہے جس میں غزل کو دوہے کے ساتھ ملا دیا ہے اور 'دوہا غزل' کے عنوان سے انھوں نے دوہا لکھا ہے:

سکھ کے پھول بکھیریا دکھ کے ڈیرے ڈال
تجھ کو سب معلوم ہے میرے دل کا حال
کیسریا بنتا گیا، ہریالی کا کال
پھر بھی ہم سب ایک ہیں بھارت ماں کے لال
لوٹ تو آویں گے بھلا پردیسی من میت
گاؤں کی تپتی ریت پھر پھیلاتی ہے جال
جھوٹے کا جھوٹا سکھا، سچ کا سکھا نہ کوئے

سچ سے رشتہ جوڑنا جیون کا جنجال
وِکرم کی مردانگی ہاری سوسو بار
قصے کی جا دو گری جیت گیا بیتال
یاؔور جی کو کیا کہیں قسمت کے ہیں پھیر
کھا کر پان بنارسی بھول گئے بھوپال

اس دوہے کے اندر یعقوب یاور نے جدت اور ندرت پیدا کی ہے۔غزل اور دوہے کے عناصر کو یکجا کر کے ایک نئی کوشش کی ہے۔جس میں وہ کامیاب ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔

ترائیلے:

یہ ایک فرانسیسی صنف سخن ہے جس کا وجود تیرہویں صدی عیسوی میں ہوا۔فرانسیسی شاعر اڈنس۔لے رائے نے پہلی بار اس صنف کا تجربہ کیا۔ترائیلے کا صحیح نام ٹرایولٹ(Triolet) ہے۔ترائیلے اپنی ہیئت کے اعتبار سے آٹھ مصرعوں پر مشتمل نظم ہے۔ترائیلے میں صرف دو قافیہ استعمال ہوتے ہیں۔اس صنف میں بھی یعقوب یاور نے طبع آزمائی کی ہے۔ترائیلے اشعار ملاحظہ ہوں۔

قلم گوید کہ من شاہ جہانم
قلم ابلیس کی اولاد بھی ہے
قلم کا خاک و خوں پر رقص پیہم
قلم گو ید کہ من شاہ جہانم
قلم کا زد چہرہ آنکھ پرنم
قلم کی اپنی کچھ فریاد بھی ہے
قلم گوید کہ من شاہ جہانم
قلم ابلیس کی اولاد بھی ہے

ان کے اس ترائیلے میں مصرعوں کی جو تکرار ہے اس میں نئے معنی و مفاہیم اجاگر ہوتے

ہیں۔ترائیلے کے مصرعوں کی تکرار کے بارے میں ڈاکٹر عنوان چشتی لکھتے ہیں:

''ترائیلے کی کامیابی کا معیار یہ ہے کہ جن مصرعوں کی تکرار ہو وہ فضول معلوم نہ ہو بلکہ اس جگہ رکھے جانے کے لیے ناگزیر ہوں اور خیال اور جذبے زور، دباؤ اور ارتکازی پوری طرح ترسیل کرتے ہوں۔''7

یعقوب یاور نے 'نرگس' کے عنوان سے ایک دوسرا ترائیلہ لکھا ہے جس میں وہ خوبیاں موجود ہیں جس کو عنوان چشتی نے ترائیلے کے لیے بتایا ہے۔

مجھے جو دیدہ ور گردانتی تھی
وہ نرگس آنکھ کھولے سورہی ہے
مرے بارے میں کیا کچھ جانتی تھی
مجھے جو دیدہ ور گردانتی تھی
مجھے صدیوں کا حاصل مانتی تھی
مری راہوں میں کانٹے بوگئی ہے
مجھے جو دیدہ ور گردانتی تھی
وہ نرگس آنکھ کھولے سو رہی ہے

اس ترائیلے میں جس مصرعے کی تکرار ہے وہ یہ ہے''مجھے جو دیدہ ور گردانتی تھی'' یہ مصرعہ اپنی تکرار کے ساتھ معنیاتی سطح کو اپنے اندر پیوست کیا ہے۔اس کے تکرار سے شعر میں کہی گئی بات کی تاکید ہوتی ہے۔

ہائیکو:

یہ ایک جاپانی صنف سخن ہے لیکن جب یہ اردو میں مروج ہوئی تو اس میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔اس صنف میں عام طور پر مناظرِ فطرت کے مشاہدات و تجربات وغیرہ کو پیش کیا جاتا ہے۔لیکن یہ بات بھی ہے کہ یہ صنف موضوع کی قید سے آزاد ہے۔اردو میں تقریباً تمام موضوعات پر ہائیکو لکھے جاتے ہیں۔اس میں تین سطریں بالترتیب ہوتی ہیں۔اردو میں ہائیکو کی حیثیت ثلاثی، ماہیا اور تثلیث کی ہوگئی

ہے۔ پروفیسر عنوان چشتی ہائیکو کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جاپانی شاعری کی وضع قطع اور ہیئت اردو شاعری سے بالکل مختلف ہے۔اس میں قافیہ ہوتا ہے نہ بحر،مگر اس میں آہنگ ضرور ہوتا ہے۔ یہ آہنگ انگریزی اور اردو کے آہنگ سے مختلف اور پیچیدہ ہے۔ جاپانی شاعری میں آہنگ کی تخلیق کے لیے شاعری اپنی نظم کے ہر مصرع کو دو حصوں میں اور ہر مصرعے کا جز ۲۔۴۔۴۔۳۔۲۔۳ ارکان پر مشتمل ہوتا ہے جاپانی شاعری میں ہر مصرع کے ارکان کی مخصوص تعداد اور ترتیب اس کو پر آہنگ بنا دیتی ہے۔ یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ جاپان کی شاعری کا رکن بھی اردو یا انگریزی کے رکن سے مختلف ہوتا ہے۔ پھر بھی مصرعے کے پانچ یا سات اجزاء کو رکن تصور کیا جا سکتا ہے اور اس کی مخصوص ترتیب سے آہنگ وجود میں آتا ہے۔'' 8

یعقوب یاور نے ثلاثی کے انداز میں ہائیکو غزلیں لکھی ہیں جو مندرجہ ذیل ہے:

آنکھوں نے پٹ بند کیے تھے
اور بھیانک خواب کے منظر ٹوٹ پڑے تھے
آنکھ کھلی تو آگ اور خون کے سارے منظر وہیں کھڑے تھے

سچ اپنے اوصاف سے بوجھل شرمندہ تھا
منزل پانے کو جیسے ہی بھٹکا راہی
جھوٹ کے لشکر ہار چکے تھے

یہ دنیا اک قبرستان ہے
میری قبروں کو وسعت دے کر سب قبروں سے جوڑ دیا ہے
میں نے عزم و عمل سے رشتے توڑ لیے تھے

شیش محل سے پھونس کا چھپر
عیش کی بازی پلٹ چکی تھی
پھر بھی تصور میں بالا خانے کے گھنگر وکھنک رہے تھے

غم کا دریا بہتے بہتے خوشیوں کے ساگر تک آ گیا تھا
چشم فلاک آئینہ حیرت
صدا افسوس کہ یاور کے سب تاریک نفس ہی ٹوٹ چکے تھے

یعقوب یاور نے اپنے ہائیکو میں جن موضوعات کو رکھا ہے ان میں عصری مسائل ہیں۔ یعقوب یاورصنف شاعری کی دنیا سے بخوبی واقف ہیں اور شاعری پر ان کی دسترست بھی ہے۔شاعری کے تقریباً ان تمام اصناف پر قلم اٹھایا جو شاعری میں مروج ہیں چاہے وہ قدیم اصناف جیسے حمد، نعت، منقبت، غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ یا پھر نئے تجربات ترائیلے، ہائیکو، دوہے وغیرہ اور ان پر یعقوب یاور نے شاعری کی ہے۔ جس کو مندرجہ بالا سطروں میں پیش کیا گیا ہے اس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہیں۔ یعقوب یاور کی آزاد ومعریٰ نظموں میں وہ ساری باتیں موجود ہیں جو ان کے موزون شاعری میں ہیں۔فن کے اعتبار سے انھوں نے آزاد نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں وہ کامیاب ہیں۔آزاد نظم کے بارے میں عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

> ''آزاد نظم پر غور کرتے ہوئے سب سے پہلے اس کی ہیئت پر نظر پڑتی ہے۔اس میں مروجہ اور متداول بحروں کو استعمال کیا جاتا ہے لیکن چونکہ ان بحروں کا آہنگ شاعر کے خیال کا پابند ہوتا ہے۔اس لیے وہ اس کی روانی یا بہاؤ کی نسبت سے بحر کے مروجہ ارکان کو گھٹا بڑھا دیتا ہے۔ظاہر ہے کہ اس سے بحر کی مخصوص آہنگ میں کوئی فرق نہیں آتا۔ارکان کے گھٹنے بڑھنے کا عمل جب شروع ہوتا ہے تو اس میں قافیے اور ردیف کی پابندی لازمی نہیں ہوتی لیکن اگر قافیہ خیال کے آہنگ اور موسیقی کا ساتھ دے اور

فطری طور پر آئے تو آزاد نظم کا شاعر اس کو نظر انداز نہیں کرتا۔''9؎

یعقوب یاور نے آزاد نظم کی جو لوازمات ہوتے ہیں ان کو اپنی نظموں میں برتا ہے۔ موضوعی سطح پر ان کی نظموں کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ آزاد نظم میں جب کوئی بات کہتے ہیں تو مصرعہ در مصرعہ اس بات کی وضاحت وصراحت ہوتی چلی جاتی ہے۔ محبت کے عنوان سے ان کی ایک آزاد نظم ملاحظہ ہو جس میں انھوں نے محبت کو اس طرح سے پیش کیا ہے جس کی مثال اردو کے اور شاعروں میں کم ملتی ہے۔ نظم ''محبت'' ملاحظہ ہو:

محبت وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو
یہ کوئی اور ہی شئی ہے
اسے قہر خدا سمجھو
کہ تم محروم ہو احساس الفت سے
محبت ایسا اک احساس ہے
نازک بھی پوشیدہ بھی عریاں بھی
جسے لفظوں کا پیرہن عطا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے

....

....

....

پہاڑ اپنی جگہ ساکت کھڑے ہیں یہ محبت ہے
یہ دریا بہہ رہا ہے یہ محبت ہے
چمن میں گل کھلے ہیں یہ محبت ہے

یہ نظم اپنی آزاد نظم ہونے کے ساتھ معنی کو پوری طرح کھولتے ہوئے چلی گئی ہے جو ایک کامیاب

آزاد نظم ہونے کی شرط ہے اوراس کو یعقوب یاور نے اپنی نظم میں پورا کیا ہے۔اس کے علاوہ ان کے مجموعے میں اچھی تعداد میں آزاد نظم موجود ہیں۔

اس طرح یعقوب یاور نے شاعری کی تمام اصناف کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔اور شاعری کے فنی لوازمات کو اپنی شاعری میں بخوبی برتا ہے چاہے وہ علم بیان ہو جس میں تشبیہ واستعارہ وغیرہ آتے ہیں اس کا استعمال انھوں نے اشعار میں سلیقے سے کیا ہے اس سے ان کی شاعری میں شگفتگی آئی ہے اشعار دلچسپ اور معنی خیز ہوئے ہیں ساتھ ہی علم بدیع کے صنعتوں کا استعمال بھی ان کی شاعری میں ہوا ہے۔اس میں تکرار، تضاد، مناسبت لفظی، تلمیح وغیرہ ہیں۔ان کے استعمال سے یعقوب یاور کی شاعری میں پختگی آئی ہے۔یعقوب یاور نے پورے ہوش مندی اور خوش اسلوبی سے ان اصطلاحات کا استعمال اپنی شاعری میں کیا ہے۔غرض کی یعقوب یاور کی شاعری فن کے اعتبار سے بھی کامیاب نظر آتی ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1۔شخصی انٹرویو، یعقوب یاور،16 دسمبر 2017

2۔مجموعہ ''الف''، یعقوب یاور، ص:9

3۔کتاب غزل، نذیر بنارسی، ص:1

4۔مجموعہ ''قلم گوید''، یعقوب یاور، ص:1

5۔مجموعہ ''الف''، یعقوب یاور، ص:9

6۔مجموعہ ''قلم گوید''، یعقوب یاور، ص:4

7۔اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے، عنوان چشتی، ص:190

8۔ایضاً، ص:191

9۔جدید شاعری، عبادت بریلوی، ص:311

باب چہارم

تحقیق و تنقید

تحقیق وتنقید کے میدان میں یعقوب یاور کی نو کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ان میں سات کتابیں ایسی ہیں جو ان کی تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں اور ایک ان کا پی ایچ۔ڈی کا مقالہ ''ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری'' جو کتابی شکل میں منظر عام پر آ چکا ہے۔یعقوب یاور کے تنقیدی مضامین اکثر شخصیات اور ان کے فن پر ہے۔جن نامور شخصیات کا انھوں نے اپنی تنقید کا حصہ بنایا ہے ان ادیبوں میں غالبؔ، سرسید، فیضؔ، مجروحؔ، منٹوؔ، آغا حشر کاشمیری وغیرہ ہیں۔بھوپال سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں پر ان کی تنقیدی مضامین زیادہ ہیں جن میں اختر سعید، اختر وامق، شاہد اختر، محمد علی تاج بھوپالی وغیرہ ہیں اور ایک کتاب آغا حشر کاشمیری شخصیت اور فن ہے جس میں انھوں نے آغا حشر کی ادبی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

یعقوب یاور کا تنقیدی نظریہ یہ ہے کہ وہ کسی تنقیدی دبستان اور مرکزی نظریے کے متحمل نہیں ہیں انھوں نے جن جن شخصیات پر تنقیدی کی ہے کسی خاص نظریے کے تحت ان کے فن کو نہیں پرکھا ہے بلکہ فن کے لوازمات سے ان شخصیات کی تحریروں کا جائزہ لیا ہے اور ان کی قدر متعین کی ہے۔یعقوب یاور لکھتے ہیں:

> ''اگر فن کار کو اپنی زندگی میں شہرت اور مقبولیت حاصل ہوتی ہے تو اس کی وجہ اس کا کلام ہوتا ہے جو براہ راست قاری یا سامع تک پہنچتا ہے لیکن ہمارے زمانے کا معاملہ کچھ دوسرا ہے جیسے جیسے قارئین اور سامعین کا دائرہ سمٹتا جا رہا ہے ویسے ویسے نقادوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔'' 1؎

یعقوب یاور تخلیق کار کی حیثیت اور ان کے قدر کی تعین فن کی بنا پر کرتے ہیں اور ان کا ماننا ہے کہ کسی بھی فن کار کا فن قاری اور سامع کو اچھا لگنا چاہیے جس کی بنا پر تخلیق کار کے تخلیقات کی وقعت و اہمیت و مقبولیت خاص و عام میں زیادہ ہوتی ہے اور وہ ادیب اپنے فکر و فن کے ذریعے ادب میں ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔قاری

کے علاوہ کسی نقاد کے ذریعے جب ادیب کی قدر متعین کی جاتی ہے تو اس میں ترسیل کچھ حد تک مفقود ہوتا ہے اس لیے تخلیق ایسی ہونی چاہیے کہ قاری بذات خود مصنف کے کلام سے مستفید ہو اسے کسی توسط کی ضرورت نہ پڑے۔ یعقوب یاور تخلیق اور تنقید کی بحث میں تخلیق کو اولیت دیتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ تخلیق تنقید سے اونچے کی چیز ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اسے ہمارے عہد کی ستم ظریفی ہی کہا جائے گا کہ اب بار بار یہ یاد دلانے کی ضرورت محسوس ہوتی رہتی ہے کہ تنقید و تحقیق کے مقابلے میں تخلیق کی افضلیت و اولیت مسلم ہے۔ تخلیق کے بغیر تنقید کا وجود بے معنی ہے۔ لیکن اس ستم ظریفی کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ معاصر تنقید کا بیشتر حصہ ادب کی رفتار کا ساتھ دینے اور اس کے قدم بقدم چلنے کے بجائے اپنی ہی روایات کے سحر میں گم ہے۔ تخلیق ادب میں لحہ بہ لحہ جو متنوع تبدیلیاں آ رہی ہیں، ان کے حساب سے تنقید کے اصول و نظریات میں بھی تبدیلی آنا چاہیے تھی۔ لیکن ایسا ہو نہیں رہا ہے۔''[2]

یہ بات حقیقت پر منحصر ہے کہ ادبی سرمائے میں تخلیق کو افضلیت حاصل ہے لیکن بولی و زبان کو ادب بننے کے لیے بہت وقت لگتا ہے اور انھیں اس دوران تنقیدی راستے سے گزرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے تخلیق اور تنقید دونوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ جب کوئی ادیب کوئی تخلیق کرنا چاہتا ہے تو اس کا ایک خاکہ اس کے ذہن میں موجود ہوتا ہے۔ اس خاکے کو صفحۂ قرطاس پر لانے سے پہلے کئی بار اپنی تنقیدی ذہن سے ادیب اسے گھٹاتا بڑھاتا ہے۔ پھر تخلیق کا جامہ پہناتا ہے۔ اس طور پر بھی دیکھیں تو تنقید اور تخلیق دونوں کی اہمیت اپنی اپنی جگہ پر ثابت ہے۔

شاعری کی تنقید میں یعقوب یاور کا نظریہ تنقید یہ ہے کہ وہ کسی کے کلام کو دو زاویے سے دیکھتے ہیں پہلا شاعر کے فکر و خیال کی نوعیت کا پتا لگانا، اور دوسرا موضوع کے بیان میں شاعر کس طرح کا اسلوب اختیار کرتا ہے۔ ان ہی دونوں زاویے سے یعقوب یاور نے شعراء کے کلام کو پرکھا اور جانچا ہے۔ یعقوب یاور موضوع اور فن دونوں کو شاعری میں اہمیت دیتے ہیں لیکن فن کی طرف ان کی رغبت زیادہ ہے وہ لکھتے ہیں:

''کسی شاعر کے کلام کا تجزیہ کرتے وقت بنیادی طور پر اسے دو زاویوں سے دیکھنا ہوتا ہے پہلا زاویہ نظر ان نکات پر مرکوز ہوتا کہ شاعر کے فکر وخیال کی نوعیت کیا ہے۔اس کے خیالات کا معیار کیا ہے،وہ معاشرے کے لیے مفید ہے یا غیر مفید،اس کا ذہن کیسی باتوں اور کیسے موضوعات کو اپنی شاعری کے لیے منتخب کرتا ہے۔دوسرے زاویہ نظر کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ ان تمام باتوں کے لیے اظہار کا کون سا پیرایہ اختیار کرتا ہے۔اس کے تحت اس کی زبان ،اس کا ذخیرۂ الفاظ ،اس کا سلیقہ سب زیر بحث آجاتے ہیں اب اگر کسی شاعر کا ذہن فکری اعتبار سے اعلی درجے کا ہے اور اظہار پر اسے قدرت نہیں یا فکری اعتبار سے وہ کمزور ہے لیکن اظہار کا پیرایہ دلکش ہے تو اس کی عظمت پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔پھر بھی اول الذکر کے مقابلے میں ثانی الذکر کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔''3

لیکن اگر ادب کے ادوار کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وقت کے حساب سے ادب میں تغیر وتبدل واقع ہوا ہے تخلیق میں کبھی فن کو اہمیت حاصل ہوئی تو کبھی فکر وخیال کو اسی وجہ سے ایک ہی شاعر کسی زمانے میں معروف ومشہور ہوتا ہے۔تو وہی شاعر کسی دوسرے زمانے میں غیر مقبول ہو جاتا ہے۔

افہام:

یہ یعقوب یاور کی تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔جو 2015 میں عرشیہ پبلیکیشنز سے شائع ہوا۔اس کتاب کا انتساب پروفیسر عبدالقوی دسنوی اور جناب حیدر عباس رضوی کو کیا گیا ہے۔یہ کتاب اتر پردیش اردو اکادمی کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی۔اس کتاب میں کل 19 مضامین ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

1۔غالب، بنارس اور مثنوی چراغ دیر

2۔۱۸۵۷ء: کچھ غالب کی حمایت میں

3۔سید احمد خاں اور بنارس

4۔انیسویں صدی کی ایک اصلاحی تحریک،آریہ سماج

5۔انیسویں صدی کے چند لازوال مزاحیہ کردار

6۔کبیر کی شاعری میں بقائے باہمی کا تصور

7۔دریائے لطافت: ایک بازدید

8۔اردو ہندی اور پریم چند

9۔ادب کی صنفی شناخت

10۔آغا حشر کے طبع زاد اردو ڈرامے

11۔ڈاکٹر عبدالعلیم: ایک پیچیدہ ترقی پسند شخصیت

12۔منٹو فہمی: کچھ نفسیاتی پیچ وخم

13۔یادوں کی بارات اور احباب جوش

14۔فیض کی ترقی پسندی

15۔ادب کے تقاضے اور ابن صفی

16۔چارناک کی کشتی، ایک ذاتی تاثر

17۔ابو محمد سحر کی شاعری

18۔حفیظ بنارسی کی شعری کائنات

19۔خوشہ چین اقبال، سلیمان آصف

یہ مضامین انھوں نے سمیناروں کے لیے لکھا تھا۔ان انیس مضامین میں کچھ مضامین ایسے ہیں جو شخصیت اور فن پر ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو تاریخی نوعیت کے ہیں۔ پہلا مضمون ’’غالب بنارس اور مثنوی چراغ دیر‘‘ اس مضمون میں غالب کے بنارس آنے کی تاریخ اور قیام کا ذکر ہے۔مثنوی ’’چراغ دیر‘‘ میں بنارس کا مقام ومرتبہ اور اس کا ذکر یعقوب یاور نے اس مضمون میں کیا ہے۔غالب نے اپنی اس مثنوی میں بنارس کی تعریف کے ساتھ ساتھ یہاں کی دلکش عمارتوں، سبزہ زار قدرتی حسن کا بیان کیا ہے۔اس مثنوی میں کل

108 اشعار ہیں۔ یہ عدد ہندوؤں و باشندگان بنارس کے عقائد کی رو سے بے حد مقدس سمجھا جاتا ہے۔اسی تقدیس کی بنیاد پر جاپ کی مالا میں کل 108 منکے رکھے جاتے ہیں۔مثنوی کے ان اسباب وعوامل کو جس کے ذریعے مثنوی وجود میں آئی۔یعقوب یاور نے اس مضمون میں اس کا ذکر کیا ہے۔ساتھ ہی مثنوی کے ان اشعار کو بھی اس مضمون میں لکھا گیا ہے۔جن میں غالب نے بنارس کی تعریف کی ہے۔یعقوب یاور اس مضمون میں لکھتے ہیں۔

> ''اپنے کچھ خطوط اور مثنوی چراغ دیر میں غالب نے بنارس کے ساتھ ساتھ یہاں دلکش عمارتوں کی کثرت ،سبزہ زار اور قدرتی حسن کا بھی ذکر کیا ہے۔غالب جب یہاں آئے تھے تو یہ شہر واقعتاً خوبصورت باغات اور گھنے جنگلات کا شہر تھا۔شہر میں جگہ جگہ متعدد خوبصورت کنڈ موجود تھے۔بیشتر کوٹھیوں سے ملحق باغات تھے۔جن کے گھروں میں یہ سہولت میسر نہ تھی انھوں نے شہر کے باہر اپنے باغات بنا رکھے تھے، جہاں فرصت کے اوقات میں جا کر رہائش اختیار کرتے تھے۔مقامی اصطلاح میں اس عمل کو'بہری النگ' کہا جاتا ہے سارا شہر ہرے بھرے درختوں سے پر تھا۔یہ تمام باتیں ہمیں ان پینٹنگس کو دیکھنے سے معلوم ہوتی ہیں جو مصور بنارس جیمس پرنسپ نے بنائی تھیں واضح رہے کہ پرنسپ کا بنارس میں رہائش کا زمانہ وہی ہے جو غالب کے بنارس میں ورود کا زمانہ ہے اس زمانے میں بنارس کا ایک رائج نام'آنند کانن' بھی تھا یعنی گلشن مسرت یا بقول غالب بہشت خرم۔'' 4

ان تما چیزوں کا ذکر غالب نے اپنی مثنوی'چراغ دیر' میں کیا ہے جس سے بنارس کی وہ تمام چیزیں اجاگر ہوتی ہیں جو غالب کے بنارس میں ورود کے وقت تھیں۔

اسی طرح دوسرا مضمون''۱۸۵۷ء کچھ غالب کی حمایت میں''اس مضمون میں 1857 کی بغاوت کا ذکر ہے۔لیکن غالب کے اس نظریہ کو اس مضمون میں پیش کیا گیا ہے جس کو غالب نے اپنی کتاب دستنبو میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔اس کتاب میں انگریزوں کی تعریف ہے اور 1857 کے مجاہدین کے لیے توہین آمیز ہجویہ کالمات ہیں۔یہ کتاب 1858 میں شائع ہوئی۔غالب اس بغاوت کو نفرت کی نظر سے دیکھ رہے

تھے۔اس کے پیچھے کئی اسباب تھے غالب ذہین شاعر اور حساس فنکار تھے۔جس طرح سرسید نے اسباب بغاوت ہند لکھا اسی طرح ان کی کتاب دستنبو ہے۔یعقوب یاور نے اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ غالب نے جو اس کتاب میں انگریزوں کی تعریف کی ہے۔یعقوب یاور لکھتے ہیں:

''مرزا غالب نے 11 مئی 1857 سے لے کر 31 جولائی 1858 تک رونما ہونے والے ایسے واقعات کو فارسی زبان میں دستنبو کے عنوان سے قلم بند کیا ہے، جس میں بغاوت کی تفصیلات کے دوش بدوش ان کے خاندانی قوائف کا بیان بھی موجود ہے۔بغاوت سے متعلق واقعات کے وہ چشم دید گواہ نہیں تھے۔وہ اس ہنگامے کے دوران اپنے گھر سے باہر بھی نکلتے تھے۔ظاہر ہے ان کے سارے بیانات سنے سنائے تھے۔ان کے راوی معتبر ہوسکتے ہیں لیکن یہ ضروری بھی نہیں۔سوال یہ ہے کہ مستعار معلومات کے باوجود انھوں نے آخر ان واقعات کو قلم بند کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟ اس کا مقصد تاریخ نویسی بہر حال نہیں ہوسکتا۔۔۔اس کا مقصد محض یہ تھا وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ انگریزی حکام نہ صرف ان حالات کو قلم بند کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے بلکہ انھیں انعام و اکرام سے بھی سرفراز کر رہے تھے ۔۔۔اس لیے جب انھوں نے دیکھا کہ لوگ اس ہنگامے کی تفصیلات تحریر کر کے انگیز آقاؤں کو خوش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو انھیں بھی یہ کام اپنی وفاداری ثابت کر کے اپنی مفاد کی تکمیل کا ایک ذریعہ نظر آیا۔''5

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ غالب نے انگریزوں کی تعریف صرف اپنی ذاتی زندگی کی پریشانی کو دور کرنے اور انعام و اکرام حاصل کرنے کے لیے کیا تھا۔ساتھ ہی 1857 کی بغاوت میں جو واقعات رونما ہو رہے تھے۔اس سے غالب کو یہ اندازہ تھا کہ اس بغاوت میں ہندوستانیوں کا زیادہ نقصان ہو سکتا ہے۔اس لیے غالب کے خیال سے پہلے ہندوستانیوں کو مضبوط ہو جانا چاہیے۔تب انگریزوں کے ساتھ بغاوت کرنی چاہیے تھی۔انھیں تمام چیزوں کو یعقوب یاور نے اس مضمون میں جگہ دیا ہے۔اس کتاب کا ایک اور مضمون ''انیسویں صدی کی ایک اصلاحی تحریک (آریہ سماج)'' یہ مضمون بھی دلچسپ ہے اس مضمون میں

ہندوؤں کی طرف سے انگریزوں کے خلاف جو آواز اٹھائی گئی تھی اس کا ذکر ہے۔ ہندوؤں میں پھیلی قدامت پسند رسم ورواج سے ہندوؤں میں جو خرابی وخرافات پھیلی ہوئی تھی اس کو دور کرنے کے لیے جن مفکروں نے آواز اٹھائی ان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ خاص طور پر راجا رام موہن رائے۔ جنھوں نے ایک ہندو کالج کی بنیاد رکھ کر اس بات کی پہل کی جس سے ہندو عصری تعلیم سے وابستہ ہوسکیں۔ اس کالج میں ہندوستانی زبانوں کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان اور مغربی علوم کی تعلیم کا بھی انتظام تھا۔ راجا رام موہن رائے ہندوستانی عوام کو احساس کمتری کی دل دل سے باہر نکالنے والے پہلے شخص تھے۔ وہ فارسی، عربی اور سنسکرت کے بڑے عالم تھے۔ ساتھ ہی انھوں نے برہم سماج کے نام سے ایک اصلاحی تحریک کی بنیاد رکھی۔ یہ تحریک کافی دن چلی بعد میں اسی تحریک کا نام آریہ سماج رکھا گیا۔ جس کے بانی سوامی دیانند سرسوتی تھے۔ اس تحریک میں ہندو مذہب کو پھیلانے پر خاص زور دیا گیا۔ لیکن ان کی شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ ہر آریہ کو تمام مذاہب کے لوگوں کے ساتھ محبت وعدل اور رواداری رکھنی ہے۔ آریہ سماج کا بنیادی مقصد انسان کی فلاح و بہبودی تھی۔ دیانند سرسوتی اس تحریک کی ترویج وترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ لیکن بعد میں اس آریہ سماج کے متحرکین شدت پسندی کی طرف راغب ہوئے اور دوسرے لوگوں پر جبر کرنے لگے۔ جس سے دھیرے دھیرے فساد رونما ہونے لگا جو آریہ سماج (تحریک) سے بالکل الٹا ہے۔ انھیں تمام عناصر کو یعقوب یاور نے مضمون کی شکل دی ہے۔ جو حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ ایک معلوماتی مضمون ہے۔

مرغزار افکار:

یہ یعقوب یاور کی ان تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے بھوپال سے متعلق شعراء و ادباء پر مضامین لکھے ہیں۔ اور یہ مضامین اخبار ورسائل میں شائع بھی ہوئے ہیں۔ اس کتاب میں کل 22 مضامین ہیں۔ جس کے عنوان حسب ذیل ہیں:

بھوپال اور میں (دیباچہ)

1۔ اختر سعید خاں کا شعری لہجہ

2۔اختر وامق

3۔امتیاز انجم

4۔پروفیسر حنیف نقوی کی شاعری

5۔ساجد سنجی لکھنوی اور ریختی

6۔سرسوتی سرن کیف اور ان کی نظم شکتی

7۔سرفراز دانش

8۔سعادت عابدی کے دوہے

9۔شاہد اختر

10۔شجاع فرخی

11۔صابر ادیب

12۔ظفر صہبائی

13۔عبدالمتین نیازی

14۔عشرت قادری

15۔فضل تابش: ایک بازدید

16۔محمد علی تاج

17۔مرتضیٰ علی شاد

18۔نجیب رامش

19۔نسیم انصاری

20۔نصیر پرواز

21۔نور محمد یاس

مندرجہ بالا مضامین سوانحی ہیں۔جس میں شاعروں کے بارے میں اوران کی شاعری پر بحث کی گئی ہے۔'بھوپال اور میں' کے عنوان سے جو مضمون ہے اس میں یعقوب یاور نے اپنا سوانحی خاکہ پیش کیا ہے۔ساتھ ہی اپنی زندگی کے ان واقعات کو بھی لکھا ہے۔جس میں وہ جدو جہد کرر ہے تھے۔ہائی اسکول کے بعد تعلیم کے منقطع ہونے پر روزی روٹی کے لیے ان کا مختلف شہروں کا چکر لگانا پھر بھوپال میں ایک طویل عرصے تک قیام پزیر رہنا اوران کے تعلیمی مراحل وغیرہ کا ذکر اس مضمون میں موجود ہے۔اس کتاب کے سارے مضامین ایسے ہیں جن سے شخصی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔انھوں نے بھوپال کی ان شخصیات کو منتخب کر کے لکھا ہے جن کے بارے میں تحریریں بہت کم ملتی ہیں۔لیکن ان تمام شخصیات نے اردو ادب کو اچھا خاصا سرمایہ دئے ہیں۔یعقوب یاور لکھتے ہیں:

> ''مرغزار افکار کی یہ پہلی جلد میرے ان تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو میں نے مختلف اوقات میں بھوپال سے متعلق شعراء پر لکھے تھے اور جو لکھے جانے کے بعد مختلف اوقات میں کسی نہ کسی اخبار یا رسالے میں شائع ہوتے رہے۔ان میں سے کچھ مضامین لوگوں کی فرمائش پر اور کچھ دل کی تحریک کے تحت الگ الگ اوقات میں سپرد قلم کیے گئے تھے۔اب جب ان کی تعداد اتنی ہوگئی کہ میں انھیں ایک مجموعے کی شکل دے سکتا تھا تو مجھے احساس ہوا کہ اس میں بھوپال کے چند ایسے نمائندہ فنکار موجود نہیں ہیں، جن کی بنا پر لکھی جانے والی کوئی کتاب تشنہ ہی رہے گی چنانچہ میں ان شعراء کی فہرست تیار کی، جن پر بہ وجوہ میں ابھی تک قلم نہیں اٹھا سکا تھا اور باری باری ان پر مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا خدا کا شکر ہے کہ اب یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔اب میں مطمئن ہوں کہ میں نے بڑی حد تک بھوپال کے اس عہد کے نمائندہ شعراء کا احاطہ کرلیا ہے۔''6

اس کتاب میں بھوپال کے شعراء وادباء کا ذکر جس طرح سے ملتا ہے اس طرح سے کسی دوسری کتاب میں کم ملتا ہے۔اس کتاب میں بھوپال کے شعراء وادباء پر جامع بحث کی گئی ہے جس سے بھوپال کا

ادبی منظر نامہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ساتھ ہی یہ پتا چلتا ہے کہ عہد حاضر میں بھی اس شہر میں اردو سے رغبت رکھنے والوں کی تعداد کثرت سے موجود ہے۔مضامین لکھنے کا انداز سادہ ہے عبارت عام بول چال کی ہے۔

تحریک وتعبیر:

یہ کتاب یعقوب یاور کے بارہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں دو مضمون کے علاوہ تمام کا تعلق ترقی پسند سے ہے۔

1۔بیسویں صدی کے کچھ ادبی رجحانات

2۔ترقی پسندی کل اور آج

3۔ترقی پسندوں کی بھوپال کانفرنس

4۔جدید ادبی تحریک ایک جوابی سازش

5۔جواہر لال نہرو اور ترقی پسند تحریک

6۔مجاز کا تصور انقلاب

7۔مجروح کی غزل

8۔محمد علی تاج بھوپالی

9۔کچھ کیف بھوپالی کے بارے میں

10۔شاہد اختر کی ترقی پسندی

11۔فضل تابش کی شاعری

12۔ڈاکٹر ناظم جعفری گہر شناسی سے گہر باری تک

اس کتاب کا دو مضمون جس کا تعلق ترقی پسند سے نہیں ہے ان میں ’بیسویں صدی کے کچھ ادبی رجحانات‘ اور ’جدید ادبی تحریک ایک جوابی سازش‘ ہے۔یعقوب یاور نے ’بیسویں صدی کے کچھ ادبی تحریکات

کے ابتدائی خد و خال کو پیش کیا ہے۔جس میں مثالیت پسندی، رومان پسندی،حقیقت پسندی،ترقی پسندی، لاشعوریت، اظہاریت اور جدیدیت ہے۔انھوں نے ان سب کا ذکر نظریاتی سطح پر کیا ہے۔لیکن جب یہ نظریات ادب میں داخل ہوتے ہیں تو موضوع اور فن میں یہ نظریات تبدیلی کے ساتھ واقع ہوتے ہیں۔یعقوب یاور جدیدیت کے تعلق سے اس کے ابتدائی نظریہ کو لکھا ہے:

''وجودیت کا نظریہ خدا کے اقتدار کا منکر ہے۔اس کے تحت خدا کا کوئی وجود نہیں ہے تقدیر کچھ نہیں ہے ۔انسان خود ہی اپنا مالک ہے وہ وہی بنتا ہے جو وہ بننا چاہتا ہے۔خدا کے مقابلے انسان کا وجود زیادہ اہم ہے اس لیے ہر ایک کو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے ہمہ وقت کوششیں کرتے رہنا چاہیے۔خدا کی عبادت میں وقت ضائع کرنا محض لا حاصل ہے۔اردو میں جدیدیت کے پہلو بہ پہلو یہ نظریہ بھی کام کرتا رہا۔کئی جدید ادیبوں نے خدا کے خلاف آواز بلند کی اور انسانیت کی فلاح کے لیے فن پارے تخلیق کئے لیکن یہ نظریہ مشرقی طرز فکر سے میل نہیں کھاتا تھا۔اور محض فیشن کے طور پر یہاں رائج ہو گیا تھا۔اس لیے جڑ نہ پکڑ سکا۔ہندوستان کا مجاز مذہب دوستی کا رہا ہے۔وہ کسی مذہب دشمن نظریے کو تسلیم نہیں کر سکتا۔''7

حالانکہ جدیدیت کے بارے میں اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ اس کے ابتدائی نظریے تو یہی تھے لیکن جب یہ نظریہ ادب کے روبرو ہوا تو اس کا ہیولیٰ بدل گیا۔ جدیدیت کے فن میں علامت، اشارہ، کنایہ، ابہام وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں ۔جن کا تعلق الحاد و انکار سے بہر طور نہیں ہے۔اور ساتھ ہی موضوعاتی سطح پر بھی ادب میں جدیدیت کی اصل نظریہ کی ساخت ویسے موجود نہیں ہے۔جس طرح وہ ابتدائی دور میں تھی۔جدیدیت کے موضوع میں بے چہرگی، مایوسی، بے اطمینانی اور بے سکونی ہے جو جدید زمانے کے ترقی یافتہ لوگون کی دین ہے اس لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ جدیدیت کے تحت لکھنے والے ہر ادیب الحاد وانکار کے شکار ہوں۔پروفیسر احسان اشرف لکھتے ہیں:

''وجودی فرد کے لیے مذہبی عقیدہ اور الحاد پرستی دونوں طرح کے راستے کھلے ہیں جو ہمیں ایک طرف کیرکگارڈ کے یہاں لافہم اور لامحدود دکھائی کی جانب چھلانگ اور میں

عیسائی کیوں ہوں، تو دوسری طرف نشطے کا اعلان خدا کی موت اور عیسائیت کے خلاف

نئی قدرون کی تشکیل پر مبنی خیالات کی طرف لے جاتے ہیں۔'' 8

اس طرح یعقوب یاور نے جدیدیت کے وجودی فلسفے کو اپنے اس مضمون میں پیش کیا ہے۔ لیکن اردو ادب میں جدیدیت کا جو خدوخال ہے یہ اس مضمون میں نہیں ہے۔

ان کے یہ مضامین ایسے ہیں جو ان کی دوسری کتاب میں موجود ہیں۔ جیسے محمد علی تاج بھوپالی، فضل تابش کی شاعری، یہ مضامین ان کی کتاب مرغزار افکار میں بھی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے مضامین دوسری کتاب میں تکرار کے ساتھ موجود ہیں۔

تفکیر و تفہیم:

یہ کتاب یعقوب یاور کے متفرق تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں جو مضامین شامل ہیں ان کے عنوانات اس طرح ہیں۔

1۔ ترجمہ کا فن اور مسائل

2۔ اردو روزناموں کے مسائل

3۔ لکھنؤ کا ایک اور نول کشور نسیم انہونی

4۔ کچھ اقبال اور بھوپال کے بارے میں

5۔ اردو یونیورسٹی خواب اور حقیقت

6۔ ادرک کے ذائقے پر بندر کا تبصرہ

7۔ عصری شعریات میں تاثیر کا فقدان

8۔ غالب شناسی کی روایت

9۔ ادب میں اظہار خیال کی آزادی

10۔ قومی صاحب اور بھوپال

11۔ڈاکٹر سید حامد حسین مرحوم

12۔دربار اکبری ایک بازدید

13۔غالب اور معاصرین غالب

14۔آغا حشر کا شعری شناخت نامہ

15۔وامق جونپوری کا انداز نظم گوئی

16۔دلاور فگار کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری

17۔سن اے کاتب ایک تجزیہ

18۔ریختی اور ساجد سجنی لکھنوی

اس کتاب کے کچھ مضامین میں جدت ہے۔جیسے ''سن اے کاتب ایک تجزیہ'' ''سن اے کاتب'' جو ایک کتاب ہے جس کو جابر حسین نے لکھا ہے۔اس کتاب میں صوبہ بہار کے مختلف خطوں کے واقعات و حادثات کے ساتھ اس کے سماجی، سیاسی و مذہبی پہلو ہیں۔یعقوب یاور نے اس کتاب پر تجزیہ کیا ہے اور ایک سوال اٹھایا ہے کہ اس کتاب کو کس زمرے میں رکھے نہ تو یہ ایک خاکہ ہے نہ سوانح ہے نہ ناول ہے اور نہ ہی افسانہ۔اور یہ سوال اردو کے ناقدوں کے لیے چھوڑ دیا ہے۔اس کتاب کے بارے میں بھی انھوں نے لکھا ہے کہ یہ کتاب دیدہ زیب اور 168 صفحات پر مشتمل ہے اس کتاب کی کتابت کمپیوٹر کی مرحون منت ہے۔جو ہر طرح کی تنقید یا نکتہ چینی سے ماورا ہے۔صاف شفاف اور دبیز کاغذ پر روشن آفسیٹ طباعت نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔یعقوب یاور کا یہ مضمون تبصرے کی حیثیت کا ہے۔اس کا ایک دوسرا مضمون ریختی اور ساجد سجنی لکھنوی ہے۔یہ ایک نیا مضمون ہے اس میں ساجد سجنی لکھنوی کے مجموعہ کلام ''نگوڑیات'' پر یعقوب یاور کا تجزیہ ہے۔ساجد سجنی پر اردو ادب میں بہت کم لکھا گیا ہے۔اس لیے ان کا یہ مضمون اردو ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔جس میں یعقوب یاور نے ساجد سجنی کو ریختی کا ایک ایسا شاعر بتایا ہے کہ ریختی جس کے بارے میں اردو میں یہ بات عام ہے کہ اس صنف میں عورتوں کے جذبات کو عورتوں کی مخصوص بول

چال کی زبان میں بیان کیا جاتا ہے۔اوراس میں دوسرے موضوع سے کنارہ کیا جاتا ہے۔لیکن ساجد کی ریختی میں معاشرتی موضوعات سے لےکرسیاسی موضوعات پائے جاتے ہیں۔یعقوب یاور لکھتے ہیں:

''ساجد سجنی لکھنوٗ کے مجموعہ کلام نگوڑیات میں لاتعداد اشعار بکھرے پڑے ہیں۔سیاسی حالات کی ترجمانی بظاہر ریختی کا موضوع نہیں ہے لیکن چونکہ اج دورن خانہ سیاست کے تذکرے عام ہو چکے ہین اس لیے سجنی نے بڑی خوبصورتی سے اسے ریختی کا موضوع بنایا ہے۔۔۔ساجد نے کس نفاست ،فنی مہارت، چابک دستی اور زبان کی شائستگی کو برقرار رکھتے ہوئے اس موضوع کو اپنی ریختیوں میں برت لیا ہے۔کہ اجنبیت ک احساس بالکل نہیں ہوتا۔ایسا لگتا ہے جیسے غزل کی طرح ریختی نے بھی اس کوفطری طور پرقبول کرلیا ہو۔''9

یعقوب یاور کی اس طرح کے تنقیدی مضامین جس میں جدت اور ندرت پائی جاتی ہے یہ مضامین اردو اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ساتھ ہی ایسے ادیبوں اور فنکاروں سے یعقوب یاور نے لوگوں کو روشناس کرایا ہے۔جن ادیبوں پر کم لکھا گیا ہے۔

احتساب:

یہ کتاب سن 2018 میں سٹی بک پوائنٹ کراچی پاکستان سے شائع ہوئی۔اس کے تنقیدی مضامین حسب ذیل ہیں۔

1۔غالب بنارس اور مثنوی چراغ دیر

2۔غالب اور معاصرین غالب

3۔غالب شناسی کی روایت

4۔کچھ غالب کی حمایت میں

5۔سید احمد خاں اور بنارس

6۔سنت کبیر کی شاعری

7۔آغا حشر کاشمیری کے طبع زاد اردو ڈرامے

8۔آغا حشر کا شعری شناخت نامہ

9۔دربار اکبری ایک بازدید

10۔دریائے لطافت ایک بازدید

11۔ایک اصلاحی تحریک آریہ سماج

12۔انیسویں صدی کے چند لازوال مزاحیہ کردار

13۔ترقی پسند کل اور آج

14۔جدید ادبی تحریک ایک جوابی سازش

15۔جواہر لال نہرو اور ترقی پسند تحریک

16۔ترقی پسندوں کی بھوپال کانفرنس

17۔بیسویں صدی کے کچھ ادبی رجحانات

18۔منٹوفہمی کچھ نفسیاتی پیچ وخم

19۔یادوں کی بارات اور احباب جوش

20۔فیض کی ترقی پسندی

21۔مجروح سلطان پوری کی غزل

22۔مجاز کا تصور انقلاب

23۔وامق جونپوری کا انداز نظم گوئی

24۔دلاور فگار کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری

25۔ادب کے تقاضے اور ابن صفی

26۔ادب کی صنفی شناخت کا مسئلہ

27۔ترجمہ کافن اور مسائل

اس کتاب کے سارے مضامین ایسے ہیں جو یعقوب یاور کی دوسری کتابوں میں تکرار کے ساتھ موجود ہیں۔اس کتاب کا ایک مضمون 'ایک اصلاحی تحریک آریہ سماج' اس میں یعقوب یاور نے 'آریہ سماج' کے پس منظر کو پیش کرتے ہوئے اس کے غرض و غایت کو بیان کیا ہے۔اوراس کے بانی کا مختصراً تعارف بھی اس میں موجود ہے۔اس مضمون میں عصر حاضر میں اس تحریک کو ماننے والوں کے رویوں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ آج اس تحریک کے علمبردار اس کے اصل پیغام کو بھول چکے ہیں۔یعقوب یاور نے آریہ سماج کی جو اصل اصلاحی پہلو تھے اس کو اس طرح سے لکھا ہے:

> ''آریہ سماج سے وابستہ لوگوں کے لیے جن دس ہدایات کی پیروی شرط لازم کی حیثیت رکھتی تھی وہ درج ذیل ہیں:
>
> ۱۔علوم حق ہی اصل علم ہے اوران کا سرچشمہ ایشور کی ذات ہے۔
>
> ۲۔ایشور وجود دانش کی ابدی مسرت کا منبع ،شکل سے عاری، قادر مطلق، منصف اور رحیم وقریم ہے۔وہ نہ پیدا ہوا ہے اور نہ اسے موت آئے گی۔وہ ازلی بھی ہے اور ابدی بھی۔وہ بے خوف ہمیشہ موجود اور پاک ہے۔اس کا کوئی ثانی نہیں۔وہ کائنات کا خالق و مالک ہے۔عبادت صرف اسی کی کی جاسکتی ہے۔
>
> ۳۔وید کلام حق ہیں۔ہر آریہ پران کا پڑھنا، پڑھانا، سننا اور سنانا فرض ہے۔
>
> ۴۔آریہ کو ہر لمحہ حق اور ترک باطل کے لیے تیار رہنا چاہیے۔
>
> ۵۔ہر عمل حق و باطل کی میزان پر پڑھنے کے بعد ہی قابل قبول یا لائق ترک ہوسکتا ہے۔
>
> ۶۔آریہ سماج کا بنیادی مقصد انسان کی فلاح اور اس کے مادی، روحانی اور سماجی ارتقاء کے لیے کام کرنا ہے۔
>
> ۷۔ہر آریہ کو سب کے ساتھ محبت، عدل اور رواداری کا سلوک کرنا چاہیے۔
>
> ۸۔آریہ کو جہالت سے نجات اور علم کے حصول کی کوشش کرنا چاہیے۔

۹۔کسی آریہ کوصرف اپنی بھلائی کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے۔اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ سب کی فلاح کے لیے کوشاں رہے۔

۱۰۔ان اصول وضوابط کی پابندی جو معاشرے اور انسان کی بھلائی کے لیے ہیں ہر آریہ پر فرض ہے۔ہاں ہر شخص اپنی ذاتی معاملات پر عمل کے لیے آزاد ہے۔''10؎

اس طرح سے یعقوب یاور نے مختلف موضوعات پر مضامین لکھے ہیں جس میں ادبی،سیاسی اور سماجی واصلاحی مضامین شامل ہیں۔

آغا حشر کاشمیری شخصیت اور فن:

اس کتاب کے عنوان اس طرح ہیں۔

1۔حیات وشخصیت

2۔آغا حشر کی ڈرامہ نگاری

3۔آغا حشر کی شاعری

4۔آغا حشر کے ڈراموں کا مختصر تعارف

5۔ڈراموں سے انتخاب

6۔شاعری سے انتخاب

سوانح اور شخصیت کے تحت یعقوب یاور نے آغا حشر کی پیدائش سے لے کر وفات،تعلیم وتربیت اور خاندان کے احوال کے ساتھ ان کی ملازمت اور ڈراما نگاری سے دلچسپی کو تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں بیان کیا ہے۔یعقوب یاور لکھتے ہیں:

''آغا حشر کاشمیری کی پیدائش بنارس کے محلّہ ناریل بازار میں بروز جمعہ 11 ربیع الاول 1296ھ مطابق 3/اور 4/اپریل 1879 کی درمیانی شب میں ہوئی۔ حالانکہ ان کے بعض محققین نے ان کی پیدائش کے سلسلے میں غیر مصدقہ تاریخیں اور مقام پیدائش دے کر قارئین کے لیے مغالطہ کی کیفیت پیدا کردی ہے۔لیکن ان کی

> پیدائش پر مولوی مرزا محمد جعفار کے ذریعے بنوائے گئے زائچہ ولادت کے مطابق، جو ان کے خاندان کے پاس آج بھی محفوظ ہے یہی تاریخ اور مقام پیدائش درست ہے۔''[11]

یعقوب یاور نے آغا حشر کے بارے میں جو باتیں اس کتاب میں لکھیں ہیں وہ تحقیق شدہ اور مدلل ہیں۔آغا حشر کا زمانہ وہ تھا جب ڈراما عروج پر تھا۔عوام وخواص ڈرامے کو تفریح کا ذریعہ مانتے تھے۔آغا حشر کو ڈرامے سے دلچسپی ابتدائی دور میں بہت زیادہ تو نہیں تھی لیکن بعد میں وہ ڈراما اسٹیج کرنے لگے۔ڈراما اسٹیج کرتے اور دیکھتے دیکھتے خود ڈراما لکھنے لگے۔آغا حشر کاشمیری کو ایک ہمہ جہت شخصیت کے طور پر اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔یعقوب یاور نے آغا حشر کا شخصی تعارف بھی اس کتاب میں پیش کیا ہے۔اور بتایا ہے کہ آغا حشر کو مطالعہ کا بہت شوق تھا وہ آزاد پسند آدمی تھے کسی نظریات یا مذہب کے قانون میں کبھی خود کو قید نہیں رکھا۔وہ پوری طرح سے آزادانہ زندگی گزارے تھے۔یعقوب یاور لکھتے ہیں:

> ''آغا حشر کاشمیری شراب وشباب کے شوقین تھے۔مغربی شراب میں سے انھیں وہسکی زیادہ پسند تھی لیکن وہ اپنی پسند کسی دوسرے پر تھوپنا پسند نہیں کرتے تھے۔احباب کو ان کی پسند کی شراب فراہم کرتے اور خود جب جہاں جو مل جاتی نوش جاں کر لیتے۔ شراب نوشی کا کوئی وقت بھی مقرر نہیں تھا۔دن ہو یا رات، جب جی میں آتا ایک دو پیگ چڑھا لیتے۔خاص طور پر ڈراما لکھاتے وقت نشے کو ہلکا نہ ہونے دیتے۔چنانچہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے شراب کے گھونٹ لیتے رہتے۔جمعہ کے دن کسی بھی صورت میں شراب کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔''[12]

اس طرح یعقوب یاور نے مختلف جہات سے اس باب میں آغا حشر کی سوانح اور شخصیت کو بیان کیا ہے۔جس میں آغا حشر کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

اور دوسرا باب آغا حشر کی ڈراما نگاری ہے اس میں یعقوب یاور نے آغا حشر کی ڈراما نگاری کے تعلق سے کئی اہم نکات کو لکھا ہے جس میں آغا حشر کے ڈرامے کی اہمیت اور معنویت کے ساتھ آغا حشر کو اردو

ڈرامے کا شیکسپئر کیوں کہا جاتا ہے۔ان سب پر اس کتاب میں یعقوب یاور نے پرمغز بحث کی ہے۔آغا حشر کے ڈراموں کی مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ وہ ادبی جمالیات پر دسترس کے ساتھ عوام کی پسند اور ناپسند کو جانتے تھے۔اور اس کتاب میں ایک اہم نکتہ کی طرف مصنف نے ناقدین اور قارئین کے ذہن کو پھیرا ہے اور یہ بات لوگوں کے سامنے لایا ہے کہ آغا حشر کو اردو کا شیکسپئر کہنا کتنا درست ہے۔یعقوب یاور لکھتے ہیں:

> ''آغا حشر کے فکر وفن کو سمجھنے میں ان کو ملنے والا 'انڈین شیکسپئر' کا عوامی خطاب سے سب سے بڑی رکاوٹ اور گمراہی کا سب سے بڑا سبب ثابت ہوا ہے۔اس بات نے اکثر ناقدین کو راغب کیا کہ وہ آغا حشر کو شیکسپئر کے لیے وضع کردہ معیار سے پرکھیں۔۔۔ڈرامہ کے ناقدین کس طرح اس عوامی خطاب کے دام فریب میں الجھ کر آغا حشر کے ساتھ ناانصافی کررہے ہیں۔سچ بات یہ ہے کہ جس شیکسپئر کا آج تک کوئی ثانی پیدانہیں ہوسکا،اس کا آغا حشر سے موازنہ کرنا کسی مثبت نتیجے تک رہنمائی نہیں کرسکتا۔اس بنیاد پر کیئے جانے والے تجزیے گمراہ کن ہی ثابت ہوں گے۔یہ حقیقت ہے کہ انھیں ہندوستانی عوام نے دہلی کے ایک جلسہ عام میں اس خطاب سے نوازا تھا۔'' 13؎

یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ آغا حشر اور شیکسپئر دونوں میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔دونوں کی فکر اور صلاحیتوں میں تفاوت ہے۔دونوں کی ادبی منظر نامے الگ ہیں۔دونوں کے معاشرے الگ ہیں اس لیے آغا حشر کا اپنا الگ میدان ہے اور شیکسپئر کا اپنا الگ ہے۔اس لیے دونوں کا موازنہ کرنا بے معنی ہے۔جس کو یعقوب یاور نے اپنی اس کتاب میں پوری دلیل کے ساتھ لکھا ہے۔لیکن اگر آغا حشر کے ڈراموں کی بات کی جائے تو معنویت اور اہمیت کے اعتبار سے اردو ڈراما نگاری میں ان کے ڈرامے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس بنا پر اگر کوئی انھیں شیکسپئر کہے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔اور اس کتاب میں آغا حشر کے ڈراموں کے تعارف کے ساتھ منتخب ڈراموں کے متن کو بھی لکھا گیا ہے۔

آغا حشر کی شاعری کے تحت یعقوب یاور نے ان کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔اور بتایا ہے کہ

آغا حشر کی شاعری اور ڈراموں کے درمیان کیا فرق ہے۔ یعقوب یاور لکھتے ہیں:

''آغا حشر کی شاعری کی فضا ان کے ڈراموں سے مختلف ہے۔ ڈراموں میں جہاں وہ ہر طرح کی پابندیوں کو خواہ وہ اخلاقی ہوں یا سماجی، قبول کرتے ہیں وہیں ان کی شاعری ان پابندیوں سے آزاد ہے۔ اس لیے کہ یہاں نہ کسی کی فرمائش کا جبر تھا، نہ کسی کی پسند اور نہ پسند کا خوف، نہ عوام کی مزاج کا لحاظ، نہ ڈراما کمپنی کے مالک یا کسی اور کے ذریعے کاٹ چھانٹ کرنے کا اندیشہ، چنانچہ آغا حشر کی شاعری فطری طور پر ان کی شخصیت کا آئینہ بنتی رہی۔''14؎

آغا حشر کی شاعری کی بات کی جائے تو ان کی شاعری میں ان کے زمانے کی روداد موجود ہے جس میں سیاسی، سماجی مسائل ہیں۔ لیکن یعقوب یاور نے جو لکھا ہے کہ ان کی شاعری اور ڈراموں کی فضا مختلف ہے یہ بات تو صحیح ہے لیکن عصری مسائل کے بیان کے اعتبار سے ان کے ڈرامے اور شاعری میں کہیں نہ کہیں مماثلت ضرور ملتی ہے۔ آغا حشر کو بطور شاعر جب ہم دیکھتے ہیں تو ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے وہ سامنے آتے ہیں لیکن شاعری میں ان کا زیادہ ذخیرہ موجود نہیں ہے۔ اس کے بارے میں یعقوب یاور لکھتے ہیں:

''اب بدقسمتی یہ ہے کہ آغا حشر نے اپنے کلام کو محفوظ رکھنے کی شعوری کوشش کبھی نہیں کی اور ان کے اس لاوبالی پن نے ان کی ذاتی شخصیت کی شناخت کے سب سے اہم راستے کو مسدود کر دیا۔ جو ہمارے سامنے ہے وہ بچا کھچا کلام ہے جو ان کے منشیوں اور دیگر دفتری اہل کاروں کی دستبرد سے محفوظ رہ گیا۔ ان لوگوں نے حشر کے لاوبالی پن کا فائدہ ان کی زندگی میں ہی اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ حشر کا کلام کسی دوسرے کے نام سے رسائل میں بھی چھپا اور مشاعروں میں پڑھا گیا۔ اور وہ اس کے تدارک کا کوئی راستہ نہ نکال سکے۔ وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ پوری طرح ڈراموں میں ڈوبے رہتے تھے اور شاعری کی حیثیت ان کی اپنی نظر میں ثانوی تھی۔''15؎

آغا حشر اردو شاعری میں اتنے مقبول اور مشہور نہیں ہوئے جتنے وہ ڈراما نگار کی حیثیت سے ہوئے۔ پر ان کی شاعری میں شاعری کے تمام لوازمات موجود ہیں۔ اور بیان کی خوبیاں ان کی شاعری میں

پائی جاتی ہیں۔اس کتاب کے آخر میں آغا حشر کے منتخب اشعار کے متون کو بھی یعقوب یاور نے درج کیا ہے۔

ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری:

یہ کتاب 2015 میں پہلی بار ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ سے شائع ہوئی۔اور دوسری بار 2018 میں پاکستان سٹی بک پوائنٹ کراچی سے شائع ہوئی ہے۔یہ کتاب یعقوب یاور کے پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔جس کو انھوں نے چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ہر باب کے تحت ذیلی عنوانات ہیں۔جو حسب ذیل ہیں:

دیباچہ

مقدمہ

باب اول: ترقی پسند تحریک:

(انجمن ترقی پسند مصنفین کے ارتقاء وزوال کا تاریخی جائزہ)

1۔سیاسی اور سماجی پس منظر

2۔ادبی پس منظر

3۔انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام

4۔ترقی پسند تحریک کا ارتقائی سفر 1936 سے 1942 تک

5۔ترقی پسند تحریک کا ارتقائی سفر 1942 سے 1947 تک

6۔ترقی پسند تحریک آزادی کے بعد

7۔ترقی پسند تحریک کی مخالفت کا منظر نامہ

8۔ترقی پسند تحریک کا زوال اور اس کے اسباب

باب دوم: ترقی پسند شاعری (1)

(ترقی پسند تحریک میں اردو نظم نگاری کا جائزہ)

1۔ نئے ادبی رجحانات

2۔ آزادی کے بعد کے نئے رجحانات

3۔ مواد اور ہیئت میں تبدیلیاں

4۔ ترقی پسند نظم کی مقبولیت کے اسباب

5۔ ترقی پسند نظموں کا تنقیدی جائزہ

باب سوم: ترقی پسند شاعری (2)

(ترقی پسند تحریک کے دوران اردو غزل گوئی کا جائزہ)

1۔ بیسویں صدی میں اردو غزل گوئی ترقی پسند تحریک سے پہلے

2۔ غزل کے ہیتی نقائص

3۔ غزل کی مخالفت اور اس کے اسباب

4۔ غزل کے نئے موضوعات ور جحانت

5۔ ترقی پسند غزلوں کا تنقیدی جائزہ

باب چہارم: ترقی پسند شاعری (3)

(ترقی پسند تحریک کے دوران دیگر اصناف سخن کا جائزہ)

1۔ ترقی پسند تحریک اور رباعی

2۔ ترقی پسند تحریک اور مثنوی

3۔ ترقی پسند تحریک اور گیت

4۔ ترقی پسند تحریک اور مرثیہ

کتابیات:

اس میں کل 86 کتابیں،25 رسائل و جرائداور 55 شعری مجموعے ہیں۔

دیباچے میں یعقوب یاور نے اس کتاب کا تعارف کروایا ہے۔ان کا یہ تحقیقی مقالہ جو کتابی شکل میں ہے اس پر برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال نے انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری سے نوازا۔ ہندوستان کی کئی یونیورسٹیوں میں یہ شامل نصاب بھی ہے۔یعقوب یاور لکھتے ہیں:

> ''میرا یہ تحقیقی مقالہ جس پر برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال نے 1990 میں مجھے پی ایچ ڈی کی ڈگری سے نوازہ تھا،پہلی بار 1997 میں ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ جیسے موقر ادارے سے شائع ہوکر منظر عام پر آیا تھا۔ڈگری ملنے اور اس مقالے کی اشاعت کا درمیانی وقفہ اس پر نظر ثانی میں صرف ہوا تھا۔اور اس مقالے کی شکل وہ نہ رہی جو ڈگری کے حصول کے لیے تحریر کیا گیا تھا۔اب یہ مقالہ حذف واضافے کے بعد ایک نئی شکل اختیار کر چکا تھا۔اس کی اشاعت کے ساتھ ہی ہندوستان کی کئی یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اردو نے اسے اپنے نصاب کا حصہ بنالیا۔''16ۓ

یعقوب یاور کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اب اس شکل میں نہیں ہے جس کو انھوں نے اپنے مقالے کے لیے لکھا تھا۔اس میں تغیر و تبدل واقع ہونے کے ساتھ کثیر معلوماتی چیزیں اور تنقیدی صفات موجود ہیں۔اس کے بعد مقدمہ ہے جس میں انھوں نے اپنے ساتھیوں،استاذوں اور نگراں کا شکریاتی کلمات کے ساتھ ترقی پسند کے اسباب کے عوامل کا ذکر مختصراً کیا ہے۔اس کے بعد باب اول ہے۔اس باب کے تحت کئی ذیلی عنوان ہیں۔جس میں سماجی و سیاسی پس منظر،ادبی پس منظر،ترقی پسند تحریک کے قیام اور ارتقائی مراحل کا بیان ہے۔یعقوب یاور نے اس کتاب میں ترقی پسند تحریک کا سیاسی وسماجی پس منظر وہی لکھا گیا ہے جو ہندوستان کی آزادی کا ہے۔آزادی کے ہر نشیب و فراز نے اس تحریک کے لئے راہ ہموار کی۔اس

تحریک کا اصل مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے دانشوروں کو عوام کی رہنمائی کے لیے آمادہ کیا جائے۔ان کی مشترکہ کوششوں سے عوام میں ذہنی و آزادی کی شدید خواہش بیدار کی جائے۔تاکہ ان میں حکومت برطانیہ کے خلاف ہمت پیدا ہو سکے۔ یہ تحریک آزادی کے اغراض ومقاصد تھے۔ترقی پسند تحریک سے قبل کئی اصلاحی تحریکوں نے سماج و ادب کے لیے کئی اہم کام کئے۔جس میں الگ الگ لوگوں نے قوم کی اصلاح سوچی۔مسلمانوں میں سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء اور ہندوؤں میں راجا رام موہن رائے،سوامی دیانند سرسوتی وغیرہ۔جنھوں نے اپنی اپنی قوم کو فرسودہ خیالات سے اوپر اٹھنے کی بات کہی۔اس کے لیے الگ الگ تنظیمیں قیام میں آئیں۔اور چھوٹی چھوٹی تحریکیں بھی رونما ہوئیں۔1885 میں گورنر جنرل لارڈ ڈفرین افسر لارڈ اے ہیوم کی مدد سے ممبئی میں انڈین نیشنل کانگریس کی داغ بیل پڑی۔بعد میں یہی انڈین نیشنل کانگریس (تنظیم) بھی آزادی کی سبب بنی۔1905 میں روس زار کے شکست اور اس کے حکومت کے خاتمے کے بعد عوام میں جو افراتفری مچی وہ انقلابی شکل اختیار کر چکی تھی۔اس طرح پوری دنیا میں انقلاب برپا ہوا اور اس کا اثر ہندوستان میں بھی ہوا۔1935 سے پہلے ہندوستان میں گاندھی ازم،کمیونزم اور سوشلزم کا دور دورہ تھا۔ ہندوستان کی کوئی بھی تحریک اس سے پرے نہیں تھی۔یہی سارے واقعات و حادثات کو ترقی پسند تحریک کے پس منظر کے طور پر اس کتاب میں لکھا گیا ہے۔ادبی پس منظر میں انھوں نے علی گڑھ تحریک اور رومانوی تحریک کا ذکر کیا ہے۔پھر اس کے بعد ترقی پسند مصنفین کے قیام کا ذکر ہے جس میں یورپ میں پڑھنے والے نوجوان طالب علموں میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، جیوتی گھوس، محمد دین تاثیر، اور پرمود سین گپتا کے نام شامل ہیں۔اس تحریک کو قائم کرنے کا سہرا انھیں لوگوں کے سر جاتا ہے۔یعقوب یاور لکھتے ہیں:

> ”یورپ میں رونما ہونے والے ان واقعات کا اثر ساری دنیا کے ساتھ ہندوستانی عوام پر بھی پڑ رہا تھا۔جو اس وقت اپنی آزادی کے حصول کی جد و جہد میں مصروف تھے۔اعلی تعلیم کے حصول کی غرض سے کچھ ہندوستانی نوجوان یورپ میں مقیم تھے اور اس طوفان کی تباہ کاریوں کا بہت قریب سے مطالعہ کر رہے تھے۔ان نوجوان طالب علموں میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، جیوتی گھوش، محمد دین تاثیر، اور پرمود سین گپتا بھی

شامل تھے۔ یہ اور دوسرے ہندوستانی طلبا اپنے ملک کی آزادی اور امن عالم کی بقا کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے۔''17۔

اس طرح یعقوب یاور نے اپنی اس کتاب میں ترقی پسند تحریک کے قیام اور آغاز و ارتقاء کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ اور اس باب میں یعقوب یاور نے ترقی پسند کے تعارف کے ساتھ اس کے اغراض و مقاصد کا ذکر کیا ہے۔ پھر اسی باب میں ''ترقی پسند تحریک کا ارتقائی سفر'' کے نام سے ایک عنوان ہے۔ اس کے علاوہ ''ترقی پسند تحریک آزادی کے بعد'' اور ''ترقی پسند تحریک کی مخالفت کا منظر نامہ'' اور ''ترقی پسند تحریک کا زوال اور اس کے اسباب'' یہ عنوانات اس باب میں موجود ہیں۔ جس کے ذریعے سے یعقوب یاور نے ترقی پسند تحریک کے اجزاء کا احاطہ کیا ہے۔ باب دوم میں ترقی پسند تحریک کے تحت اردو نظم نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جس میں نظم کی ہیئت مواد اور تبدیلیوں کا ذکر ہے۔ ساتھ ہی ترقی پسند نظموں کی مقبولیت کے اسباب بھی بتائے گئے ہیں۔ پھر کچھ ترقی پسند نظموں کا تنقیدی جائزہ ہے۔ جس میں میراں جی، فیض احمد فیض، ن م راشد، سردار جعفری، محی الدین مخدوم وغیرہ کی نظمیں ہیں۔ یعقوب یاور لکھتے ہیں:

''ہندوستان اس زمانے میں جس ہنگامی اور بحرانی دور سے گزر رہا تھا، تنگ ہائے غزل اس کے اظہار کا حق ادا کرنے سے قاصر تھی۔ اس عہد کے لوگ اب محبت کے نغموں کی جگہ انقلاب آفریں ترانوں کا مطالبہ کر رہے تھے اور اس کے لیے ضرورت تھی کہ دنیائے شاعری میں ان روشن امکانات کی تلاش کی جائے جو ان موضوعات کے متحمل ہو سکیں۔ چنانچہ اردو شاعری میں غزل سے نظم کی جانب تجربات کا سفر شروع ہوا اور مثنوی، مسدس، مخمس، ترجیع بند وغیرہ روایتی ہیئتوں کے استعمال کے ساتھ ساتھ نیم آزاد نظم، آزاد نظم، نظم معریٰ، اور دیگر مغربی ہیئتوں کے تجربے عام ہونے لگے۔ ترقی پسند شاعروں نے اپنی سماجی ذمہ داریوں کو سمجھا اور اپنے عہد کے تقاضوں ست عہدہ برآ ہوئے ان نئے تجربات نے شاعری میں وسعت پیدا کی اور ان نظموں میں ہر قسم کے خیالات کی ترجمانی کرنے کی آسانی پیدا ہوئی۔''18۔

اس طرح یعقوب یاور نے ترقی پسند تحریک میں نظموں کی مقبولیت کے اسباب وعلل کو پیش کیا

ہے۔باب سوم میں ترقی پسند تحریک کے تحت اردو غزل کا جائزہ لیا گیا ہے۔جس میں غزل کی ہیئت اس کی مخالفت اس کے نئے موضوعات اور رجحانات پر بات کی گئی ہے۔غزل کی مخالفت اور اس کے اسباب کے تحت مختلف ادیبوں کے اقوال ہیں جس میں شمیم حنفی،اختر انصاری،محمد حسن وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔غزل کے نئے موضوعات اور رجحانات میں غزل کی ان تبدیلیوں کا ذکر ہے۔جس میں غزل سماج کے تمام پہلوؤں کو سمیٹ لیتی ہے۔پھر ترقی پسند غزلوں کا تنقیدی جائزہ ہے۔جس میں فراق گورکھپوری،مجاز،مجروح سلطان پوری،اختر انصاری،معین احسن جذبی،شاد عارفی،قتیل شفائی،محمد علی تاج،غلام ربانی تاباں،کیف بھوپالی، حبیب جالب،ناصر کاظمی،شاذ تمکنت،شہزاد احمد،شہریار،مجیب رامش،ظفر اقبال وغیرہ کی غزلیں شامل ہیں۔ یعقوب یاور لکھتے ہیں:

''ترقی پسند شاعروں کی طرف سے صنف سخن کی حیثیت سے غزل کی مخالفت کی بنیادیں اصولی سے زیادہ تقلیدی تھیں۔یہ ایسا ہی بحرانی اور ہنگامی عہد تھا جب ایک آواز پر ایک زمانہ لبیک کہنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔دراصل یہ اس سماجی بے داری کا تاریک پہلو تھا جس کے تحت لوگون کو رہنمائی کی اہمیت اور اتحاد پر زور دینے کی تلقین کی گئی تھی۔ترقی پسند تحریک کو بھی ادبی حلقوں میں آزادی کا ایک حصہ سمجھا گیا تھا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے رہنما صحیح وغلط جو فیصلے کرتے تھے ایک جم غفیر بے سوچے سمجھے ان پر عمل درآمد کے لیے تیار رہتا تھا۔آواز میں آواز ملانے کا یہ عمل ہندوستان کے طول وعرض میں پھیل جاتا اور کبھی اس کے نتیجے میں ایک چھوٹا سا مسئلہ بڑی سنگین صورت حال کی طرح لوگوں کے ذہن ودماغ پر مسلط ہوجایا کرتا تھا۔غزل کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔''19؎

یعقوب یاور نے ترقی پسند تحریک میں غزل کی مخالفت اور اس کے اسباب کو اس کتاب میں تلاشا ہے اور اس بات کو بھی اجاگر کیا ہے کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ لوگوں نے غزل کی مخالفت کیوں کی۔باب چہارم میں ترقی پسند کے دیگر اصناف کا جائزہ لیا گیا ہے۔جس میں شاد عارفی،وامق جونپوری،جاں نثار اختر،

شہاب جعفری، بیکل اتساہی، نازش پرتاپ گھڑھی، فیض احمد فیض، بشیر بدر، احمد فراز، وغیرہ کے رباعیات، مثنوی، گیت، دوہا، مرثیہ وغیرہ شامل ہیں۔ یعقوب یاور لکھتے ہیں:

''یہ کہا جاسکتا ہے کہ ترقی پسند شاعروں نے غزل اور نظم کی جانب خصوصی توجہ دی اور زیادہ تر انھیں اصناف میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ دیگر اصناف کے سلسلے میں ان کے رویے کو مخالفانہ تو نہیں کہا جاسکتا لیکن توجہ کی کمی سے تحریک کے دوران ان اصناف کو ابھرنے کا موقع کم ہی ملا۔'' 20

یعقوب یاور نے اس کتاب میں ترقی پسند تحریک اور شاعری کے تحت ہر نکات وزاویے سے ترقی پسند تحریک کا تعارف و تجزیہ کیا ہے۔ مجموعی طور پر ان کی یہ کتاب مدلل اور مواد سے پر ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1۔تحریک وتعبیر،یعقوب یاور،ص16

2۔ایضاً،ص:7

3۔آغا حشر کاشمیری،یعقوب یاور،ص:53

4۔افہام،یعقوب یاور،ص:21

5۔ایضاً،ص:34

6۔مرغزار افکار،یعقوب یاور،ص:9

7۔تحریک وتعبیر،یعقوب یاور،ص19

8۔وجودیت کا فلسفہ،ڈاکٹر احسان اشرف،ص:13

9۔مرغزار افکار،یعقوب یاور،ص:77

10۔افہام،یعقوب یاور،ص:73

11۔آغا حشر کاشمیری،یعقوب یاور،ص:1

12۔ایضاً،ص:19

13۔ایضاً،ص:38

14۔ایضاً،ص:52

15۔ایضاً،ص:53-52

16۔ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری،یعقوب یاور،ص:9

17۔ایضاً،ص:65

18۔ایضاً،ص:253

19۔ایضاً،ص:351

20۔ایضاً،ص:433

باب پنجم

یعقوب یاور کے تراجم وترتیب کا جائزہ

ملکی وغیر ملکی سطح پر انسانوں کے درمیان باہمی تعلقات اور اتحادی روابط اور میل جول پیدا کرنے میں ترجمہ سب سے زیادہ کار آمد ثابت ہوا ہے۔ترجمہ کا عمل انسانی تمدنی مزاج اور تاریخ کی دریافت اور شناخت کا ایک اہم ذریعہ ہے انسان جو رنگوں ،زبانوں اور جغرافیائی وسیاسی تفرقات کی بدولت انسان ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہے۔ترجمہ کے ذریعہ انسانی سطح پر ایک دوسرے سے تعارف حاصل کرتا ہے۔انسانی تہذیب وتمدن کے ارتقا میں جہاں بہت سارے اسباب وعوامل ہیں وہی ترجمہ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

ترجمہ نے ایک قوم کے ذخیرۂ علم وادب کو دوسری قوموں تک پہنچایا ہے انسان کے ارتقائی مراحل میں ترجمہ نے جو اہم کردار نبھایا ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔گلوبلائزیشن کے اس دور میں جہاں دنیا ایک گاؤں کی شکل اختیار کر چکی ہے۔دنیا میں کہیں بھی کوئی واقعہ یا حادثہ رونماں ہوں لیکن اس کی اطلاع دنیا کے ہر خطہ میں رہنے والے ہر انسان کو ہو جاتی ہے۔گرچہ وہ الگ الگ زبان بولتے ہوں اور الگ الگ تہذیب وتمدن کے پاسبان ہوں ترجمہ کے ذریعہ سے ایک دوسرے احوال اور کوائف کے ساتھ ان کے حادثاتی زندگی سے دنیا میں رہنے والا ہر انسان باخبر ہو جاتا ہے۔ترجمہ کی افادیت کے بارے میں اگر کہا جائے کہ جہاں آج انسان سائنس اور ٹکنالوجی کے دور میں ترقی کے ذریعہ آسمان چھو رہا ہے تو اس میں ترجمہ کا اہم رول ہے۔

اردو میں ترجمہ کی روایت کے بارے میں اگر بات کی جائے تو یہ خاصی قدیم روایت ہے۔اردو کی پہلی نثری داستان ''سب رس''، میر امن کی ''باغ و بہار''، محمد حسین آزاد کا ''نیرنگ خیال'' یہ اصل میں ترجمے

ہیں لیکن مترجمین کے صلاحیت ولیاقت نے تخلیق کا درجہ عطا کر دیا ترجمہ کی اہمیت یہ ہے کہ وہ زبان میں اضافہ کرتی ہے ساتھ ہی ادبی سرمایہ کے ذخیرہ میں بھی اضافہ ہوتا ہے

ترجمہ کی تعریف: ایک زبان کے لب لباب کو دوسری زبان میں پیرونے کو ترجمہ کہتے ہیں۔اور ادبی ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ کسی مصنف کے خیالات کو اپنی زبان کا لباس پہنایا جائے اور ان کو اپنے الفاظ ومحاورات کے سانچے میں ڈھالا جائے۔ظ انصاری کے نظر میں ترجمہ ایک مکمل فن ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''ترجمہ بجائے خود ایک مستقل فن ہے اور اس علم یا فن میں اضافہ بھی ہے جس کی تصنیف کا ترجمہ کیا جائے۔۔۔ہر زبان میں ترجموں کے ذریعے نئے الفاظ اور اصطلاحات، محاوروں اور کہاوتوں کا اضافہ کرنا پڑتا ہے جو اول اول اکھڑے اکھڑے معلوم ہوتے ہیں رفتہ رفتہ زبان پر رواں ہونے لگتے ہیں۔'' 1

اردو میں ترجمہ نگاری کی روایت اور افادیت کے تحت ابتدا سے حال تک ہر زمانہ میں تخلیق کاروں شاعروں اور ادیبوں نے الگ الگ زبانوں کے سرمائے کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ بات اگر اردو تراجم کی کی جائے تو تقریباً ہر اصناف کے اردو میں ترجمہ ہوئے ہیں چاہے وہ ناول ہو یا افسانہ، ڈرامہ ہو یا داستان اس کے علاوہ شاعری کے بھی منظوم ترجمہ خاصی تعداد میں ہوئے ہیں۔اس کے لیے ہندوستان میں الگ الگ اسکول بھی قائم کیے گئے تھے جن میں کچھ اسکول کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔فورٹ ولیم کالج:

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ انگریزوں نے جب ہندوستان میں اپنی حکومت کو قائم کیا اور پورے ہندوستان پر راج کرنا چاہا اس مقصد کے حصول کے لیے انگریزوں کو احساس ہوا کہ جب تک یہاں کی زبان سے نابلد رہیں گے تب تک اس ملک کے عوام پر حکومت نہیں کر سکتے۔اس مقصد کے پیش نظر 1802 میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا اس کالج میں عربی، فارسی اور سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے ہوئے اس کالج میں انگریزی سے کسی بھی کتاب کا ترجمہ اردو اور ہندی میں نہیں ہوا اس کالج کے ترجمہ نگاروں کو فن پر پوری مہارت تھی اس کالج کے مشہور مترجمین کے نام کچھ اس طرح سے ہیں۔میر امن دہلوی، عبداللہ مسکن، کاظم علی

جوان، شیر علی افسوس، حیدر بخش حیدری، للولال جی، میر جعفر، طوطا رام وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

2۔سائنٹفک سوسائٹی:

سر سید نے غازی پور میں 1864 میں سائنٹفک سوسائٹی کا قیام عمل میں لایا اس سوسائٹی کے ذریعہ تاریخ، جغرافیہ، سائنس اور معاشیات جیسے اہم موضوعات پر اردو میں ترجمہ ہوئے جن کی مدد سے اردو دان طبقہ جدید علوم وفنون سے واقف ہوا۔

3۔دارالترجمہ عثمانیہ:

28/اگست 1919 کو حیدرآباد میں عثمانیہ یونی ورسٹی کا افتتاح ہوا۔ شیخ الجامعہ کے لیے نظر انتخاب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری پر پڑی لیکن ان کی ناگہانی موت نے جامعہ کو ایک قابل ترین شخصیت سے محروم کر دیا۔ بالآخر صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خان شیروانی نے جامعہ عثمانیہ کے امیر جامعہ کی حیثیت سے جامعہ عثمانیہ کا افتتاح کیا۔عثمانیہ یونی ورسٹی سے دوسال قبل 1917 میں دارالترجمہ حیدرآباد کا قیام عمل میں آیا۔اس ادارہ سے باقاعدہ طور پر فن ترجمہ نگاری کو فروغ ملا۔اس شعبہ میں آرٹس، سائنس وغیرہ کی تقریباً 500 کتابوں کا اردو ترجمہ ہوا۔

4۔دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی:

ترجمہ نگاری میں دہلی کالج کا اپنا الگ مقام رہا ہے۔ ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی 1842 میں قائم ہوئی اور غدر سے پہلے تک اس نے 117 کتابیں ترجمے اور تصنیف وتالیف کے ذریعے تیار کر لی تھیں ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کو فروغ دینے میں بوترو، ڈاکٹر اشپرنگر، منشی کریم الدین، مولوی ذکاءاللہ، پنڈت رام چندر، پنڈت رام کرشن، ماسٹر بھیروں پرشاد، ماسٹر رام چند، مولانا صہبائی وغیرہ اس کالج کے روح رواں تھے اس میں سائنس، فلسفہ، تاریخ وغیرہ کے ترجمہ ہوئے جس سے اردو میں ایک بیش قیمتی اضافہ ہوا۔

اسی طرح دارالمصنفین اعظم گڑھ، ہندوستان اکیڈمی الہ آباد وغیرہ آزادی سے قبل ترجمہ کے ذریعہ اردو زبان وادب کو دیگر زبان کے مواد سے مالا مال کیا۔ان اداروں کے علاوہ اور دوسرے ادارے اور

اکیڈمیوں نے اردو میں دیگر زبانوں کے ترجمے کروائے ہیں۔اس روایت کوآگے بڑھانے میں دورحاضر کے ادبا بھی کمر بستہ ہیں اوروہ الگ الگ اصناف کے ترجمہ اردو میں کرر ہے ہیں۔

بھوپال میں جہاں یعقوب یاور نے اپنا کافی وقت گزارا ہے وہاں ترجمہ کی جانب خاصی توجہ دی گئی اس میں سب سے اہم نام نواب سلطان جہاں بیگم کا ہے جو ہمیشہ اردوادب کے لیےفکر مند رہتی تھی سلطان بیگم نے خواتین کی اصلاح اوراخلاق کے متعلق 60 سے زیادہ کتابوں کے ترجمہ شائع کروائے ہیں اس سلسلہ میں پہلا نام یوسف قیصر کا ہے جنھوں نے نہایت ہی کامیابی کے ساتھ انگریزی کے نظموں کا منظوم اردوترجمہ کیا ہے ان کے علاوہ مفتی انوارالحق نے کئی انگریزی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے۔عبدالمتین نے تاریخی کتابوں کے ترجمے کیے ہیں اسی طرح محمد اسماعیل ہائف نے فرنچ ناولوں کا ترجمہ کیا ہے ان کے علاوہ بھوپال میں بہت سارے مترجمین نے الگ الگ زبانوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے ان میں ایک اہم نام مظفر حنفی کا ہے جنھوں نے ترجمہ نگاری میں اپنا سکہ جمایا اور انگریزی جاسوسی ناولوں کا ترجمہ کیا ان کے کچھ ترجمہ شدہ ناولوں کے نام یہ ہیں ’’چوروں کا قاتل‘‘’’شرلاک ہوم ہندوستان میں‘‘’’سخاروف نے کہا گلاگ مجمع الجزائر‘‘ اس طرح سے بہت ساری انگریزی زبانوں سے اردو میں ترجمہ کیے ہیں۔

اردو میں جاسوسی ناولوں کے ترجمے میں یعقوب یاور کا نام اہمیت کا حامل ہے اور انھوں نے کئی جاسوسی ناولوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے ۔یعقوب یاور نے 22 انگریزی کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔جواردوزبان کے سرمایہ میں کافی اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

یعقوب یاور کے ناولوں کے ترجمے:

(1) یعقوب یاور نے مشہور ناول نگار اور شاعر ہرمن ہیس کے ناول ’’سدھارتھ‘‘ کا ترجمہ 1982 میں کیا اس میں ترجمے کی ہیئت تلخیصی ہے جس میں یعقوب یاور نے الفاظ کا استعمال بہت اچھے ڈھنگ سے کیا ہے۔ناول کا کردار سدھارتھ ایک جسم ہے اور وہ بوڑھا ہو چکا ہے اور مرنے کے قریب ہے مگر ایک اور سدھارتھ جو روح کی شکل میں ہے وہ غیر فانی ہے اسی کو موضوع بنا کر یہ ناول لکھا گیا ہے۔جرمنی کا یہ

مشہور ناول لوگوں میں کافی مقبولیت کا حامل ہے۔اس ناول کو نوبل انعام سے بھی نوازا گیا ہے۔اس میں ناول کے کردار سدھارتھ کے زندگی کی داخلی اور خارجی سفر کی داستان ہے۔جس کے ذہن کی تجسس ہزاروں سوالات پیدا کرتی ہے۔حق کی تلاش میں ہر قدم پہ یہ کردار ٹھہرتا سوچتا اور کشش و پنج کا شکار ہوتا ہے اور بہت سارے سوالات لیے تنہائی کی زندگی کو اختیار کرتا ہے۔یہی اس ناول کا موضوع ہے۔یعقوب یاور کی تخلیقی ترجمہ کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''کیا یہ پرماتما ہے تنہا جس نے یہ سب تخلیق کیا ہے۔کیا دیوتا بھی ہماری طرح فانی نہیں ہے۔تب کیا دیوتاؤں کی عبادت درست اور صحیح عمل ہے۔اس ایک پرماتما کو چھوڑ کر کس کس کے لیے عبادت کرتیں اور اگر پرماتما ہمارے وجود میں ہمارے اندر موجود نہیں ہے تو اسے کہاں تلاش کریں وہ کہاں ہے۔وہ کہاں ہے وہ دل کہاں دھڑکتا ہے وہ روح کہاں ہے مادہ وہ نہیں ہے فکر و ہوش بھی نہیں ہے تب وہ ہے کیا آتما کی طرف جانے کا دوسرا راستہ ہم کہاں تلاش کریں کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا کوئی نہیں جانتا نہ اس کا باپ ہے نہ استاد نہ پنڈت نہ صحیفے برہمنوں اور ان کے مقدس صحیفوں میں سارا علم پوشیدہ ہے۔'' 2؎

مندرجہ بالا اقتباس سے یعقوب یاور کی ترجمہ نگاری کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے جس میں انھوں نے تخلیق سے مملو شر سارا اردو کا خوبصورت پیرہن اس ناول کو عطا کیا ہے۔یعقوب یاور ترجمہ کے فن سے واقفیت کے ساتھ ترجمے کے رمز وایما سے واقف ہیں۔اس لیے یہ ترجمہ شدہ ناول پڑھتے ہوئے یہ احساس نہیں ہوتا ہے کہ مصنف ہندوستان سے دور جرمنی کے کسی علاقے کا ہوگا بلکہ ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہندوستانی ماحول وفضا اور یہاں کی روحانی تہذیب وثقافت سے آشنا ایک شخص یہ ناول لکھا ہے۔

(2) ڈاکٹر ژواگو:

اس ناول کا ترجمہ یعقوب یاور نے سن 2000 میں کیا۔اس ناول کے اصل مصنف کا نام ''بورس پاسترنوک'' ہے۔یہ ناول کئی باتوں کی وجہ سے بہت اہم ہے۔انقلاب روس پر دنیا بھر میں لکھے گئے ناولوں

میں اس ناول کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔اس ناول کو سب سے بڑا ادبی انعام یعنی نوبل پرائز بھی دیا گیا ہے۔اس ناول کا آغاز ژواگو اول کی خودکشی سے ہوتا ہے۔اور اس کا نجام ژواگو دوم کی ناگہانی موت سے ہوتا ہے۔ژواگو ڈاکٹر ژواگو کا بیٹا ہے۔ یہ دونوں کردار روس کی معاشرتی زندگی کو علامت کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اپنے ماحول کی حالات کی عکاسی کرتے ہیں ۔ژواگو انقلاب سے پہلے روس کے ماحول کا پروردہ ہے انتہائی عیاش،فضول خرچ، کثرت شراب نوشی سے بدحواس،قرض کے بوجھ میں دبا ہوا انسان ہوتا ہے۔ان سب مسائل سے گھبرا کر وہ خودکشی کرتا ہے۔ڈاکٹر ژواگو انقلاب روس کے پیدا شدہ حالات کو چھپانا چاہتا ہے لیکن نتیجے میں ژواگو ثانی کا موت ہوجاتا ہے۔اس پر دل کا دورہ پڑتا ہے۔ناول نگار نے یہ دکھایا ہے کہ انقلاب روس ایک ناکام کوشش تھی جو صرف لوگوں کو ذہنی اور جسمانی طور پر بیمار کی اور کسی کسی کو تو موت کے گھاٹ اتار دیا۔انقلاب کے بعد روس کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا اور انقلاب کے تانے بانے بھی بکھر چکے تھے۔ اس ناول نگار کا یہ نقطہ نظر اس ناول کو ایک شاہکار ناول میں تبدیل کر دیتا ہے۔اس ناول کا ترجمہ یعقوب یاور نے تلخیص کے طور پر کیا ہے لیکن ترجمہ شدہ تلخیص ایسی ہے جس میں اصل کتاب کے تمام نکات موجود ہیں۔ مصنف نے جو واقعہ و حادثہ اصل میں کتاب میں پیش کیا ہے اس کو یعقوب یاور نے اپنے تخلیقی ترجمہ کے سہارے ان تمام واقعات و حادثات کو اردو داں طبقے کے سامنے لایا ہے اس کا اندازہ ان کے ترجمہ شدہ کتاب کے اس اقتباس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

> ''اور ندی کے اس پار ژوگو کالڑیوری اپنے گمشدہ باپ کے لیے دعائیں کر رہا تھا اسے کیا علم تھا کہ اس کے باپ نے خودکشی کر لی ہے اور وہ یتیم ہوگیا ہے آج سے ٹھیک دو سال قبل جب وہ صرف دس سال کا تھا اس کی ماں کی بھی موت ہو چکی تھی اسے وہ منحوس دن یاد تھا جب ''حیات جاوید'' کا گیت گاتے ہوئے لوگ جنازے کو لے جارہے تھے جب گیت رک جاتا تو ان کی آواز پہ گھوڑوں کی ٹاپیں اور ہوا کی سائیں سائیں ان کے گیت کو وسعت بخشی۔راہ چلتے لوگ جنازہ لیے جانے والوں کو راستہ دیتے کچھ لوگ مرحوم سے اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لیے جنازے سے لٹکتے

ہاروں کو چھو لیتے کچھ لوگ جنازہ کے ساتھ چلنے لگتے اور کچھ جنازہ لے جانے والوں
سے پوچھتے کسے دفنانے لے جایا جارہا ہے ژواگوکو۔''3

(3) پاپیلاں:

یہ ایک سوانحی ناول ہے۔اس کے مصنف کا نام ''ہنری شاریے'' ہے۔اس ناول میں قید سے فرار کی ایک نا قابل فراموش داستان ہے۔یعقوب یاور نے اس ناول کا اردو میں ترجمہ 2007 میں کیا۔اس کا دوسرا ایڈیشن 2010 میں پاکستان سے سٹی بک پوائنٹ اردو بازار کراچی سے شائع ہوا۔ پاپیلاں ایک دلچسپ کتاب ہے جسے خودنوشت بھی کہہ سکتے ہیں اور سوانحی ناول بھی۔ یہ ناول فرانسسی زبان میں لکھا گیا ہے۔اولین دس برسوں میں ہر سال اس اصل کتاب کے کم سے کم چار ایڈیشن شائع ہوتے تھے۔ یہ ناول ایک حوصلہ مند شخص کی داستان ہے جس نے ایک نا کردہ گناہ کی سزا کے بعد جیل سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی اور اس چیز کو خود مفرر نے قلم بند کیا ہے۔ ہنری شاریے عرف پاپیلاں جرمن میں ایک مشہور و معروف شخص تھا جسے مافیا کے دباؤ میں آ کر پیرس کی ایک عدالت میں 1931 میں ایک نا کردہ قتل کے جرم میں عمر قید کی سزا سنا کر جیل بھیج دیا گیا۔ ہنری کو پہلے ہی دن سے یہ جنون سوار ہوا کہ اسے قید میں نہیں رہنا ہے اس کا خیال تھا کہ موت قید کی عقوبت زدہ زندگی سے زیادہ خوشگوار ہے۔ چنانچہ وہ جیل سے فرار ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ ہر ناکام کوشش کے بعد اس کی سزا اور بڑھا دی جاتی اور نگرانی سخت کر دی جاتی تھی لیکن وہ سخت جان ہر بار فرار کا کوئی نہ کوئی طریقہ نہ صرف تلاش کر لیتا تھا بلکہ اس پر فوراً عمل کرنا بھی شروع کر دیتا تھا۔ بالآخر وہ کامیاب بھی ہوا۔مصنف ہنری شارے کا بیان ہے کہ وہ جیل سے آزادی کے بعد ایک دن بازار میں گھوم رہا تھا۔اس کا گزر کتابوں کی دوکان کے پاس سے ہوا۔کتابیں وہاں پر سجی ہوئی تھی ان میں سے ایک کتاب نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچا۔ یہ ایک مجرم کے جیل کی روداد کی کتاب تھی۔ کتاب کا موضوع ہنری شاریے کی زندگی سے میل کھا رہا تھا۔ چنانچہ اس نے وہ کتاب خریدی اور گھر جا کے اس کا مطالعہ کیا لیکن اس کو کافی مایوسی ہوئی اس نے سوچا اگر میں اپنے فرار کی روداد کو کتابی شکل دوں تو اس سے کئی گنا اچھا ہوگا لیکن وہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا

وہ صرف اپنی مادری زبان فرانسیسی کی معمولی جانکاری رکھتا تھا اس نے بازار سے فرانسیسی زبان کی کچھ کتابیں خریدی اور ان کا مطالعہ شروع کیا پھر کچھ دنوں کے بعد وہ اپنی فرار کی زندگی کو لکھنا شروع کر دیا اور ایک تعلیم یافتہ شخص کو اپنا استاد بنایا۔ اتفاق سے وہ ایک مصنف تھا اور اس نے اس کے لکھے ہوئے مسودے کو رکھ لیا۔ کافی عرصے تک اس مسودے پر اس تعلیم یافتہ شخص کا دھیان نہیں گیا۔ بار بار اسرار کے بعد ہنری شاریے نے اپنا مسودہ واپس لے لیا اور اس مسودے کو پبلیشر کو دے دیا اور چند دنوں میں یہ مسودہ کتابی شکل میں منظر عام پر آیا اور یہ پورے عوام و خاص کی نظر میں مقبول ہو گیا اور اس کی خودنوشت نے اس پر دولت کا انبار برسانا شروع کر دیا۔ یہ سچی اور زندہ جاوید داستان انسان کے عزم حوصلہ کو اس کی انتہائی شکل میں پیش کرتی ہے۔ فرانسیسی زبان میں لکھی گئی اس خودنوشت کا دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور ہر زبان میں اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو کر مقبول عام ہوئے ہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ یعقوب یاور نے کئی حصوں میں کیا ہے اور اس میں الگ الگ نوٹ کو استعمال کیا ہے اور اس کے لیے عنوان بھی مقرر کیا ہے۔ جو حسب ذیل ہیں:

(1) پہلی نوٹ بک۔ تاریکی کی طرف

اس کے تحت تین ذیلی عنوان ہے۔

(أ) انصاف

(ب) جیل

(ج) کین کی مرکزی جیل

(2) دوسری نوٹ بک۔

''گیانا کے راستے میں'' اس کے تحت تین ذیلی عنوان ہیں:

(أ) سینٹ مارٹن

(ب) گیانا کا سفر

(ج) سینٹ لارینٹ

(3) تیسری نوٹ بک۔

''پہلا فرار'' اس کے تحت چار ذیلی عنوان ہیں:

(أ) اسپتال سے فرار

(ب) جزیرہ پیجن

(ج) خطرے سے دور

(د) ٹرینی ڈاڈ

(4) چوتھی نوٹ بک۔

''پہلا فرار (جاری)'' اس کے تحت چھ ذیلی عنوان ہیں:

(أ) ٹرینی ڈاڈ

(ب) پھر وہی سمندر

(ج) قرا کاؤ

(د) رایوہاشا جیل

(ہ) رایوہاشا سے فرار

(و) غرب الہندی قبیلہ

(5) پانچواں نوٹ بک۔

''تمدن کی طرف'' اس کے تحت آٹھ ذیلی عنوان ہیں:

(أ) سانتامارتا جیل

(ب) سانتامارتا سے فرار

(ج) بارن قلعہ سے فرار

(د) گیانا کو واپسی

(ہ) ۱۶/نومبر ۱۹۳۴

(و) عرب اور چیونٹیاں

(ز) آدم خور کا فرار

(ح) سماعت

(6) چھٹی نوٹ بک:

''ایلیس دوتالوت'' اس کے تحت تین ذیلی عنوان ہیں:

(أ) جزائر میں آمد

(ب) حبس تنہائی

(ج) رویالے کی زندگی

(7) ساتویں نوٹ بک:

''ایلیس دوسالوت (جاری)'' اس کے تحت دو ذیل عنوان ہیں:

(أ) قبر میں پیڑا

(ب) جس تنہارئی کا دوسرا دور

(8) آٹھویں نوٹ بک:

''رویالے میں واپسی'' اس کے تحت دو ذیلی عنوان ہیں:

(أ) بھینسے

(ب) سینٹ جوزف میں بغاوت

(9) نویں نوٹ بک:

''سینٹ جوزف'' اس کے تحت دو ذیلی عنوان ہیں:

(أ) کاربونیری کی موت

(ب) پاگل خانے سے فرار

(10) دسویں نوٹ بک:

''جزیرہ شیطان''اس کے تحت چار ذیلی عنوان ہیں:

(اَ) ڈریفس کی نشست

(ب) جزیرہ شیطان سے فرار

(ج) جنگل میں

(د) کوئنک کوئنک

(11) گیارہویں نوٹ بک:

''الوداع'' کے عنوان کے تحت ہی اس کو لکھا گیا۔

(12)بارہویں نوٹ بک:

''جارج ٹاون''اس کے تحت پانچ ذیلی عنوان ہیں:

(اَ) جارج ٹاؤن کی زندگی

(ب) میرا نیا ہندی خاندان

(ج) ریستوراں

(د) بانس کی جھونپڑی

(ہ) جارج ٹاؤن سے فرار

(13) تیرہویں نوٹ بک:

''وینے زویلا''اس کے تحت تین ذیلی عنوان ہیں:

(اَ) اراپا کے ماہی گیر

(ب) الڈوراڈو کی جیل

(ج) آزادی

انہی سارے عنوانات سے یعقوب یاور نے اس سوانحی ناول کا ترجمہ بہت ہی سلیقے سے کیا ہے۔ اور انھوں نے اصل مصنف کے اسلوب و بیان، پلاٹ و کردار کا ترجمہ کرتے وقت یہ خیال رکھا ہے کہ ترجمے میں منشائے مصنف پوری طرح موجود رہے۔ ناول کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''واقعہ 26/اکتوبر 1931 کا ہے جب صبح آٹھ بجے مجھے حوالات سے باہر نکالا گیا تھا۔ اس حوالات میں مجھے گزشتہ ایک برس سے رکھا گیا تھا۔ اس دن میں نے شیو کر کے اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ میرے بدن پر میرا اپنا سوٹ بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ میں نے سفید قمیص اور زردی مائل ٹائی پہنی تھی جو میری جامہ زیبی کی تکمیل کر رہی تھیں۔ میری عمر پچیس برس تھی لیکن میں بیس سے زیادہ کا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ فوجی دستے کے جوان بھی میری جامہ زیبی سے متاثر معلوم ہو رہے تھے۔ شاید اسی وجہ سے مجھے ہتھکڑی نہیں پہنائی گئی تھی۔ ہم سب تعداد میں چھ تھے۔ ایک سارجنٹ چار سپاہی اور میں۔ باہر اداس آسمان تھا۔ ہمارے سامنے عدالت کی عمارت تھی جس کا نام زین کا ایوان انصاف تھا۔'' 4

مندرجہ بالا اقتباس میں مترجم نے اردو ترجمہ نگاری کے رموز و اوقاف کے ساتھ بہتر زبان کا استعمال کیا ہے۔ یعقوب یاور اردو ترجمہ نگاری میں ایک اہم مقام حاصل کر چکے ہیں۔ مشرف عالم ذوقی ان کے ترجمہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اردو میں مغربی ادب کے تراجم کی باگ ڈور تیرتھ رام فیروز پوری اور مظہر الحق علوی کی طرح یعقوب یاور نے بھی سنبھالی ہے۔ انھوں نے اس میدان میں کئی کارنامے انجام دیے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان تراجم سے ان کو کئی فائدے ہوئے۔ 5

یعقوب یاور نے ترجمے میں جو مقام اپنایا ہے اسے اردو دنیا بہت ادب و احترام کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اس کے لیے یعقوب یاور نے انتھک محنت کی ہے۔ ان کے ترجمہ کردہ ناولوں سے اردو میں مغربی ادب سے ذوق و شوق رکھنے والے قائدین مستفید ہو رہے ہیں۔ ان کے تراجم سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے

مشرقی ادب کے ساتھ ساتھ مغربی ادب کا مطالعہ بہت ہی گہرائی اور گیرائی سے کیا ہے۔

(4) کمند ہوا:

یہ ایک جاسوسی ناول ہے اس کے مصنف کا نام اگا تھا کرسٹی ہے۔اس کا ترجمہ یعقوب یاور نے 1985 میں کیا۔اس ترجمہ میں ناول کے جاسوسی خدوخال کو خیال میں رکھتے ہوئے یعقوب یاور نے ولیم شیکسپئر کے شعر کا ترجمہ اس ناول کے ابتدائی صفحے پر اس طرح لکھا ہے:

''آ بھی جا! آ بھی جا! اے موت
اداس سرو میں مجھے سلا دے
اڑ جا! اڑ جا! اے نفس
میری قاتل ہے بے درد میری موت
میرا سفید کفن پھولوں سے سجا دے
سوا ان کے میری موت کے ساتھ ہیں بھلا کون
پھولوں سے سجا کفن میرا اداس سر کا تابوت''

اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ترمیم کے ساتھ 2020ء میں منظر عام پر آیا مترجم نے اس کا نام بدل کر ''مغموم صنوبر'' رکھا ہے۔

مغموم صنوبر ایک ایسا جاسوسی ناول ہے جس میں جرائم کرنے والے مجرم خود کو روپوش کرنے میں کچھ حد تک کامیاب رہتے ہیں اس لیے اصل قاتل کا پتا لگا پانا مشکل ہوتا ہے۔ پوری کتاب میں قاری کا تجسس اور ناول کا جاسوسی پن برقرار رہے۔ یعقوب یاور نے اس کتاب کا ترجمہ بہت ہی سلیقہ مندی سے کیا ہے۔ترجمہ میں اصل کتاب کی تقریباً ساری کیفیت موجود ہے۔مغموم صنوبر کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

''ملزمہ ایلی مزکیتھرین کارلائل! تم پر الزام ہے کہ تم نے 27 جولائی کی سہ پہر میری گیراڈ کو قتل کیا ہے کیا تمھیں اپنے اس جرم کا اعتراف ہے؟ کیتھرین کارلائل عدالت کے کٹہرے میں کھڑی تھی اس کا چہرا احساس اور حسین تھا پرے غم ناک پردہ پڑا ہوا تھا

عدالت میں موجود لوگ دم بہ خور تھے اور ان پر عجیب کیفیت طاری تھی کمرے میں خاموشی تھی ایک گہری طویل خاموشی وکیل دفاع سرایڈوں بلمر خوف زدہ تھے کہ کہیں اس کی یہ خاموشی اس کے جرم کا اعتراف نہ بن جائے۔کیتھرین کے چہرے سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ اپنے ہوش حواس میں نہیں ہے کیتھرین کارلائل کے ہونٹوں پر جنبش ہوئی اس نے شکستہ خوردہ اور بجھے ہوئے لہجے میں کہا میں نے یہ قتل نہیں کیا ہے۔'' 6

ترجمہ کے اس اقتباس سے یعقوب یاور کی ترجمہ نگاری کا بہ حسن خوبی پتہ چلتا ہے کہ وہ ترجمہ کے تمام رموز سے واقف ہیں۔

(5) گاڈ فادر:

یہ ناول ماریو پوژو کا شاہکار ناول ہے۔اس ناول کا ترجمہ یعقوب یاور نے 1990 میں پہلی بار 'اقلیم اسود' کے نام سے کیا۔دوسری بار اس کی اشاعت پاکستان سے 2018 میں گاڈ فادر کے نام سے ہوئی۔ یہ وہ شاہکار ناول ہے جس کی وجہ سے امریکہ اور سسلی اٹلی کا ایک جزیرہ ہے جہاں سے مافیا گروہوں کی ابتداء ہوئی ان میں افراتفری مچ گئی تھی اس ناول کے ذریعہ ساری دنیا نے پہلی بار جانا کہ سسلی کے مافیا گروہ کے اندر جو خطرناک جرائم ہوتے تھے وہ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتے تھے۔اس ناول سے پہلے اس کا جاننا نامعلوم سا تھا۔سسلی مافیا کی جائے پیدائش ہے اور سسلی مافیا گروہ کی تمام اصطلاحات کی نسبت اسی سرزمین کی زبان سے ہے۔ان اصطلاحات کا استعمال اب ہر اس جگہ ہوتا ہے جہاں مافیا گروہوں کی سرگرمیاں ہیں۔کچھ اصطلاحات اس طرح سے ہیں مافیا کا سربراہ گاڈ فادر یا ڈان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مافیا کے ڈان میں کچھ ایسی صفات کا ہونا ضروری ہوتا ہے جو ظاہری طور پر اچھے ہوں لیکن باطنی طور پر یہ اچھے صفات مظلوموں پر تلوار کا کام کریں۔جیسے صبر و تحمل، مستقل مزاجی، یادداشت، قوت فیصلہ، کم گوئی، دور بینی اور غصہ پر قابو، ڈان ان ظاہری صفات کے بغیر اپنے عہدے پر فائز نہیں ہوسکتا اگر کسی ڈان کے اندر یہ ساری صفات نہ پائی جائے اور کسی طرح سے ان صفات کے بغیر ڈان بن بھی گیا تو اسے اپنی جان سے ہاتھ بھی دھونا پڑ جائے گا۔اس لیے اس عہدے کو موروثی نہیں سمجھا جاتا ہے۔ہاں اس بات کو اولیت ضرور دی جاتی ہے کہ

ایک ڈان کی مرنے کے بعد اس ڈان کے لڑکوں میں کوئی لڑکا ایسا ہے جس کے اندر یہ صفات موجود ہیں تو اسے ڈان کرسی پر بیٹھا دیا جاتا ہے۔ جب ڈان کا کوئی بیٹا ڈان بنتا ہے تو عوام میں خون خرابے کی نوبت کم ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈان کے عہدے کی فوراً بھر پائی ہو جاتی ہے ان اوصاف کے عدم موجودگی میں خاندان میں سرگرم کسی بھی شخص کا انتخاب اس عہدے کے لیے کیا جاتا ہے۔ جس میں ڈان بننے کی تمام صلاحتیں موجود ہوتی ہیں۔

مافیا کے سربراہ اپنے آپ کو کسی ملک کے بادشاہ سے کم نہیں سمجھتے ہیں اور وہ اپنے جرائم گناہ نہیں مانتے ہیں۔ اپنے آپ کو مسیحا اور سماج کا معمار سمجھتے ہیں اپنے ہاتھ سے کیے گئے قتل و غارت کو الگ نظر سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ ان کے جرائم اور گناہ قانون کی نظر میں گناہ عظیم ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی نظر میں اس کو گناہ نہیں بلکہ اس کو اصلاح معاشرہ کہتے ہیں۔ وہ قانون کے حدود کی پاسداری کو ضروری نہیں سمجھتے۔ ڈان اور ان کے قریبی لوگوں میں دو طرح کے اوصاف ہوتے ہیں ایک طرف رحم دلی، ہمدردی اور انسانیت کا احترام تو دوسری طرف وحشیانہ بربریت اور سفاکی اور سنگ دلی کے خصائص موجود ہوتے ہیں۔ ظاہری طور پر ڈان اور اس کے ممبران بے سبب کسی کو پریشان نہیں کرتے اور نہ ہی عوام کی روزمرہ زندگی میں دخل اندازی کرتے ہیں بشرطیکہ وہ کسی کی حق تلفی یا کسی ایسے جرم کا ارتکاب نہ کیا ہو جس کا بدلہ مافیا کے لغت میں سزائے موت ہو۔ مافیا کے ڈان کسی قانون یا کسی کی بندش میں نہیں رہتے ہیں وہ خود فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہوتے ہیں۔

مافیا کے مختلف خاندانوں میں باہمی روابط کے تعلق سے یہ صفت موجود ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں برابر کے شریک ہوتے ہیں بھلے ہی وہ آپس میں دشمن ہوں اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں لیکن تقاریب وغیرہ میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ شرکت کے وقت کوئی کسی سے انتقامی کاروائی نہیں کرتا ہے۔ مافیا سربراہوں کا سیاست، انتظامیہ اور عدلیہ سے براہ راست تعلق ہوتا ہے۔ جس کی مدد سے وہ کسی کے معاملے کو اپنے مطابق موڑ لیتے ہیں اور ان کے لیے کوئی قانون نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی ان پر کوئی سزا نافذ ہوتا ہے۔ اس ناول کے اندر ماریو پوژو نے انہی ساری کیفیات سے متحمل افراد کو کردار

بنا کر پیش کیا ہے جو کافی حد تک حقیقت پر مبنی ہے۔لیکن یہ ناول تاریخ کا حصہ نہیں ہے۔اسی کا ترجمہ یعقوب یاور نے سلیس اور سادے انداز میں کیا ہے۔اگر ہم اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یعقوب یاور نے بحسن خوبی ترجمہ کا حق ادا کیا ہے۔

اس ناول کو 32 حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔اور ہر حصے کے ذیلی حصے ہیں جو ناول کے سارے واقعات کو اچھی طرح سے منکشف کرتے ہیں۔رہی بات یعقوب یاور کے ترجمہ کی تو انھوں نے اس ناول میں لفظی ترجمہ نہ کر کے مفہومی طریقۂ ترجمہ اختیار کیا ہے۔مثال کے لیے اصل اور ہدف دونوں کے اقتباس پیش کیے جاتے ہیں:

اصل:(Source)

"A Merigo Bonasera in New york criminal court number 3 and waited for justice Vengcamce on the men who had so cruelly hurt his daughter who had tried to dishonor her.

The judge of ormindably heavy featured man, ralled in the sleeves of his black fobe as if physically chastice the two young man standing be fore the banch. His face war cold with majestic contempt. But there was something flase in all this that Amerigo Bonasera Sensed but did not yet understand"

(Chapter: 1-P-4) 7

ہدف(Target)

''امیریگو بونا سیرا نیو پارک کی فوج داری عدالت نمبر تین میں بیٹھا فیصلے کے انتظار کر رہا تھا۔اپنی بیٹی کو بے رحمی سے پیٹنے اور اس کی عصمت دری کی کوشش کرنے والوں

> کے لیے اس کے دل میں انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے۔'' 8؎
>
> ''جج نے اپنے سیاہ چوغے کی آستینیں کچھ اس انداز میں اوپر چڑھائیں جیسے سامنے کٹہرے میں کھڑے دونوں نوجوانوں کو جسمانی طور پر کوئی سزا دینے والا ہو۔ اس کے سرد چہرے پر اپنے عہدے کے وقار کے عین مطابق بے توجہی کی علامت نمایاں تھیں لیکن ان علامات میں جھوٹ کی ایک ایسی دبیز نقاب تھی جیسے امیر یگو بوناسیرا محسوس تو کر سکتا تھا لیکن سمجھنے سے قاصر تھا۔'' 9؎

مندرجہ بالا اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ یعقوب یاور کو ہدف واصل دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ ترجمے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ مترجم کا اصل سے زیادہ ہدف پر دسترس ہو اور یہ صفت یعقوب یاور میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

یعقوب یاور کی تخلیق ہو یا کہ تراجم انھوں نے ایسے موضوع کا انتخاب کیا ہے جس موضوع پر اردو دنیا میں کام بہت کم ہوئے ہیں ان کے تخلیق ترجمے اردو ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں انھوں نے اردو ادب کو گراں قدر سرمائے سے نوازا ہے۔

گارڈ فادر کے کردار:

ڈان اینڈ ولنی وٹو کارلین	گاڈ فادر، امریکی مافیا کا بے تاج بادشاہ
سانتینو کارلیون (سونی)	ڈان کا بڑا بیٹا
فریڈریکو کارلیون (فریڈی)	ڈان کا دوسرا بیٹا
مائیکل کارلیون (مائیک)	ڈان کا چھوٹا بیٹا
کارلو ریجی	ڈان کا داماد
تھامس ہیگن (ٹام)	ڈان کا سکریٹری اور کانی گلیوری
پیٹر کلے مین زا	ڈان کا کیپورزائم اور سپہ سالار
ٹے سیو	ایک اور کیپورزاتم

جانی فونٹین	فلم ایکٹر گلوکار اور ڈان کا گاڈسن
امیریگو یوناسیرا	ناانصافی کا شکار ایک امریکی شہری
گینکو ایویڈانڈو	ڈان کا سابق کانسی کلیوری
ڈائیانینو ویلسینتی	جانی فونٹین کا بچپن کا دوست
جیک والٹز	ہالی وڈ کا ایک بڑا پروڈوسر
کارلوترامونتی	جنوبی امریکہ کا ڈان
جوزف زولاچی	شہر ڈیڑائٹ کا ڈان
فرینک فالکن	امریکہ کے مغربی ساحل کا ڈان
ایتھونی مولی نری	سان فرانسکو کا ڈان
ونسینٹ فوریجا	ایک اور طاقت ور ڈان
توماسنو	سسلی کے گاؤں کارلیون کا ڈان

خواتین کا کردار:

کانسٹامجیا کارلیون (کونی)	ڈان کارلیون کی اکلوتی بیٹی
لوسی مین لینی	سونی کی محبوبہ اور کونی کی سہیلی
کے ایڈمس	مائیکل کی گرل فرینڈ
مارگنٹ ایشٹن	جانی فونٹین کی بیوی
شیرون مور	ہالی وڈ کی نو وارد فلم ایکٹریس
ایولونیا	مائیکل کارلیون کی پہلی بیوی
ساندلا	سونی کی بیوی
تھیریسیا	ٹام ہیگن کی بیوی

(6) رقص ازل:

اس ناول کا ترجمہ یعقوب یاور نے 1985 میں ترجمہ کیا۔ اس کا اصل نام The Man From St. Petersurg ہے۔اس کے مصنف کا نام Ken follet ہے۔اشاعت ثانی میں اس کا نام مترجم نے سینٹ پیٹرسن برگ رکھا ہے جو 2020 میں پاکستان سے شائع ہوا۔ یہ بھی جاسوسی ناول کا ترجمہ ہے۔ترجمہ کردہ ناول کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اتوار کی خوشگوار دوپہر تھی والڈ کو یہ موسم بہت پسند تھا وہ کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا باہر درختوں کی قطاریں تھیں شاہ بلوط کے درخت تھے پھولوں کی بیلیں تھیں جو کسی لڑکی کے گھنگرالے بالوں کی طرح نظر آ رہی تھی سورج اوپر آ چکا تھا اور درختوں کے سائے گہرے ہو چکے تھے پرندے خاموش تھے صرف شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی گھر کے اندر بھی باہر جیسی خاموشی تھی بیشتر ملازمین کھانا کھانے کے لیے جا چکے تھے آج کی تعطیل منانے کے لیے والڈن کا چھوٹا بھائی جارج اپنی بیوی کلاریسا اور بچوں کے ساتھ آیا ہوا تھا۔'' 10؎

مندرجہ بالا سطروں میں یعقوب یاور نے اپنی تخلیقی ذہن کے سہارے ناول کا ترجمہ کیا جس میں ان کا طریقہ ترجمہ نرالا ہے اس میں جس طرح کی منظر کشی کی گئی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی تخلیق کردہ ناول کا منظر پڑھ رہے ہیں جس کو ناول نگار منظر کشی کے طور پر پیش کیا ہے۔

(7) طاق نیساں:

اس جاسوسی ناول کا ترجمہ مترجم نے 1986 میں کیا۔ اس کا اصل نام Sleeping Murder ہے۔اس کے مصنف کا نام آگاتھا کرسٹی ہے جنھوں نے کئی جاسوسی ناول لکھے ہیں لیکن یہ ناول ان کے تمام ناولون میں ممتاز ہے۔اشاعت ثانی میں یعقوب یاور نے اس کا نام ''خوابیدہ فتنہ'' رکھا جو 2020 میں پاکستان سے شائع ہوا۔

(8) شب گزیدہ 1987:

اس ناول کا اصل نام ’’Christmas‘‘ ہے اس کی مصنفہ کا نام ’’Agathia christie‘‘ ہے۔ جب یہ کتاب دوبارہ شائع ہوئی تو اس کا نام کرسمس رکھا گیا یہ پاکستان سے 2018ء میں شائع ہوئی۔ یہ ناول ایسے قتل کی روداد پر منحصر ہے جس میں تحیرات کی کثرت ہے سراغ رسائی اور تفتیش کے واقعات کو کرداروں کے ذریعے بڑی عمدگی سے ناول میں پیش کیے گئے ہیں۔

(9) درہ خیبر کے اس پار 1988 (lie down with lion)

جب یہ کتاب دوبارہ شائع ہوئی تو اس کا نام یعقوب یاور نے ’’وادی پنج شیر‘‘ رکھا۔ جو 2018 میں پاکستان سے شائع ہوئی۔ اس کے اصل مصنف کا نام ken follet ہے اس میں افغانستان اور روس کی لڑائی کا ذکر ہے، امریکہ کا افغانستانیوں کی مدد کرنا اور روسی فوجیوں کے خلاف لڑائی لڑنا ان سب کی تفصیل اس ناول میں موجود ہے جب روس افغانستان کو اپنا غلام اور سرزمین افغانستان کو اپنی ملکیت تصور کرنے لگا تھا تب افغانیوں نے بہت ہمت دکھائی تھی اور بغیر سامان جنگ کے روسی فوجوں کا مقابلہ کیا اس میں امریکہ نے اپنی فوجوں کو افغانستان کی مدد کے لیے بھیجا تھا۔ اس ناول کے کچھ اہم کردار یہ ہیں:

فرانسیسی کردار، رحمی جیال، جم لوتھر، جیری والٹر، جین لیمبرٹ، افغانی کردار، احمد شاہ مسعود، جہان کامل، ملا عبداللہ، زہرہ گل، امریکی کردار، ولیم اسمتھ، مارگریٹ، پیٹل مارگریٹ

اس ناول میں تین ملکوں کی فوج اور ان کے حرکات و سکنات کو جس طرح اصل مصنف نے اپنی کتاب میں پیش کیا ہے اسی طرح یعقوب یاور نے ان چیزوں کو اردو زبان میں لکھا ہے جس میں یعقوب یاور کا طریقۂ ترجمہ تخلیقی ہے۔

(10) زہراب نیل 1989:

اس ناول کا اصل نام ’’Death on the nile‘‘ ہے اور اس کی مصنفہ کا نام ’’Agathia Christie‘‘ ہے۔

(11) پتلی گھر (ڈراما)2000:

اس کا اصل نام ''A Dolts Ifouse'' اور اس کے مصنف کا نام ''Henrik Ibsen'' ہے۔اس ڈرامے میں عورت کی محبت و ہمدردی دکھایا گیا ہے اور مرد کی جابرانہ اور اجادارانہ وخودمختاری کو پیش کیا گیا ہے۔مرد کی فکری و سماجی برتری کے ممیّزات کو ڈراما نگار نے بڑی بے باکی سے پیش کیا ہے۔اس ڈرامے کے کچھ مشہور کردار یہ ہیں:

1۔توروالڈ ہیملر 2۔تورا ہیملر کی بیوی3۔ڈاکٹر رینگ 4۔مسز کرسٹین لنڈے 5۔نلس کروگسٹاڈ 6۔آئے میری (آیا) 7۔ہیلن (ملازمہ) 8۔ایک قلی۔اس کتاب کے ترجمے میں اکثر لفظی ترجمے کا طریقہ اپنایا گیا ہے لیکن اس میں روانگی اور سلاست موجود ہے پڑھنے والے کو اصل کتاب کی معلومات سے یہ ترجمہ واقف کراتا ہے۔

ناولوں کے ترجمہ کے علاوہ یعقوب یاور نے دوسرے اصناف کا بھی ترجمہ کیا ہے۔جن کے نام حسب ذیل ہیں:

1۔ سوانح سردار ولبھ بھائی پٹیل: یہ کتاب 1998 میں شائع ہوئی۔

2۔ سیکھنے کا فن: اصل نام

Krishnamurti on learning by J. Krishnamrti

3۔کتاب حیات (فلسفہ)1999 The book of life by J. Krishnamurti

4۔ تاریخ ساز ایجادات (سائنس) 2002

"Invention that made history" by dlip salvi

5۔ داخلی نشوونما (فلسفہ)

"Inward flowering" by J.Krishnamurti

6۔ سچ بے جادہ منزل (فلسفہ)

"Truth is a pathless land" by J.Krishnamurti

7۔ ایک زبان دو رسم الخط (ادب)

"One language two script" by christoopherking

یعقوب یاور کے ناولوں کے ترجمہ کے بارے میں مشتاق احمد قادری لکھتے ہیں:

''جناب یعقوب یاور کوٹھی کی کاوش قابل داد ہے۔ ان کا ترجمہ ہموار میدان میں بہتے ہوئے چشمے کی طرح رواں دواں ہے۔ یعقوب یاور نے ایک کامیاب مترجم کی حیثیت سے اردو تراجم میں اپنا مقام بنالیا ہے۔ ترجمہ سے ان کی دلچسپی کا سلسلہ ہنوز جاری ہے جس کے پیش نظر امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے تراجم کے ذریعہ مختلف زبان کے ادب پاروں سے اردو ادب کے سرمائے میں اضافہ کرتے رہیں گے۔'' 11؎

اردو میں جاسوسی اور مہماتی ناولوں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر بہت سارے لوگ اس قسم کے ناولوں کے ترجمے کیے ان میں یعقوب یاور کا نام بطور خاص قابل ذکر ہے۔ ابراہیم یوسف لکھتے ہیں:

''ہم نے ''سدھارتھ'' کے علاوہ باقی چار ناولوں کے ترجموں کو پڑھا تو محسوس ہو کہ ہم ترجمہ نہیں بلکہ تخلیق پڑھ رہے ہیں اور یہی ترجمہ کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ یعقوب صاحب کے تراجم کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ ان کو ترجمہ کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ انگریزی زبان کو سمجھنے اور پھر اسے اردو میں منتقل کرنے کی اچھی سوجھ بوجھ ہے۔'' 12؎

یعقوب یاور نے جس قسم کے ترجمے کیے ہیں اس میں علمی ترجمہ، ادبی ترجمہ، صحافتی ترجمہ شامل ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر ناولوں کے ترجمے کیے ہیں۔ ان کے ترجمے کی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف کے لہجے اور طرز ادا و ذہنی تسلسل کو مرکزیت حاصل ہے جس سے منشائے مصنف کو برقرار رکھتے ہوئے اصل کتاب کی اہمیت اور ترجمے کا مقصد پورا کرنے میں کامیاب ہیں۔ ان کے کچھ ترجمے ایسے ہیں جو دو دو نام سے شائع ہوئے ہیں جیسے 'گارڈ فادر'، 'اقلیم اسود' کے نام سے، 'کمند ہوا'، 'مغموم صنوبر' کے نام سے، 'طاق نسیاں' 'خوابیدہ فتنہ' کے نام سے 'درہ خیبر کے اس پار'، 'وادی پنج شیر' کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔

☆☆☆☆☆

ترتیب

یعقوب یاور اور آغا جمیل کاشمیری نے آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں کا کلیات سات جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ یہ کلیات قومی کونسل برائے فروغ اردو کی جانب سے 2004 میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ دیباچے میں آغا حشر کاشمیری کا تعارف، ان کی تصانیف اور ادبی خدمات کو مرتبین نے قلم بند کیا ہے۔ جلد اول میں آغا حشر کاشمیری کے چار ڈرامے ہیں:

(1) آفتاب محبت

(2) مرید شک

(3) مار آستین

(4) اسیر حرص

'**آفتاب محبت**' یہ آغا حشر کا پہلا ڈراما ہے جس کو انھوں نے 17 سال کی عمر میں لکھا اور یہ ڈراما احسن لکھنوی جیسے مقبول ڈراما نویس کے مقابلے میں لکھا گیا تھا۔ آغا حشر نے دعویٰ کیا کہ جیسے احسن لکھنوی ڈراما لکھتے ہیں میں اس طرح کا ڈراما ایک ہفتہ میں لکھ سکتا ہوں۔ آفتاب محبت انہیں کے جواب میں لکھا ہے۔ یہ ڈراما روایتی اور تقلیدی انداز کا ہے۔ کسی کمپنی اور اسٹیج کے لیے یہ ڈراما نہیں لکھا گیا تھا۔ مرتبین لکھتے ہیں:

> ''یہ آغا حشر کا پہلا ڈراما ہے جو انھوں نے صرف 17 برس کی عمر میں احسن لکھنوی جیسے مقبول ڈراما نویس کے بالمقابل اس دعوے کے ساتھ لکھا تھا کہ جیسا آپ ڈراما لکھتے

ہیں میں ایک ہفتے میں لکھ سکتا ہوں۔'' 13؎

یہ ڈراما آغا حشر کاشمیری نے بنارس پریس کے مالک عبدالکریم خان کے ہاتھ ساٹھ روپئے میں فروخت کردیا تھا۔حالانکہ اس کی مستند روایت نہیں ملتی ہے۔یہ ڈراما 1897 میں شائع ہوا اور آغا حشر نے اپنے ہم عمر دوستوں کی مدد سے بنارس ہی میں اسے اسٹیج کیا تھا۔

'مرید شک' یہ ڈراما 1899 میں شائع ہوا۔جب آغا حشر بنارس سے ممبئی منتقل ہوئے تو وہاں پر لکھا جانے والا یہ پہلا ڈراما تھا۔یہ ڈراما شیکسپیر کے ڈرامے ونٹر ز ٹیل کے ڈرامے کا آزاد ترجمہ ہے۔اس کو مرید شک کے علاوہ جنگل کی رانی،اور جنگل کی شہزادی کے نام سے اسٹیج کیا گیا تھا۔آغا حشر کے ذخیرے میں اس ڈرامے کے دو مسودے مرتبین کو ملے تھے۔مسودے کے کاتب منظور احمد مہدوی تھے مرتبین لکھتے ہیں:

> '' آغا حشر کے ذخیرے میں اس ڈرامے کے دو مسودے دستیاب ہوئے۔پہلے مسودے میں 102 صفحات ہیں۔ہر صفحے پر صفحہ نمبر لکھا ہوا ہے۔'' 14؎

آغا حشر نے اس ڈرامے میں ماحول اور مزاج کو مشرقی مزاج بنانے کی کوشش کی ہے۔جس کی بنا پر اس کی حیثیت ترجمے کے بجائے تخلیق کی ہوگئی ہے۔اور ڈراموں کو ایشیائی لباس و ہندوستانی عناصر سے پیوست کیا ہے۔جس کی بنا پر یہ ڈراما عوام میں بہت مقبول ہوا اور اسے ساٹھ سے زائد بار اسٹیج کیا گیا۔

'مارآستین' یہ ڈراما 1899 میں لکھا گیا۔مرید شک کے پانچ ماہ بعد کاوس جی پالن جی کی فرمائش پر الفریڈ کمپنی کے لیے یہ ڈراما لکھا گیا تھا۔اس کا موضوع اصلاحی تھا۔مرتبین لکھتے ہیں:

> '' یہ آغا حشر کا پہلا معاشرتی ڈراما ہے جو مرید شک لکھنے کے پانچ ماہ بعد کاوس جی پالن کی فرمائش پر ان کی الفریڈ کمپنی کے لیے لکھا گیا۔شاید اس ڈرامے کو عوام نے زیادہ پسند نہیں کیا۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دلکش مناظر اور بھڑک دار لباس دیکھنے کے عادی عوام ابھی سماجی مسائل پر کوئی سنجیدہ ڈراما دیکھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔'' 15؎

آغا حشر کے ذخیرے میں جس سے مرتبین نے استفادہ کیا ہے اس میں اس ڈرامے کا ایک ہی مسودہ ملا اور یہ اس ڈرامے کا پہلا اور آخری مسودہ ہے۔اس مسودے پر کوئی سرورق نہیں ہے اور یہ 93

صفحات پر مشتمل ہے۔

'اسیر حرص' یہ ڈراما 1901 میں منظر عام پر آیا۔ یہ شیریڈون کے مشہور ڈراما پزارو سے ماخوذ ہے۔اوراس کو آغا حشر نے نوروز جی پری کی کمپنی کے لیے لکھا تھا۔اس کے بارے میں مرتبین لکھتے ہیں:

> ''آغا حشر نے اس مغربی ڈرامے کو بھی تمام تر ہندوستانی رنگ میں ڈھال دیا ہے۔پھر بھی اس کے کچھ سین کرداروں کے ناموں کی تبدیلی کے ساتھ ہو بہو اصل ڈرامے کے طرز پر برقرار رکھی ہیں۔اس میں استعمال کیے گئے کامک کو بھی ڈرامے کے پلاٹ سے مربوط پرنے کی کوشش کی گئی ہے۔''16

اس ڈرامے کے دو مسودے مرتبین نے حاصل کیے جو 118 صفحات پر محیط تھے۔ ہر صفحے پر صفحہ نمبر درج تھا اس کے کاتب کا نام منظور احمد لکھا گیا تھا۔ دوسرے مسودے کی حالت خستہ تھی۔ جس کا پڑھنا مرتبین کو محال لگا۔اس بنا پر مشمولہ متن کی تیاری میں اس مسودے کی مرتبین نے مدد نہیں لی۔

اور دوسری جلد میں تین ڈرامے ہیں:

(1) شہید ناز

(2) سفید خون

(3) صید ہوس

'شہید ناز' یہ ڈراما 1902 میں لکھا گیا جس کو آغا حشر نے کاوس جی کھٹاؤ کی الفریڈ تھیٹریکل کمپنی کے لیے لکھا۔ڈراما کے شائقین نے اسے بہت پسند کیا اور یہ بار بار اسٹیج کیا جاتا رہا۔اس ڈرامے کو کل پانچ مسودے مرتبین کو دستیاب ہوئے یہ ڈراما 89 صفحات پر مشتمل ہے۔

'سفید خون' یہ ڈراما 1906 میں اڈیسر بھائی کی کمپنی کے لیے لکھا گیا۔اس کے سن تصنیف میں اختلاف پایا جاتا ہے۔اس ڈرامہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ شیکسپیر کے مقبول ڈراما کنگ لیئر کا ترجمہ ہے حالانکہ یہ بات درست نہیں ہے۔ دونوں ڈرامے کا مرکزی خیال ایک ہے لیکن پلاٹ میں کسی طرح کی کوئی مماثلت موجود نہیں ہے۔مرتبین لکھتے ہیں:

''آغا حشر نے یہ ڈراما 1906 اڈیسر بھائی (اردوشیر بھائی) ٹھونٹھی کی کمپنی کے لیے لکھا تھا۔اس کے سال تصنیف کے بارے میں خاصہ اختلاف ہے۔ایک بادشاہ حسین اور انجم آرا اسے 1906 کی تخلیق قرار دیتے ہیں تو دوسری طرف عبدالعلیم ،ابراہیم یوسف اور محمد شفیع مختلف وجوہ کی بنا پر اسے 1907 تخلیق ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔آغا حشر کے ذخیرے سے اس ڈرامے کا جو واحد مسودہ دستیاب ہوا ہے اس کے پہلے ڈراپ کے بعد یہ زبان انگریزی کے ایک اندراج موجود ہے۔جس میں دستخط کے نیچے 17 جولائی 1906 بروز منگل بمقام ممبئی تحریر ہے۔''17؎

اس ڈرامے میں بادشاہ خاقان کے واقعات کا بیان ہے۔اس ڈرامے کو تحریر کرتے وقت آغا حشر کے ذہن میں شیکسپیر کا ڈراما کنگ لیئر کا موضوع کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا ہوگا۔جس کی بنا پر کچھ لوگ اسے اس کا ترجمہ مانتے ہیں۔حالانکہ کسی صورت میں یہ کنگ لیئر کا ترجمہ نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔

'صید ہوس' یہ ڈراما 1907 میں لکھا گیا جو کبھی کبھی 'بھائی کا قاتل' کے نام سے پیش کیا گیا تھا۔اس کو آغا حشر نے مدراس میں بیٹھ کر لکھا تھا اس کی سن تصنیف کے بارے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔اس ڈرامے میں بادشاہ داراشاہ کا بھائی نادر جنگ اسے قتل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن الزام سنجر نامی آدمی پر جاتا ہے۔اس ڈرامے میں ولی عہدی اور جنگ وجدال کے مسئلے کو دکھایا گیا ہے۔مرتبین لکھتے ہیں؛

''اس کے سال تصنیف پر بھی اختلف رائے پایا جاتا ہے۔کسی کے خیال کے مطابق یہ 1906 میں لکھا گیا ہے۔کوئی اسے 1907 کی تصنیف کہتا ہے اور کسی کے نزدیک یہ 1908 کی تخلیق ہے۔ان سب کے پاس اپنی بات کے لیے اپنے اپنے جواز موجود ہیں۔لیکن حقیقت یہ ہے کی آغا حشر نے یہ ڈراما 'سفید خون کے فقراً بعد لکھا تھا۔''18؎

آغا حشر کے ذخیرے سے اس ڈرامے کے دو مسودے مرتبین کو ملے۔مسودے کے ابتدائی صفحات پر کرداروں کی فہرست مندرج ہے۔اس کے آگے ان کرداروں کو ادا کرنے والے اداکاروں کا نام بھی لکھا ہوا

ہے۔

تیسری جلد میں بھی تین ڈرامے ہیں:

(1) خوابِ ہستی

(2) خوبصورت بلا

(3) سلور کنگ

'خوابِ ہستی' یہ ڈراما 1908 میں شائع ہوا۔ سہراب جی آگرہ کی کمپنی دی نیو الفریڈ تھیٹریکل کمپنی آف ممبئی کے لیے یہ ڈراما لکھا گیا تھا اور ہندوستان کی ڈراما کی اور کمپنیوں نے بھی اسے اپنے اپنے اسٹیج پر پیش کیا۔ یہ آغا حشر کے کامیاب ترین ڈراموں میں سے ایک ہے۔ اس ڈرامے کو کچھ لوگوں نے شیکسپیئر کے ڈرامے میک بیتھ سے جوڑا ہے۔ لیکن حقیقت میں ان دونوں ڈراموں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس ڈرامے میں عشقیہ بیان کا ذکر ملتا ہے۔ مرتبین لکھتے ہیں:

> ''آغا حشر کے ذخیرے سے اس کے تین مسودے دستیاب ہوئے ہیں۔ پہلا مسودہ مجلد ہے۔ اس میں جا بجا پنسل سے اصلاح ہے۔ غالب امکان ہے کہ خود آغا حشر نے اس پر نظر ثانی کی ہے۔ مسودہ خوشخط صاف اور اچھی حالت میں ہے۔ لیکن اس میں نہ کاتب کا نام درج ہے اور نہ کتاب کی تاریخ اور مقام۔ یہ مسودہ سب سے پرانا معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا مسودہ بھی خوشخط ہے۔۔۔ تیسرا مسودہ منظور احمد مہدوی عظیم آبادی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے پہلے صفحہ پر کتابت کی تاریخ 17 جولائی 1927 ہے۔''19

اس ڈرامے کو خوابِ ہستی کے علاوہ اکثر پیار کی پتلی کے نام سے بھی کھیلا گیا ہے۔ اس ڈرامے میں آغا حشر نے عورت کی محبت کے ساتھ اس کے جذبات کو پیش کیا ہے۔

'خوبصورت بلا' یہ ڈراما آغا حشر کاشمیری نے 1909 میں تصنیف کی۔ اس ڈرامے میں ایک مکار عورت کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے۔ جس میں زبان و بیان سیاسی اور سماجی عکاسی بہترین طریقے سے ملتی

ہے۔جس کی وجہ سے اس ڈرامے میں نیا پن موجود ہے۔ساتھ ہی اس ڈرامے میں شاعری کا عنصر بھی غالب ہے۔مرتبین لکھتے ہیں:

''آغا حشر کے ذخیرے سے اس ڈرامے کے دو مسودے ملے ہیں۔ پہلا مسودہ مجلد رجسٹر کی شکل میں ہے۔اس کے پہلے صفحے پر ڈرامے کا نام ''خوبصورت بلا'' کے ساتھ ساتھ ''حسین بلا'' بھی لکھا ہوا ہے۔ یہ مسودہ مکمل صحیح حالت میں ہے۔ کتابت منظور احمد عظیم آبادی کی ہے۔اختتام کتابت کی تاریخ 26 جنوری 1926 درج ہے۔''20؎

جب آغا حشر نے حیدرآباد کے راجا رگھوبیندر راؤ کے اشتراک سے پہلی بار اپنی کمپنی دی گریٹ الفریڈ تھیٹریکل کمپنی آف حیدرآباد کی بنیاد ڈالی تو یہ ڈراما سب سے پہلے اسٹیج کیا گیا۔حیدرآباد میں اس ڈرامے کی مقبولیت اتنی ہوگئی کہ شہر کا کوئی بھی شخص جو ڈرامے کا شوقین ہوا ایسا نہ تھا کہ اس ڈرامے کو دیکھا نہ ہو۔

'سلور کنگ' یہ ڈراما ہینری آرتھر جونز کے ڈرامے سے اخذ کیا گیا ہے۔یہ ایک اصلاحی ڈراما ہے۔اس میں آغا حشر کاشمیری نے ہندوستانی رنگ بھر دیا ہے۔جس کی وجہ سے یہ ڈراما پوری طرح سے ہندوستانی تہذیب وتمدن کا عکاس ہے۔اور یہ آغا حشر کی تخلیقی کمال کا ثبوت بھی ہے۔مرتبین اس ڈرامے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''آغا حشر کے ذخیرے میں اس کے تین مسودے دستیاب ہوئے۔اس کا ایک مطبوعہ نسخہ بھی پیش نظر رہا، جو سرفرازی قومی پریس لکھنؤ کا طبع شدہ ہے۔لیکن اس میں سال اشاعت درج نہیں ہے۔اس کا ایک مسودہ مجلد رجسٹر کی شکل میں ہے، جس کے اوراق بے ترتیب ہو چکے ہیں۔اہسا معلوم ہوتا ہے کہ اس جلد میں الگ الگ دو کاتبوں کے لکھے ہوئے دو مسودے یکجا کر دئے گئے ہیں۔۔۔تیسرا مسودہ بھی رجسٹر کی شکل میں ہے جو 141 صفحات پر مشتمل ہے۔سرورق کی تحریک کے مطابق اس کے کاتب کا نام منظور احمد عظیم آبادی اور مقام تحریر آرا، شاہ آباد (بہار) ہے۔''21؎

جس وقت یہ ڈراما لکھا گیا اس وقت آغا حشر اس فن میں پختہ ہو چکے تھے اور بلندی پر فائض بھی ان کا نام ڈرامے کی کامیابی کی ضمانت بن چکا تھا۔انھوں نے اپنے قلم کے ذریعے سماج کی اصلاح کی اور تفریح

کا سامان بھی ڈرامے کی شکل میں مہیا کرایا۔

چوتھی جلد میں چار ڈرامے ہیں:

(1) یہودی کی لڑکی

(2) ترکی حور

(3) رستم سہراب

'یہودی لڑکی' یہ آغا حشر کا مقبول و معروف ڈراما ہے جس کو انھوں نے 1910 اور 1911 کی درمیانی مدت میں اپنی کمپنی دی گریٹ الفریڈ کمپنی آف حیدرآباد کے لیے لکھا تھا۔ پہلی بار یہ ڈراما اسی کمپنی کے اسٹیج پر پیش ہوا تھا۔ اس ڈرامے میں رومن سلطنت کے واقعات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ڈرامے کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے آغا حشر نے اس کا دوسرا حصہ بھی لکھا تھا جو مکمل شکل میں دستیاب نہیں ہے۔ مرتبین لکھتے ہیں:

> ''یہودی کی لڑکی کی ترتیب میں اس کا ایک مطبوعہ نسخہ اور چار مسودے پیش نظر رہے ہیں۔ مطبوعہ نسخہ نرائن دت سہگل، لاہور کا شائع کردہ ہے۔ اس پر سال طباعت درج ہے۔۔۔ مسودات میں پہلا مسودہ مجلد رجسٹر کی شکل میں ہے۔۔۔ دوسرا مسودہ بھی رجسٹر سائز میں مجلد ہے۔۔۔ تیسرا مسودہ بہت خراب حالت میں ہے یہ بھی رجسٹر سائز میں ہے۔۔۔ چوتھا مسودہ مجلد کاپی کے سائز میں ہے۔ اس کے صفحات کی تعداد 126 صفحات ہے۔'' 22

''یہودی کی لڑکی'' آغا حشر کے ان ڈراموں میں سے ایک ہے جس نے آغا حشر کو اردو ڈراما نگاری میں تاج عطا کیا۔ یہ ڈراما مختلف اوقات میں مشرقی ستارہ اور وفا کی پتلی کے نام سے بھی اسٹیج کیا گیا تھا۔ اس ڈرامے پر یہودی کے نام سے فلم بھی بنی ہے۔ ڈرامے میں رومنوں کے مظالم کی داستان کا بیان ہے۔ جو انھوں نے یہودیوں کے ساتھ روا رکھا تھا۔

'ترکی حور' یہ ڈراما آغا حشر کے اصلاحی ڈراموں میں سے ایک ہے۔ جس میں ان کا اصلاحی پہلو

شامل ہے۔ یہ ڈراما 1922 میں لکھا گیا۔ سلور کنگ کی طرح اس ڈرامے میں بھی شراب نوشی، قمار بازی اور طوائفوں سے تعلق رکھنے والے برے نتائج کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اسے مڈنس کمپنی کے لیے کھا گیا تھا۔ اس میں ہندوستانی بیوی کا مثالی کردار پیش کیا گیا ہے۔ جو شوہر کے انتہائی ناروا سلوک اور حد درجہ ظلم و ستم کے باوجود بھی وفاداری کا ثبوت دیتی ہے۔ یہ ڈراما آغا حشر کے ساتھ عوام کو بھی بہت پسند آیا۔ اس ڈرامے کے مکالمے ادبیت سے پر ہیں۔ جس سے آغا حشر کی مہارت اور مشاقی کا پتا چلتا ہے۔ مرتبین اس ڈرامے کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''اس ڈراما کے چار مسودے اور تین مطبوعہ نسخے آغا صاحب کے ذخیرے سے برآمد ہوئے۔۔۔ دستاب چار مسودوں میں سے پہلا مسودہ مجلد کاپی کی شکل میں ہے۔ دوسرا مسودہ تین سو صفحات کی ایک کاپی میں منقول ہے۔ چوتھا مسودہ جو 124 صفحات پر مشتمل ہے۔''23ے

'ترکی حور' اس ڈرامے کا نام کیوں رکھا گیا اس بات کا پتا کسی کو نہ چلا۔ مرتبین نے اس کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن ڈرامے کے متن اور اس کے لوازمات سے یہ واضح نہ ہوا کہ ترکی حور اس ڈرامے کا نام کیوں رکھا گیا۔ ڈرامے کی کہانی کچھ اس طرح سے ہے کہ آصف نام کا ایک شریف آدمی غلط صحبت میں پڑ کر بیکار اور شرابی بن جاتا ہے۔ شراب کے نشے میں اپنے خسر سے لڑائی کرتا ہے جو اسے اپنے گھر سے نکال دیتا ہے۔ بیوی رشیدہ اپنے شوہر کا ساتھ دیتی ہے اس کے ساتھ وہ اپنے رئیس باپ کا گھر چھوڑ کر شرابی شوہر کے ساتھ غریبی کی زندگی گزارنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ اسی کہانی کے اردگرد یہ ڈراما گھومتا ہے۔

'رستم سہراب' یہ ڈراما 1929 میں لکھا گیا تھا۔ اور یہ ڈراما عشق و فرض کے نام سے بھی مشہور ہوا۔ اس ڈرامے میں باپ اور بیٹے کی لڑائی کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ ڈراما رزمیہ ادب کی بہترین مثال بھی ہے۔ اس ڈرامے کے تعلق سے مرتبین لکھتے ہیں:

> ''آغا حشر کے ذخیرے سے اس کے دو مطبوعہ اور قلمی نسخے دستیاب ہیں۔ قلمی نسخوں

میں پہلا نسخہ منظور احمد عظیم آبادی کا لکھا ہوا ہے۔ دوسرا نسخہ خود آغا جمیل کاشمیری نے
اسی مسودے سے تیار کیا ہے۔'' 24ے

اس ڈرامے میں ایران کے مشہور پہلوان اور سردار رستم کا ذکر ہے۔ جس کی شادی تہمینہ نام کی لڑکی سے ہوتی ہے دو دن ساتھ رہنے کے بعد دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں پھر تہمینہ سے سہراب کی پیدائش ہوتی ہے۔ توران میں سہراب بڑا ہوتا ہے۔ پھر توران کے بادشاہ نے اپنے انتقام کے لیے سہراب کو رستم سے لڑائی کے لیے تیار کرتا ہے جس کی بنا پر باپ اور بیٹے میں لڑائی ہوتی ہے۔ لڑائی میں رستم کے ہاتھوں سہراب مار دیا جاتا ہے۔ لیکن جب باپ کو پتا چلتا ہے کہ یہ میرا بیٹا ہے تو اسے پچھتانے کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ اسی کہانی پر اس ڈرامے کا انحصار ہے۔

پانچویں جلد میں چار ڈرامے ہیں:

(1) بلوا منگل

(2) مدھر مرلی

(3) بھارت منی

(4) بھگیر تھ گنگا

'بلوا منگل' یہ ڈراما 1914 میں شائع ہوا لیکن اس کے زمانہ تصنیف کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کوئی اسے 1915 کی تصنیف مانتا ہے، کوئی 1916 کی۔ لیکن راجح قول کے مطابق اس کی سن تصنیف 1914 ہی ہے۔ اس ڈرامے کا بیال رام چرت مانس کے تخلیق کار تلسی داس کی زندگی سے مستعار ہے۔ اس ڈرامے میں سماج کی اصلاحی پہلو غالب ہے۔ مرتبین اس تعلق سے لکھتے ہیں:

'' آغا حشر کے ذخیرے سے اس ڈرامے کے دو قلمی نسخے اور ایک مطبوعہ نسخہ دستیاب ہوا ہے۔ یہ تینوں اردو رسم خط میں ہیں۔ دونوں قلمی نسخے مجلد کاپی میں لکھے گئے ہیں۔۔۔'' 25ے

اکثر ناقدین نے اس ڈرامے کو سورداس سے جوڑا ہے جب کہ اس کا تعلق سورداس سے بالکل نہیں

ہے۔ ممکن ہے تلسی داس کی کہانی پڑھ کر آغا حشر کے ذہن میں اس فرضی سورداس کا تصور ابھرا ہو اور انھوں نے اس کی بنیاد پر اس ڈرامے کی تخلیق کی ہو لیکن براہ راست اس ڈرامے کا تعلق سورداس سے نہیں ہے۔

'مدھر مرلی' یہ ڈراما 1919 میں لکھا گیا۔ اس ڈرامے میں شری کرشن کی سوانحی حالات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جس میں کرشن کا گوپیوں سے پریم کرنا وغیرہ شامل ہے۔ عورتوں میں کرشن کے لیے بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ یہ چیزیں اس ڈرامے میں آغا حشر کاشمیری نے لکھا ہے۔ مرتبین اس ڈرامے کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''آغا حشر کے ذخیرے سے اس ڈرامے کا جو واحد مسودہ دستیاب ہوا ہے۔ وہ آغا جانی کا نقل کردہ ہے۔ یہ اردو رسم خط میں ہے۔ یہ نقل پانچ مارچ 1954 کو شروع کر کے 11 مارچ 1954 کو مکمل کی گئی ہے۔ مسودہ معمولی مجلد کاپی کی شکل میں ہے۔ خط واضح ہے۔''26ے

اس ڈرامے میں آغا حشر کاشمیری نے بڑی خوبصورتی سے محبت کا بیان کیا ہے۔ جس میں کرشن اور گوپیاؤں کی محبت خصوصی طور پر شامل ہے۔ ساتھ ہی اس ڈرامے میں یہ بتایا گیا ہے کہ کیسے دھرم کے نام پر ڈھونگی مہاتما اور سنت لوگوں کو ٹھگتے ہیں۔

'بھارت منی' یہ ڈراما 1920 میں لکھا گیا اور مختلف جگہوں اور مختلف کمپنیوں کے ذریعے ہندو ناری، ہندیوی اور پتی سیوا کے نام سے کھیلا گیا۔ یہ آغا حشر کے ہندی ڈراموں میں سے ایک اہم ڈراما ہے۔ اس ڈرامے میں ہندوستانی عورت کی پتی بھگتی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اور اسی کو ڈرامے کا اصل موضوع قرار دیا گیا ہے۔ اس ڈرامے کے دو قلمی نسخے آغا حشر کے ذخیرے سے مرتبین کو ملے۔ جس کی بنا پر اس ڈرامے کو مرتبین نے ترتیب دیا۔

'بھگیر تھ گنگا' یہ ڈراما 1920 میں لکھا گیا۔ اس ڈرامے میں ہندو دھرم اور قدیم ہندوستانی تہذیب کو موضوع بنایا گیا۔ اس میں راجا بھگیر تھ کی تپسیہ کا ذکر ہے جس کو آغا حشر کاشمیری نے بڑے دلنشین پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس ڈرامے کو ہندو ناظرین نے بہت پسند کیا۔ یہ آغا حشر کے مقبول ڈراموں میں سے

ایک ہے۔

چھٹویں جلد میں بھی چار ڈرامے ہیں:

(1) پراچین ایوم نوین بھارت

(2) سسنار چکر

(3) بھیشم پرتگیا

(4) آنکھ کا نشہ

'پراچین ایوم نوین بھارت' اس ڈرامے میں ہندوستان کی تاریخ کے تین ادوار کو دکھایا گیا ہے۔جس میں بدلتی اقدار اور تہذیبی وتمدنی بحران کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ ڈراما 1921 میں تصنیف کیا گیا۔مرتبین اس ڈراما کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''شرون کمار کا واحد مسودہ فل اسکیپ سائز کے کاغذ پر ہے اور بہت ہی اچھی حالت میں ہے۔مسودہ صاف اور خوشخط لکھا ہوا ہے۔اس ڈرامے کا دوسرا حصہ دستیاب نہیں ہوسکا۔تیسرے ڈراپ کے دو مسودے ملے ہیں۔ایک تو فل اسکیپ سائز کے کاغذ پر پہلے حصے کے تسلسل میں بالکل اسی کاتب کا لکھا ہوا ہے اور بہت اچھی حالت میں ہے۔اس کے پہلے صفحے پر (قدیم و جدید) ہندوستان،تیسرا ڈراپ،آج لکھا ہوا ہے۔دوسرا مسودہ مجد کاپی کی شکل میں ہے،جس کے پہلے صفحے پر سرخ روشنائی میں 1921 لکھا ہوا ہے۔مسودہ کو دیکھنے سے لگتا ہے کہ است تین الگ الگ کاتبوں نے مکمل کیا ہے۔لیکن اس میں کہیں بھی کسی کاتب کا نام درج نہیں ہے۔''27؎

اس ڈرامے میں آغا حشر کاشمیری نے کرداروں کے ذریعے سے لوگوں کو یہ بتایا ہے کہ آج ایسا زمانہ آ گیا ہے کہ ہم اپنی تہذیب اور تمدن کو بھول گئے ہیں۔جس کے سبب سماج نئی تہذیب سے متاثر ہو کر بے راہ رو ہو گیا ہے۔جس میں محبت اور بھائی چارگی کا فقدان ہے۔

'سنسار چکر' یہ ڈراما 1922 میں تصنیف کیا گیا۔ پہلا پیار کے نام سے بھی یہ ڈراما کھیلا گیا تھا۔اس

ڈرامے میں بے میل شادیوں کے نتائج کی طرف لوگوں کو متوجہ کرایا گیا ہے۔ڈرامے میں کم عمر لڑکی کی شادی معمر وکیل سے ہوجاتی ہے۔جس کی بنا پر دونوں کی زندگی اجیرن ہوجاتی ہے۔اس ڈراما کے تعلق سے مرتبین لکھتے ہیں:

''عشرت رحمانی کے مطابق اس کی سال تصنیف 1923 ہے۔دوسرے محققین نے بھی اسی طرح انداز قائم کر کے کوئی نہ کوئی تاریخ متعین کر دی ہے۔جو بہر حال صحیح نہیں ہے۔پیش نظر مسودے میں بھی اس کے زمانہ تخلیق سے متعلق کوئی اندراج موجود نہیں ہے۔لیکن آغا حشر کے ذخیرے سے دستیاب دستاویزات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ڈراما1922 میں لکھا گیا تھا۔''28ے

یہ آغا حشر کے ان ڈراموں میں سے ہے جس میں سماج کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا گیا ہے۔اس میں ڈراما نگار کامیاب بھی ہوئے ہیں۔جس کی بنا پر یہ ڈراما کئی بار اسٹیج کیا گیا۔

'بھیشم پرتگیا' یہ ڈراما 1923 میں میڈنس تھیٹرز لمیٹڈ کمپنی کے لیے آغا حشر کاشمیری نے لکھا تھا۔اس ڈرامے کی کہانی مہابھارت سے ماخوذ ہے۔یہ ڈراما آغا حشر کے مقبول ڈراموں میں شامل ہے۔اس ڈرامے پر فلم بھی بنی ہے۔مرتبین اس ڈرامے کے تعلق سے لکھتے ہیں:

'' آغا حشر کے ذخیرے سے اس ڈرامے کے تین قلمی مسودے دستیاب ہوئے ہیں۔پہلا مسودہ فل اسکیپ سائز کے کاغذ پر لکھا ہوا ہے۔یہ چار الگ الگ کاتبوں کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔لیکن کسی بھی کاتب کا نام یا تاریخ کتابت کہیں درج نہیں۔پہلے صفحے پر ڈراما کا نام بھیشم پرتگیا (بھیشم پتامہ) لکھا ہوا ہے۔مسودے میں جگہ جگہ پنسل سے اصلاح اور ترمیم و تنسیخ کی گئی ہے۔۔۔دوسرا مسودہ مجلد کاپی کی شکل میں ہے۔۔۔تیسرا مسودہ آغا جانی کا تحریر کردہ ہے۔اس کے سرورق پر ڈرامے کا نام بھیشم پرتگیا،مصنف آغا حشر کاشمیری،انڈین شیکسپئر مرحوم و مغفور مدظلہ لکھا ہے۔''29ے

آغا حشر کے ذخیرے سے جو تین مسودے دستیاب ہوئے ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ ڈراما آغا حشر کی تصنیف کردہ ہے۔جس میں انھوں نے مہابھارت کی کہانی کو دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔

'آنکھ کا نشہ' یہ ڈراما 1924 میں لکھا گیا تھا۔اس ڈرامے میں اصلاحی پہلو اجاگر ہے۔جس میں زمانے کے شراب و شباب کے شوقین لوگوں کی بے راہ روی اور بے سہارا عورتوں کی مجبوری اور بدحالی کی عکاسی موجود ہے۔اس ڈرامے میں سماجی اصلاح کی جو کوشش نظر آتی ہے وہ اہمیت کا حامل ہے۔جس کی بنا پر عوام نے اسے بے حد پسند بھی کیا۔مرتبین لکھتے ہیں:

> ''یہ ڈراما اکثر جگہوں پر ''جوانی کی بھول'' کے نام سے بھی کھیلا گیا تھا۔اس کے بارے میں محققین کے درمیان کسی قسم کا اختلاف رائے نہیں۔آغا حشر نے اسے جے ایف میڈن اینڈ کمپنی کے لیے لکھا تھا۔اور پہلی بار اسے کلکتہ کے اسٹیج پر پیش کیا گیا۔''30

اس ڈرامے کا ایک قلمی مسودہ اور دو مطبوعہ نسخے مرتبین کو دستیاب ہوئے۔جس سے مرتبین نے اس ڈرامے کو ترتیب دی۔یہ ڈراما آغا حشر کے ہندی ڈراموں میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔

ساتویں جلد میں تین ڈرامے ہیں:

(1) سیتا بن واس

(2) دھرمی بالک

(3) بھارتی بالک

(4) دل کی پیاس

'سیتا بن واس' یہ ڈراما مہاراجا چرکھاری کی فرمائش پر آغا حشر کاشمیری نے 1928 لکھا۔جس میں سیتا جی کے بنواس کے واقعات کا ذکر ہے۔اس کے سال تصنیف اور مقام تصنیف دونوں کے بارے میں محققین میں اختلاف ہے۔مرتبین لکھتے ہیں:

> ''اس ڈرامے کے سال تصنیف اور مقام تصنیف دونوں کے بارے میں محققین میں اتفاق رائے نہیں ہے لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ مہاراجا چرکھاری اری مردن سنگھ جو دیو کو یہ ڈراما بہت پسند تھا۔اور اسے اپنی اسٹیٹ میں اسٹیج کرنے کے لیے انھوں نے زر کثیر صرف کیا تھا۔''31

اس ڈرامے کی سن اشاعت 1928 اور 1929 لکھا جاتا ہے۔حالانکہ مرتبین نے اس ڈرامے کا سال تصنیف 1928 ہی مانا ہے۔

'دھرمی بالک' یہ ڈراما 1929 میں شائع ہوا اس میں مغربی تہذیب وتمدن کی اندھی پیروی کے سبب مختلف سماجی برائیوں کے پھیلنے کا ذکر ہے۔سماج کے مختلف طبقات میں پھیلی ہوئی بے راہ رویوں اور خرابیوں پر اس ڈرامے میں بے محابا طنز ہے۔یہ آغا حشر کا ایک بہترین ڈراما ہے۔اس ڈرامے میں آغا حشر نے سماج کے بہت ساری برائیوں کی طرف لوگوں کو مبذول کیا ہے۔جس میں جہیز جیسی لعنت شامل ہے۔اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہیں۔

'بھارتی بالک' یہ ڈراما (پورا نام بھارتی بالک عرف سماج کا شکار) یہ 1930 میں شائع ہوا۔اور اسٹیج بھی کیا گیا۔عوام نے اس ڈرامے کو بہت پسند کیا۔اس میں آغا حشر کاشمیری کی سیاسی سوجھ بوجھ اور سماجی شعور کی بہترین عکاسی ملتی ہے۔اس میں استعمال کیے گئے مختلف مکالموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آغا حشر کو غلام ہندوستان کی صورت حال پر گہری تشویش تھی۔

'دل کی پیاس' یہ ڈراما 1931 میں پارسی الفنسٹن ڈرامٹک کمپنی کے لیے تیار کیا گیا تھا اور اس کو آغا حشر کا آخری ڈراما بھی کہا جاتا ہے۔اس میں ہندوستانی تہذیب وثقافت کو موضوع بنایا گیا ہے۔اور اس ڈراما کے ذریعے سے یہ بتایا گیا ہے کہ لوگوں کو ہندوستانی تہذیب وتمدن کو اختیار کرنا چاہیے یورپی تہذیب کی اندھی تقلید سے بچنا چاہیے۔اس وقت یہ ڈراما نوجوان نسلوں کو بہت پسند آیا اور تواتر کے ساتھ اس کے متعدد شو بھی ہوئے تھے۔

آٹھویں جلد میں ان کی شاعری اور چند دستاویز کو رکھا گیا ہے۔جس کے عناوین اس طرح سے ہیں۔

1۔آغا حشر کے انتقال کے بعد

2۔قلمی چہرہ

3۔اخبارات ورسائل میں آغا حشر کاشمیری

4۔آغا حشر از عبدالقدوس برنگ

5۔کلام حشر پر ایک نظر

6۔غزلیں

7۔متفرق اشعار

8۔نوحہ

9۔نظم فارسی صدائے غیب

10۔تاریخ رحلت، ولایت علی

11۔ پیام حشر

12۔شکریہ یورپ

13۔موج زم زم

14۔کلیات حشرت کا دیباچہ

آغا حشر کاشمیری کے یہ ڈرامے جس کو یعقوب یاور اور آغا جمیل کاشمیری نے مرتب کیا ہے۔اور اس کی ترتیب میں انھوں نے براہ راست آغا حشر کاشمیری کے نجی ذخیرے سے استفادہ کیا ہے اور آغا حشر کاشمیری کا یہ واحد کلیات ہے جسے معتبر کہا جاسکتا ہے۔ یہ کلیات بہت ہی عمدہ انداز میں لکھی گئی ہے۔ ہر ڈرامے کے بعد ایک خالی صفحہ سے دوسرے ڈرامے کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہر جلد کا پیش لفظ ڈائرکٹر محمد حمید اللہ بٹ نے لکھا ہے اور دیباچہ مرتبین یعنی یعقوب یاور اور آغا جمیل کاشمیری نے لکھا ہے۔یعقوب یاور کے ترجمے اور ترتیب کی چمک ہندوستان سے باہر بیرونی ملک میں بھی اہمیت کی حامل ہے۔ پاکستان سے ان کے کئی تراجم اور تخلیق وتنقید کی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔اور پاکستانی عوام میں کافی مقبول بھی ہوئی ہیں۔’ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری‘ کے آخری سرے پر ناشر لکھتا ہے:

''بھارت کے مردم خیز خطے فتح پور سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر یعقوب یاور دنیائے اردو کا ایک مشہور ومعروف نام ہے۔ان کا شمار ایسے ادیبوں میں ہوتا ہے ۔۔۔ وہ شاعر ہیں اور انکے دوشعری مجموعے ''الف'' اور ''قلم گوید'' منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ناقد اور محقق کی حیثیت سے وہ نصف درجن سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں ۔۔۔ ناول نگار کی حیثیت سے ان کے تین ناول دل من، عزازیل اور جہاد لوگوں سے خراج تحسین کر چکے ہیں۔ مترجم کی حیثیت سے انھوں نے اب تک انگریزی اور جرمن زبانوں کے ایک درجن سے زائد ناولوں کے اور نصف درجن دیگر علوم سے متعلق کتب کے تراجم کیے ہیں۔انھوں نے آٹھ جلدوں میں 'کلیات' آغا حشر کاشمیری کی ترتیب کا کام بھی انجام دیا ہے۔جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ترتیب میں انھوں نے براہ راست آغا حشر کاشمیری کے نجی ذخیرے سے استفادہ کیا ہے اور آغا حشر کاشمیری کا یہ واحد کلیات ہے جسے معتبر کہا جاسکتا ہے۔ یہ جلدیں بھارت میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ، حکومت ہند دہلی کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہیں۔''32

اس طرح سے یعقوب یاور کی ادبی شخصیت ملک اور بیرون ملک میں مقبول ہے۔ یہ اردو ادب کے ان چند ادیبوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی ذہانت، محنت اور صلاحیت کے بل بوتے دوسروں کو اپنا ہم خیال بنایا۔انھوں نے اپنی قلمی کوششوں سے دنیائے ادب میں اپنا ایک الگ مقام بنایا جسے ملک و بیرون ملک میں اردو داں طبقہ ادب واحترام سے دیکھتا ہے۔

*****

حوالہ جات

1۔فن ترجمہ نگاری،ظ۔انصاری،ص:159

2۔ترجمہ،سدھارتھ یعقوب یاور،،ص:2

3۔ترجمہ،ڈاکٹر ژواگو،یعقوب یاور،ص:10

4۔ترجمہ،پاپیلاں،یعقوب یاور،ص:9

5۔تاثر،دل من،پشت صفحہ مشرف عالم ذوقی

6۔ترجمہ،مغموم صنوبر،یعقوب یاور،ص:3

7۔گارڈ فادر،ماریو پوژو،،ص:4

8۔ترجمہ،گارڈ فادر،یعقوب یاور،ص:11

9۔ایضاً،ص:12

10۔ترجمہ،رقص ازل،یعقوب یاور،ص:8

11۔اردو میں ترجمہ نگاری،مشتاق احمد قادری،ص:177

12۔مشتاق احمد قادری،اردو میں ترجمہ نگاری،ص:177

13۔کلیات آغا حشر کاشمیری (جلد1)،مرتبین،یعقوب یاور،آغا جمیل حشر کاشمیری،ص:30

14۔ایضاً،ص:103

15۔ایضاً،ص:201

16۔ایضاً،ص:309

17۔ایضاً،(جلد2)،ص:119

18۔ایضاً،ص:239

19۔ایضاً،(جلد3)ص:23

20۔ایضاً،ص:151

21۔ایضاً،ص:293

22۔ایضاً،(جلد4)ص:24

23۔ایضاً،ص:121

24۔ایضاً،ص:248

25۔ایضاً،(جلد5)ص:23

26۔ایضاً،ص:119

27۔آغا حشر کاشمیری، یعقوب یاور،ص:83

28۔ایضاً،ص:84

29۔کلیات آغا حشر کاشمیری (جلد6)، مرتبین یعقوب یاور، آغا جمیل حشر کاشمیری،ص:245

30۔ایضاً،ص:325

31۔آغا حشر کاشمیری، یعقوب یاور،ص:86

32۔ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری، یعقوب یاور،ص:448

ماحصل

یعقوب یاور ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں ۔وہ عہد حاضر کے ناول نگاروں میں انفرادیت کا درجہ رکھتے ہیں ۔ناول نگاری میں ان کی انفرادیت کی ابتداء ان کے پہلے ناول 'دل من' سے ہی شروع ہوجاتی ہے۔انھوں نے سب سے پرانی تہذیب وتمدن موہن جوداڑو کی تہذیب پر 1998 کو ناول دل من لکھا جو اپنے موضوع کے اعتبار سے اردو ناول نگاری میں مختلف اور منفرد ہے۔موضوع کی وجہ سے ادبی حلقوں میں اس ناول کو کافی سراہا گیا۔یہ اردو کا پہلا ناول ہے جس میں سندھو گھاٹی کی تہذیب کو موضوع بنایا گیا ہے۔اردو ادب کے فروغ میں جن ادباء وشعراء نے کارہائے نمایاں انجام دیا ہے ان میں ایک نام یعقوب یاور کا بھی ہے جو اردو کے بہترین ناول نگار اچھے شاعر، محقق، نقاد، مترجم، صحافی، مرتب اور ایک اچھے استاد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں ۔ان کی چار درجن تخلیقی وتنقیدی اور تراجمہ کی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں ۔ملک اور بیرون ملک میں یعقوب یاور اردو ادب کی نمائندگی بھی کرتے ہیں ۔

عصر حاضر میں جن ناول نگاروں نے اپنا نام اردو ناول نگاری میں مستحکم کیا ہے اس میں الیاس احمد گدی، پیغام آفاقی، جوگندر پال، اقبال مجید، سید محمد اشرف، شموئل احمد، حسین الحق، مشرف عالم ذوقی، عبد الصمد، ساجدہ زیدی، غضنفر وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔ان میں ایک نام یعقوب یاور کا بھی ہے لیکن ان کے ناولوں کا موضوع معاصرین ناول نگاروں کے ناولوں کے موضوع سے الگ ہیں ۔ان کے معاصر کے ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں جس چیز کو موضوع بنایا ہے اس میں اکثر اقلیتوں کے مسائل، عورتوں کے جنسی استحصال،

فرقہ وارانہ فساد، غریبوں، مزدوروں کا استحصال، سماج میں پھیلی ہوئی ظلم و جبر وغیرہ ہیں۔لیکن یعقوب یاور کا ناول 'عزازیل' ہو یا ان کا پہلا ناول ''دل من''۔ان دونوں ناولوں میں یعقوب یاور نے تاریخ و مذہبی کتابوں سے مدد لے کر ایسی کہانی بنائی ہے جو اردو میں اور ناول نگاروں کے یہاں بہت ہی کم ملتا ہے۔ان کا تیسرا ناول 'جہاد' ہے جو ان کے معاصرین ناول نگاروں کے ناولوں سے ملتا جلتا ہے۔لیکن صرف موضوع کی یکسانیت کی حد تک ورنہ واقعات جو اس ناول میں ہے وہ اردو کے کسی اور ناول میں نہیں دکھتا ہے۔

اردو ادب میں 1869ء سے لے کر اب تک بے شمار ناول لکھے گئے ہیں۔ان میں اصلاحی، تاریخی، سماجی، سیاسی، تہذیبی، مذہبی وغیرہ ناول شامل ہیں۔اردو میں تاریخی ناول نگاری مغرب کے وسیلے سے آئی۔عبدالحلیم شرر سے لے کر عصمت چغتائی اور قاضی عبدالستار تک اردو میں بہت سارے تاریخی ناول لکھے گئے اور ان کو کامیابی اور مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔تاریخی ناول نگاروں میں یعقوب یاور کا نام بھی شامل ہے۔انھوں نے اب تک پانچ ناول لکھے ہیں جس میں ''دل من'' ایک ایسا ناول ہے جس میں یعقوب یاور نے ہزار سال قبل مسیح سے پہلے کی تہذیب و تمدن کو پیش کیا ہے۔اس کے اندر موہن جودوڑو، ہڑپا وادی سندھ کی تہذیب کو بیان کیا گیا ہے۔اور اس موضوع پر اردو میں اپنی انفرادیت کو قائم کیا ہے۔یہ ناول موجودہ دور کی تہذیب و ثقافت سے تو دور ہے لیکن دور حاضر کے لیے سبق آموز ہے۔موہن جودڑو جیسی پرانی تہذیب و ثقافت کو اس ناول میں وحدت تاثر کے ساتھ ناول نگار نے بڑی ہی چابکدستی سے بیان کیا ہے۔اس ناول کا اختتام اور آغاز ایک ایسی کہانی سے ہوتا ہے جس میں مرکزی کردار دیوانئ کو دو قتل کے جرم میں دل من شہر سے باہر پھینکا جاتا ہے۔پہلا قتل اس نے اپنے بدلے کے لیے کیا تھا حالانکہ دوسرے قتل کے جرم میں جب اسے دل من شہر سے باہر پھینکا جاتا ہے تو وہ اس بار سازش کا شکار ہوتی ہے اور ایک نا کردہ جرم کی سزا پاتی ہے۔دل من شہر میں عورتوں کے ساتھ لوگوں کا کیسا سلوک تھا دیوانئ اس کی ترجمانی کرتی ہے ساتھ ہی اس ناول میں دل من شہر کے سماجی و معاشرتی بے راہ روی اور نا انصافی کو بھی پیش کیا گیا ہے۔یہ ناول تانیثیت اور قدیم تہذیب و تمدن کے اردگرد گھومتا ہوا نظر آتا ہے۔نظریاتی سطح پر یہ ایک مابعد جدید ناول ہے جس کے اندر ماضی

کے اقدار کے ساتھ لامرکزیت اورمہابیانیہ کی تردید ملتی ہے۔اس ناول میں جو کردار ہیں ان کو مصنف نے کسی نظریے کا علمبردار نہیں بنایا ہے۔ناول کا کردار کشال ہو یا سرال ان کے اندر خود مختاری کی صفت پنہاں ہے جس کی بناپر یہ کردار مختلف الجہات افعال واعمال سے رچے بسے ہیں۔ناول کی مرکزی کردار دیوانئ جس کے تانیثی مسائل کو ناول میں پیش کیا گیا ہے یہ بھی خصوصیت کا حامل ہے۔اس لحاظ سے بھی یہ ناول مابعد جدید کے زمرے میں آتا ہے کیوں کہ مابعد جدید رجحان میں تانیثی مسائل کو بھی اہمیت حاصل ہے۔جس کو سماج حاشیائی چیز سمجھتا تھا مابعد جدید رجحان میں اس کو فوقیت دی ہے۔یہ ساری چیزیں اس ناول میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

ناول عزازیل کے اندر یعقوب یاور نے ان واقعات وحادثات کو ناول کے ڈھانچے میں پرونے کی کوشش کی ہے جو واقعات وحادثات انسانی دنیا سے پہلے کے ہیں۔اس موضوع میں اگر مواد کی تلاش کی جائے تو تحقیق شدہ بہت کم مواد دستیاب ہے۔اور جو دستیاب بھی ہے اسے ماننا یا نہ ماننا یہ انسان کی اپنی ذمہ داری ہے۔کیونکہ قرآن سے پہلے جتنی آسمانی کتاب ہیں اس میں تحریف ہے۔اس میں کچھ اس زمانے کے لوگوں کی اپنی باتیں ہیں اور کچھ اللہ کی جانب سے ہے۔مذہبی عقائد کے مطابق اگر دیکھا جائے تو عزازیل کے بارے میں معلومات انگریزی مصنف ڈینکن (Erik Von Deniken) کی کتاب میں موجود ہے۔اس نے دنیا کی تحقیقات میں اپنی پوری عمر صرف کردی۔اس کی کتاب میں عزازیل کے بارے میں کافی معلومات دستیاب ہیں۔یعقوب یاور نے اس کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔عزازیل پر لکھنے والوں پر اگر نگاہ ڈالیں تو فوراً ہماری توجہ ملٹن اور اقبال کی طرف بھی جاتی ہے۔جنھوں نے اس منفی کردار کے مثبت اور منفی رویے کو پیش کیا ہے۔

ناول ''عزازیل'' جو ابلیس کی سوانح پر مبنی ہے جس میں ناول نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسان ہو یا کوئی بھی مخلوق اگر اس کے اندر علم ہے اور اس علم کی بنا پر وہ اخلاقیات کو ترک کر دیتا ہے تو اس کا انجام تباہی کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتا، چاہے وہ علم کے کسی بھی درجے کو پہنچ جائے۔آخر میں اس کو مایوسی اور

ناکامی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ناول ''عزازیل'' کا یہی مرکزی موضوع ہے کہ اگر کسی بھی مخلوق کو اللہ نے علم دیا ہے اور علم میں وہ باکمال ہے لیکن اگر اس کے اندر حرص ولالچ گھمنڈ آجائے تو پھر اس کا انجام تباہی ہوتا ہے۔ناول میں اہرمن (ابلیس) نے الگ الگ زمانے میں سات بار جنم لیا۔کبھی غراموت کے نام سے کبھی شرلات،کبھی تلویث کبھی رون کبھی شرموت اور آخر میں ساتویں بار عزازیل کی حیثیت سے۔اس کے علاوہ اور دوسرے بھی مسائل وواقعات ہیں جو ناول کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں جیسے عزازیل کا اللہ کی کثرت سے عبادت کرنا،یا پھر رامن،شرلاموت،غراموت،تلویث،رون،شرموت کے وقت شر پھیلانے کے افعال وغیرہ۔اور اہرمن (ابلیس) کے ماں اور باپ کے حالات کا ذکر بھی ناول میں کیا گیا ہے۔یہ ناول ابلیس کی سوانح کے پیچھے عہد حاضر کے سماجی واخلاقی منظرنامے کو پیش کرتا ہے۔جس میں آج کا انسان خود کو خدا مان بیٹھا ہے۔اسے اپنے سوا سب حقیر معلوم ہوتے ہیں۔غرور وگھمنڈ رشتے کی پامالی،سماج کا حصہ بن چکا ہے۔اشارتاً اس ناول میں ان چیزوں کو بیان کیا گیا ہے۔

ناول 'جہاد' گجرات میں مسلمانوں کے قتل عام کے بعد ابھرنے والے واقعات وحادثات پر منحصر ہے۔سن 2000 میں گودھرا کانڈ واقع ہوا جس میں کہا جاتا ہے کہ ٹرین سابرمتی ایکسپریس کو کچھ فسادیوں نے جلا دیا۔جس کے کچھ ڈبوں میں سادھو سفر کر رہے تھے۔اور کہا جاتا ہے کہ یہ گھنونہ کام مسلمانوں نے کیا تھا۔لیکن یہ تحقیق کا مسئلہ ہے کہ آگ زنی کس نے کی تھی۔اس کا کوئی پختہ ثبوت نہ تو سرکاری محکمہ کے پاس ہے اور نہ ہی عام لوگوں کے پاس ہے۔گجرات میں مسلمانوں کے قتل عام کا یہی پس منظر ہے۔جس میں ہزار سے زیادہ مسلمانوں کو مارا گیا اور عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔مکانوں،گھروں کو جلا دیا گیا۔اس ناول کو لکھنے کا پس منظر بھی یہی ہے۔عصرِ حاضر میں فرقہ وارانہ فساد،دہشت گردی،تعصب پرستی،منافرت عام ہو چکی ہے اور مسلمانوں کے بارے میں ملک اور بیرون ملک میں بہت ساری غلط فہمیاں بھی پھیل رہی ہیں۔جس سے مسلمانوں کی اصل شبیہ غائب ہو رہی ہے۔جس میں میڈیا اور اسلام مخالف رہنماؤں حکمرانوں سیاست دانوں اور مذہبی پیشواؤں کا ہاتھ ہے۔یعقوب یاور نے اس ناول میں ان ہی تمام چیزوں کو موضوع بنایا

ہے۔ یہ ناول موجودہ دور میں مسلمانوں کی جو حالت ہے اس کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ ہندوستان میں مذہبی تصادمات کے ذریعے جو منافرت وفساد پھیل رہے ہیں جس سے نہ صرف ملک بلکہ پوری انسانیت کو خطرہ ہے۔ ان چیزوں کا بیان ناول نگار نے بڑی جرات مندی اور سیلقہ مندی سے کیا ہے۔ مسلمانوں میں فرقہ بندی اور مسلکی اختلاف کی بنا پر جو باہمی نا اتفاقی اور منافرت ہے اس سے مسلمان پوری دنیا میں کئی زاویوں سے ذہنی انتشار اور اذیت کیے شکار ہیں۔ اس ناول کے واقعات و کردار میں یہ چیزیں پوری طرح مضمر ہیں۔ مسلمانوں کی کمزوریوں کے ساتھ ان کا حل اس ناول میں تلاشنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ مسلمانوں کو مسلکی اختلاف سے اوپر اٹھ کر سوچنا ہوگا اور اتحاد و اتفاق قائم کرنا ہوگا تبھی مسلمان اپنے حق کے لیے بہتر طریقے سے آواز اٹھا سکیں گے اور دنیا میں اپنے استحکام کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے حق کی لڑائی لڑ سکیں گے۔ اپنے خلاف غیروں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کر پائیں گے۔ اس ناول میں یہ بات واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ موجودہ دور میں مسلمانوں سے متعلق غلط فہمیوں کے ساتھ اسلامی اصطلاحات کو بھی بدنام کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ان اصطلاحوں میں جہاد پر زیادہ زور دیا جارہا ہے۔ جہاد جو حق و باطل اور اچھائی برائی کی جنگ کو کہا جاتا تھا اسے دہشت گردی کا متبادل بنا دیا گیا ہے۔ اس میں میڈیا فرقہ پرست، سیاسی حکمرانوں کا زیادہ ہاتھ ہے۔ ناول جہاد ایک ایسا ناول ہے جس میں حقیقت پسندی ہے اور عصری مسائل کا بیان اس طرح سے کیا گیا ہے کہ اس میں کسی کی طرفداری اور جانبداریت نہیں ہے۔ غیر جانبدار ہو کر ناول نگار نے عصرِ حاضر کے المیے کو ناول کے فن میں پرو یا ہے۔ جس میں مسلمانوں کے مسائل کے ساتھ ملک ہندوستان میں ان پر جو مظالم ڈھائے جاتے ہیں اس کا بیان بڑی ہنرمندی سے کیا گیا ہے۔ اس ناول میں ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے بحث کیا گیا ہے۔ اور ہندواس ناول میں ضمناً موجود ہیں۔

یعقوب یاور کے ناولوں کی فنی خوبیاں بھی ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتیں ہیں۔ ان کے ناولوں کا پلاٹ مربوط اور منظّم ہے۔ قصوں میں ربط و تسلسل برقرار ہے واقعات ایک دوسرے سے گتھے ہوئے ہیں۔

یعقوب یاور کے تینوں ناولوں میں اکثر بیانیہ طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے۔لیکن ناول میں کردار نگاری، مکالمہ نگاری،منظر نگاری، بدرجہ اتم موجود ہے۔یعقوب یاور کے ناولوں کے کردار ایسے ہیں جو واقعات و ماحول کے مناسب ہیں۔اوران کے ناولوں میں کرداروں کے ذریعے سے جو مکالمے پیش کیے گئے ہیں وہ مکالمے تکلف اور تصنع سے پاک ہیں۔یعقوب یاور کے تینوں ناولوں کے مکالمے الگ الگ ہیں۔معاشرے کے جن طبقات سے ناول میں کردار منتخب کیے گئے ہیں ان طبقات کی زبان کو ناول نگار نے مکالمے کے طور پر لکھا ہے۔انھوں نے اپنے ناولوں میں مقامات و ماحول کا ذکر دو طرح سے کیا ہے۔ایک یہ کہ سماج کا نقشہ بازاروں،سڑکوں،گلیوں،مکانوں وغیرہ سے پیش کیا ہے۔دوسرا یہ کہ انھوں نے مناظر قدرت کو پیش کیا ہے جن میں سمندر،جنگل، پہاڑ،دریا،سورج، چاند،موسم وغیرہ کی منظر کشی کی ہے۔یعقوب یاور نے اپنے ناولوں کی ابتداء منظر نگاری سے کی ہے جس سے ناولوں میں دلکشی اوراس کے تاثیر میں اضافہ ہوا ہے۔ساتھ ہی پلاٹ کے ارتقاء و کردار کی تعمیر و توجیہہ میں یہ منظر نگاری معاون و مددگار ثابت ہوئی ہے۔یعقوب یاور نے جگہ جگہ اپنے ناولوں میں کردار کے ذریعے ان کے جذبات کو پیش کیا ہے۔جس سے کردار کے رویے کا پتا چلتا ہے۔ساتھ ہی ناول کے پلاٹ میں تسلسل اور ربط پیدا ہوتا ہے۔ناول نگار نے سنجیدگی کے ساتھ صحیح موقعوں پر کرداروں کے ذریعے ان کے جذبات کو پیش کیا ہے۔یعقوب یاور نے اپنے ناولوں میں کردار کی مناسبت ہی سے زبان کا انتخاب کیا ہے۔ناول دل من کے کردار کا تعلق سندھو گھاٹی سے ہے۔جس کا زمانہ موہن جودڑو اور ہڑپا کا ہے۔اس ناول میں کرداروں کے ذریعے سے جو زبان عمل میں لائی گئی ہے وہ ہندی اور سنسکرت آمیز ہے۔یہ زبان ان کرداروں کی مناسبت سے ہے۔ناول عزازیل کا زبان و بیان سادہ اور سلیس کے ساتھ دلچسپ بھی ہے۔اس میں ایسی زبان کرداروں کے مکالمے اور بیانیہ کے طور پر لکھا گیا ہے جس میں عمدگی اور جامعیت ہے۔ناول ’’جہاد‘‘ میں یعقوب یاور کی جو طرز تحریر ہے وہ دو طرح کی ہے ایک ان کا بیانیہ دوسرا کرداروں کا مکالمہ اسی اسلوب میں پورا ناول لکھا گیا ہے۔کردارون کے مناسبت سے مکالموں کا انتخاب کیا گیا ہے جس میں اردو زبان کے ساتھ علاقائی بولی شامل ہے۔یعقوب یاور کے بیانیہ میں صاف

ستھری خالص اردو زبان مستعمل ہے۔

ان کے ناولوں کے تکنیک کی بات کی جائے تو ان کے ناولوں کا فارم بیانیہ ہے۔ جس میں کمی کم نظر آتی ہے جس کی کوئی چول ڈھیلی نہیں ہے واقعات سے واقعات ابھرتے چلے جاتے ہیں۔ ناول عزازیل کا بیانیہ ان کی مشہور اور مقبول ناول دل من سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔ دل من کے بیانیہ میں اگر کچھ کمی برائے نام کی محسوس ہو رہی ہے تو وہ ہندی اور سنسکرت آمیز الفاظ کی ہے۔ کیوں کہ اردو زبان کا قاری ناول کو ایک سر میں پڑھ رہا ہوتا ہے اور اس کے سامنے اچانک ہندی کے بھاری بھرکم الفاظ آجاتے ہیں۔ تو اس کا ذہنی تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ کیوں کہ اردو رسم الخط میں سنسکرت آمیز الفاظ کو پڑھنے میں عام قاری کو کچھ دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ویسے یہ ناول موضوع اور کہانی کے اعتبار سے اردو کے ممتاز ناولوں میں سے ایک ہے اس کی شہرت اور مقبولیت اردو ناول نگاری میں مستحکم ہے۔ یعقوب یاور کی ناول نگاری پر دال بھی ہے۔ اردو ناول نگاری میں موضوع کے اعتبار سے انفرادیت کا متحمل بھی ہے اس موضوع پر ابھی تک کوئی مستحکم ناول نہیں لکھا گیا ہے۔ سوائے پاکستان کے مستنصر حسین تاڑ کے ناول ''بہاؤ'' ان کے اس ناول میں سندھ کی مختصراً تہذیب و ثقافت کا بیان ہے۔ اس ناول میں تاڑ نے قدیم دریا سرسوتی کو موضوع بنایا ہے۔ ساتھ ہے اس ناول کا اصل موضوع یہ ہے کہ دنیا سے ساری چیزیں مفقود ہوتی جا رہی ہیں۔ لیکن انسان کی ذات ایسی ہے جو برقرار ہے۔ اس لیے اس ناول میں سندھ کی تہذیب سرسری طور پر ہے اور دل من کا خاص موضوع تانیثیت کے حوالے سے سندھ کی تہذیب و ثقافت ہے۔

یعقوب یاور کے تین شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''الف'' دوسرا ''قلم گوید'' تیسرا ''بارزیاں'' ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں نئی تہذیب سے شکایت ہے اور ان کے دل کے اندر قوم و ملت کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ قوم و سماج کی بد حالی اور بد تہذیبی سے وہ بےچین سے لگتے ہیں۔ انھوں نے ان خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے جہاں دوسرے اصناف کا سہارا لیا ہے وہیں شاعری کے ذریعے بھی ان چیزوں کو پیش کرنے کی کوشش کی

ہے۔یعقوب یاور نے زمانے کی تبدیلی اوراس سے نمودار ہونے والی برائیوں کواپنی شاعری کے ذریعے لوگوں تک پہنچانے کا کام کیا ہےاورمیڈیااورمشینی دورکی منفی اثرات کواپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ساتھ ہی تہذیب وتمدن کی گراوٹ،انسانی ہمدردی کازوال اورحکومت کا مظلوموں کے ساتھ ناانصافی اورظلم وجبر کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔عصمت دری، رشوت خوری، بےچینی،تنہائی،عصر حاضر کی ان تمام افعال و اعمال کوشاعری کے ذریعے سے صفحۂ قرطاس پرلایا ہے۔یعقوب یاورکی شاعری ادبیت سے بھی جڑی ہوئی ہےاور کچھ اکھڑی اکھڑی سی بھی ہے۔یعقوب یاوران مخلص شاعروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے غزل کےفن اور جمالیات کا احترام کیا ہےاورسماج کی باتوں کوشاعری کی فنیت کو پورا کرتے ہوئے شیریں الفاظ کےساتھ لوگوں کے سامنے لایا ہے۔

ادب اپنے دوراورحالات کی ایجاد ہے۔خوشحالی یاغم،سیاسی پیچ وخم،انسانی،افراتفری حالات کے زیراثر نئے اوراجنبی شیڈس کے درمیان ادبی تخلیقات وجود میں آتے ہیں اورسماج وحالات کے پیٹ ہی سے جنم لیتے ہیں۔زمانے کے ہرعشرہ میں کچھ نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔1980 اور 1990 کے درمیان جن ادیبوں اورفنکاروں نے اپنی ادبی تخلیقات کومنظرعام پرلایااس وقت ان کے سامنے جواہم مسئلے تھےایک توبےروزگاری اور بےروزگاری کے سبب ہونے والے جرائم، دوئم بابری مسجد کا تنازعہ اورفسادیوں کا منظر، وقت کی تیزرفتاری مشینی زندگی،کم وقت میں سب کچھ حاصل کرنے کی آرزو،وانسانیت ہمدردی کا فقدان، مدد ومروت سب کا اختتام۔مندرجہ بالا چیزوں کواس دہائی کےشاعروں نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔اپنے ساتھی شاعروں کی طرح یعقوب یاور نے بھی اپنی شاعری میں ان چیزوں کوجگہ دی ہے۔مجموعی طور پریعقوب یاورکی شاعری کےموضوعات کی بات کی جائے توان کی شاعری میں موضوعات اکثر یکساں ہیں بدلتے سماج میں رونمااخلاقی قدروں کی گراوٹ،ظلم وستم،تنہائی، نئے زمانے کےمشینی وآلاتی ترقی کےسبب بےروزگاری وغیرہ ہیں۔جن سے لوگوں پر برااثر پڑا ہے۔انسان انسان کوبھول گیا ہے رشتے پامال ہوگئے ہیں نوجوان اپنے ماضی اوراسلاف کوبھول گئے ہیں۔ان سب پریعقوب یاور کےشکوے وشکایت ہیں ساتھ ہی ان کا

غصہ بھی ہے یہی سب یعقوب یاور کی شاعری کے موضوع ومسائل ہیں جس کوانھوں نے کما حقہ شاعری کے قالب میں ڈھالا ہے۔اوراس میں یہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ساتھ ہی ان کی شاعری میں تغزل۔جس میں غزل کے لوازمات کے ساتھ عشق و عاشقی کی روداد پنہاں ہوتی ہے موجود ہے اور معاملہ بندی جس میں نجی واقعات کا بیان ہوتا ہے۔اردوادب میں اکثر شعراء کے یہاں معاملہ بندی کے نام پر عریاں مضامین پائے جاتے ہیں۔یعقوب یاور کی شاعری میں بھی اس طرح کی چیزیں موجود ہیں۔ساتھ ہی عشق مجازی اور عشق حقیقی کے رمزات سے ان کی شاعری پیوست ہے۔

موضوعاتی سطح پر ان کے کچھ اشعار میں شعریت کی کمی کا احساس ہوا ہے۔کہیں کہیں ان کے شعر کا پہلا مصرعہ بہت دلکش اور خوبصورت ہے لیکن دوسرہ مصرعہ پھیکا پڑ جاتا ہے۔

خوشی کی میزبانی کر کبھی کھو کر کبھی پا کر
کبھی مردہ تمناؤں سے مایوسی کا سودا کر

مندرجہ بالا شعر میں پہلا مصرعہ جاذب نظر ہے خوشی کی میزبانی کھو کر یا پا کر لیکن دوسرے مصرعے میں کمی کچھ اس طرح سے دکھ رہی ہے۔کہ 'مردہ تمنا' بھی ہے اوراس کا سودا بھی مایوسی سے کرنا کچھ حد تک نقص کی طرف اشارہ کرتا ہے۔لیکن شاعر کا الگ اپنا خیال ہوگا مایوس اور مردہ دونوں کو یکجا کر کے تاکید کا معنی پیدا کرنا ہوگا۔ان کے مجموعوں کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوہوتا ہے کہ یعقوب یاور ایک اچھے شاعر ہیں۔

شاعری کے لیے موضوع کا اہم ہونا جس طرح ضروری ہے ویسے ہی شاعری کے لیے فن بھی ضروری ہے۔کیونکہ فن شاعری کی بنیاد ہوتی ہے۔اسی پر شاعری کو پرکھا اور جانچا جاتا ہے اسی کے ذریعے سے شاعری میں دلکشی اور نکھار پیدا ہوتا ہے۔یعقوب یاور نے اپنی شاعری میں عصری مسائل کے ساتھ مختلف النوع موضوعات کو رکھا ہے۔اوران موضوعات کو شاعری کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے شاعری کے فنی لوازمات کو بھی بخوبی برتا ہے۔ان کی شاعری میں فن کی خوبیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری کو نئے پرانے تجربات سے منعکس کیا ہے جس میں دلکشی اور رعنائی کے ساتھ تاثیر موجود ہے۔اوراس میں خیال آفرینی اور معنی آفرینی کے ساتھ جدت طرازی، تخیل پردازی بھی ہے۔ان کے کلام میں اکثر چیزوں

کو واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔لیکن اشارات و کنایات کے ذریعے سے بھی واقعات و حادثات کو عمدگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔جس سے ان کی شاعری میں دلکشی اور خوبصورتی پیدا ہوئی ہے۔فصاحت و بلاغت ان کی شاعری میں پنہاں ہے۔ساتھ ہی پیکر تراشی اور منظر کشی بھی ان کی شاعری میں موجود ہے۔جس سے ان کے کلام تاثیر پیدا ہوتی ہے۔علم بیان اور علم بدیع کی اصطلاحیں بھی ان کی شاعری میں ملتی ہیں جس سے ان کی شاعری کے حسن میں دوبالگی آتی ہے۔

یعقوب یاور نے شاعری کے فنی لوازمات کو اپنی شاعری میں بخوبی برتا ہے چاہے وہ علم بیان ہو جس میں تشبیہ و استعارہ وغیرہ آتے ہیں اس کا استعمال انھوں نے اشعار میں سلیقے سے کیا ہے اس سے ان کی شاعری میں شگفتگی آئی ہے اشعار دلچسپ اور معنی خیز ہوئے ہیں ساتھ ہی علم بدیع کے صنعتوں کا استعمال بھی ان کی شاعری میں ہوا ہے۔اس میں تکرار، تضاد، مناسبت لفظی، تلمیح وغیرہ ہیں۔یعقوب یاور نے پورے ہوش مندی اور خوش اسلوبی سے ان اصطلاحات کا استعمال اپنی شاعری میں کیا ہے۔غرض کہ یعقوب یاور کی شاعری فن کے اعتبار سے بھی کامیاب نظر آتی ہے۔

تنقید و تحقیق کے میدان میں یعقوب یاور کی نو کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ان میں سات کتابیں ایسی ہیں جو ان کی تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔اور ایک ان کا پی ایچ۔ڈی کا مقالہ ''ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری'' جو کتابی شکل میں منظر عام پر آ چکا ہے۔یعقوب یاور کی تنقیدی مضامین اکثر شخصیات پر اور ان کے فن پر ہے۔جن شخصیات کو انھوں نے اپنی تنقید کا حصہ بنایا ہے ان میں غالبؔ، سرسید، فیضؔ، مجروحؔ، منٹوؔ، آغا حشر کاشمیری وغیرہ ہیں اور بھوپال سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں پر ان کے تنقیدی مضامین زیادہ ہیں جن میں اختر سعید، اختر وامق، شاہد اختر، محمد علی تاج بھوپالی وغیرہ ہیں اور ایک کتاب آغا حشر کاشمیری شخصیت اور فن ہے جس میں انھوں نے آغا حشر کی ادبی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

یعقوب یاور کا تنقیدی نظریہ یہ ہے کہ وہ کسی تنقیدی دبستان اور مرکزی نظریے کے متحمل نہیں ہیں انھوں نے جن جن شخصیات پر تنقیدی کی ہے کسی خاص نظریے کے تحت ان کے فن کو نہیں پرکھا ہے بلکہ فن کے

لوازمات سے ان شخصیات کی تحریروں کا جائزہ لیا ہے اوران کی قدر متعین کی ہے۔یعقوب یاور لکھتے ہیں:

''اگرفن کارکواپنی زندگی میں شہرت اور مقبولیت حاصل ہوتی ہے تو اس کی وجہ اس کا کلام ہوتا ہے جو براہ راست قاری یا سامع تک پہنچتا ہے لیکن ہمارے زمانے کا معاملہ کچھ دوسرا ہے جیسے جیسے قارئین اور سامعین کا دائرہ سمٹتا جارہا ہے ویسے ویسے نقادوں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے۔''

یعقوب یاور تخلیق کار کی حیثیت اوران کے قدر کی تعین فن کی بناپر کرتے ہیں اوران کا ماننا ہے کہ کسی بھی فن کارکافن قاری اور سامع کو اچھا لگنا چاہیے جس کی بناپر تخلیق کار کے تخلیقات کی وقعت واہمیت ومقبولیت خاص وعام میں زیادہ ہوتی ہے اور وہ ادیب اپنے فکروفن کے ذریعے ادب میں ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔قاری کے علاوہ کسی نقاد کے ذریعے جب ادیب کی قدر متعین کی جات ہے تو اس میں ترسیل کچھ حد تک مفقود ہوتا ہے اس لیے تخلیقات ایسی ہونی چاہیے کہ قاری بذات خود مصنف کے کلام سے مستفید ہو اسے کسی توسط کی ضرورت نہ پڑے۔یعقوب یاور تخلیق اور تنقید کی بحث میں تخلیق کو اولیت دیتے ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ تخلیق تنقید سے اونچے کی چیز ہے۔شاعری کی تنقید میں یعقوب یاور کا نظریہ تنقید یہ ہے کہ وہ کسی کے کلام کو دو زاویے سے دیکھتے ہیں پہلا شاعر کو فکر وخیال کی نوعیت کا پتا لگانا،اور دوسرا موضوع کے بیان میں شاعر کس طرح کا اسلوب اختیار کرتا ہے۔انھیں دونوں زاویے سے یعقوب یاور نے شعراء کے کلام کو پرکھا اور جانچا ہے۔یعقوب یاور موضوع اور فن دونوں کو شاعری میں اہمیت دیتے ہیں لیکن فن کی طرف ان کی رغبت زیادہ ہے

یعقوب یاور نے ترجمے میں جو مقام بنایا ہے اسے اردو دنیا بہت ادب واحترام کی نظر سے دیکھتی ہے۔یعقوب یاور نے اس کے لیے انتھک محنت کی ہے۔یعقوب یاور کا پہلا ترجمہ سن 1982 میں سدھارتھ نام سے منظر عام پر آیا ہے۔ ان کے ترجمہ کردہ ناولوں سے اردو میں مغربی ادب سے ذوق وشوق رکھنے والے قائدین مستفید ہورہے ہیں۔ان کے تراجم سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مشرقی ادب کے ساتھ ساتھ مغربی ادب کا مطالعہ بہت ہی گہرائی اور گیرائی سے کیا ہے۔

یعقوب یاور نے جس قسم کے ترجمے کیے ہیں اس میں علمی ترجمہ، ادبی ترجمہ، صحافتی ترجمہ شامل ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر ناولوں کے ترجمے کیے ہیں ان کے ترجمے کی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف کے لہجے اور طرز ادا و ذہنی تسلسل کو مرکزیت حاصل ہے جس سے منشائے مصنف کو برقرار رکھتے ہوئے اصل کتاب کی اہمیت اور ترجمے کا مقصد پورا کرنے میں کامیاب ہیں ان کے کچھ ترجمے ایسے ہیں جو دو دو نام سے شائع ہوئے ہیں جیسے گارڈ فادر، اقلیم اسود کے نام سے، کمند ہوا مغموم صنوبر کے نام سے، طاق نسیاں خوابیدہ فتنہ کے نام سے درہ خیبر کے اس پار، وادی پنج شیر کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ یعقوب یاور کے تراجم میں تخلیقی عناصر موجود ہیں اور یہی ترجمہ کی سب سے بڑی خوبی ہوتی ہے۔ ان کے تراجم کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ترجمہ کرنے میں کمال حاصل ہے۔ انگریزی زبان کو سمجھنے اور پھر اسے اردو میں منتقل کرنے کی یہ اچھی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔

یعقوب یاور اور آغا جمیل کاشمیری نے آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں کا کلیات سات جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ یہ کلیات قومی کونسل برائے فروغ اردو کی جانب سے 2004 میں شائع ہوکر منظر عام پر آیا۔ دیباچے میں آغا حشر کاشمیری کا تعارف، ان کی تصانیف اور ادبی خدمات کو مرتبین نے قلم بند کیا ہے۔

اطیع اللہ

پی ایچ۔ڈی ریسرچ اسکالر

یونیورسٹی آف حیدرآباد

کتابیات

بنیادی ماخذ

نمبر	مصنف	کتاب کا نام	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
1	یعقوب یاور، پروفیسر	امروز	نشاط آفسیٹ پریس، ٹانڈا، فیض آباد	1990
2	یعقوب یاور، پروفیسر	ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	1997
3	یعقوب یاور، پروفیسر	تحریک و تعبیر	بھارت آفسیٹ گلی قاسم جان، دہلی	1999
4	یعقوب یاور، پروفیسر	تفکیر و تفہیم	بھارت آفسیٹ گلی قاسم جان، دہلی	2003
5	یعقوب یاور، پروفیسر	مرغزار افکار (جلد اوّل)	عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی	2011
6	یعقوب یاور، پروفیسر	افہام	عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی	2015
7	یعقوب یاور، پروفیسر	آغا حشر کاشمیری	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	2016
8	یعقوب یاور، پروفیسر	احتساب	سٹی بک پوائنٹ، کراچی، پاکستان	2018
9	یعقوب یاور، پروفیسر	مرغزار افکار (جلد دوم)	عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی	2020
10	یعقوب یاور، پروفیسر (مرتب)	کلیات آغا حشر کاشمیری (جلد اوّل)	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	2004
11	یعقوب یاور، پروفیسر (مرتب)	کلیات آغا حشر کاشمیری (جلد دوم)	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	2004
12	یعقوب یاور، پروفیسر (مرتب)	کلیات آغا حشر کاشمیری (جلد سوم)	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	2004

13	یعقوب یاور، پروفیسر (مرتب)	کلیات آغا حشر کاشمیری (جلد چہارم)	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	2005
14	یعقوب یاور، پروفیسر (مرتب)	کلیات آغا حشر کاشمیری (جلد پنجم)	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	2005
15	یعقوب یاور، پروفیسر (مرتب)	کلیات آغا حشر کاشمیری (جلد ششم)	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	2005
16	یعقوب یاور، پروفیسر (مرتب)	کلیات آغا حشر کاشمیری (جلد ہفتم)	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	2005
17	یعقوب یاور، پروفیسر (مرتب)	کلیات آغا حشر کاشمیری (جلد ہشتم)	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	2016
18	یعقوب یاور، پروفیسر (مرتب)	مکتوبات مسرور مسلم	عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی	2020
19	یعقوب یاور، پروفیسر	الف	نشاط آفسیٹ پریس، ٹانڈا، فیض آباد	1988
20	یعقوب یاور، پروفیسر	قلم گوید	بھارت آفسیٹ پریس، دہلی	2000
21	یعقوب یاور، پروفیسر	بارزیاں	عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی	2020
22	یعقوب یاور، پروفیسر	دل من	بھارت آفسیٹ گلی قاسم جان، دہلی	1998
23	یعقوب یاور، پروفیسر	عزازیل	بھارت آفسیٹ گلی قاسم جان، دہلی	2001
24	یعقوب یاور، پروفیسر	جہاد	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	2009
25	یعقوب یاور، پروفیسر (مترجم)	سدھارتھ	نسیم بک پوائنٹ، لکھنؤ	1982
26	یعقوب یاور، پروفیسر (مترجم)	رقص اجل	نسیم بک پوائنٹ، لکھنؤ	1985

27	یعقوب یاور، پروفیسر (مترجم)	سینٹ پیٹرس برگ	سٹی بک پوائنٹ، کراچی، پاکستان	2018
28	یعقوب یاور، پروفیسر (مترجم)	کمندِ ہوا	نسیم بک پوائنٹ، لکھنؤ	1985
29	یعقوب یاور، پروفیسر (مترجم)	طاق نسیاں	نسیم بک پوائنٹ، لکھنؤ	1986
30	یعقوب یاور، پروفیسر (مترجم)	شب گزیدہ	نسیم بک پوائنٹ، لکھنؤ	1987
31	یعقوب یاور، پروفیسر (مترجم)	کرمس	سٹی بک پوائنٹ، کراچی، پاکستان	2018
32	یعقوب یاور، پروفیسر (مترجم)	درہ خیبر کے اس پار	نسیم بک پوائنٹ، لکھنؤ	1988
33	یعقوب یاور، پروفیسر (مترجم)	وادی پنج شیر	سٹی بک پوائنٹ، کراچی، پاکستان	2018
34	یعقوب یاور، پروفیسر (مترجم)	زہراب نیل	نسیم بک پوائنٹ، لکھنؤ	1989
35	یعقوب یاور، پروفیسر (مترجم)	گاڈ فادر	سٹی بک پوائنٹ، کراچی، پاکستان	2018
36	یعقوب یاور، پروفیسر (مترجم)	ڈاکٹر ژواگو	سٹی بک پوائنٹ، کراچی، پاکستان	2000
37	یعقوب یاور، پروفیسر (مترجم)	تِتلی گھر	نسیم بک پوائنٹ، لکھنؤ	2000

38	یعقوب یاور، پروفیسر (مترجم)	پا پیلاں	نسیم بک پوائنٹ، لکھنؤ	2007
39	یعقوب یاور، پروفیسر (مترجم)	میلوہائی باد تجارت	نسیم بک پوائنٹ، لکھنؤ	2016
40	یعقوب یاور، پروفیسر (مترجم)	اورینٹ ایکس پریس	سٹی بک پوائنٹ، کراچی، پاکستان	2019
41	یعقوب یاور، پروفیسر (مترجم)	سردار ولبھ بھائی پٹیل	پبلیکیشن ڈیویژن، نئی دہلی	1998
42	یعقوب یاور، پروفیسر (مترجم)	سیکھنے کا فن	کرشن مورتی فاؤنڈیشن، وارانسی	1999
43	یعقوب یاور، پروفیسر (مترجم)	کتاب حیات	کرشن مورتی فاؤنڈیشن، وارانسی	1999
44	یعقوب یاور، پروفیسر (مترجم)	تاریخ ساز ایجادات	پبلیکیشن ڈیویژن، نئی دہلی	2002
45	یعقوب یاور، پروفیسر (مترجم)	مکالمات جے کرشن مورتی	سٹی بک پوائنٹ، کراچی، پاکستان	2020
46	یعقوب یاور، پروفیسر (مترجم)	تہذیب کا سوال	کرشن مورتی فاؤنڈیشن، وارانسی	2021

ثانوی ماخذ

نمبر	مصنف	کتاب کا نام	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
1	آصف اقبال، ڈاکٹر	جدید افسانے، تجربے اور امکانات	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	2007

2	آل احمد سرور	اردو فکشن	یونیورسٹی پبلی کیشنز ڈیویژن، علی گڑھ	1973
3	آل احمد سرور	نظر اور نظریے	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی	1973
4	ابن کنول، ڈاکٹر	تنقید و تحسین	کتابی دنیا، نئی دہلی	2006
5	ابن کنول	داستان سے ناول تک	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	1998
6	ابوالکلام قاسمی	ناول کا فن	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	2010
7	ابوالکلام قاسمی	آزادی کے بعد اردو فکشن، مسائل ومباحث	اردو ساہتیہ اکادمی، دہلی	1983
8	ابوالکلام قاسمی	شاعری کی تنقید	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ	2008
9	ابواللیث صدیقی	آج کا اردو ادب	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	1975
10	ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر	اردو فکشن کی تنقید	تخلیق کار پبلیکیشنز، نئی دہلی	1994
11	ارشاد علی خان، پروفیسر	جدید اصول تنقید	کتابی دنیا، نئی دہلی	2001
12	ارمان حسین، ڈاکٹر	عبدالصمد فرد بنام ناول	شوبی آفسیٹ پریس، دہلی	2003
13	اسلم آزاد، ڈاکٹر	اردو ناول آزادی کے بعد	سیمانت پرکاش، نئی دہلی	1990
14	اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر	جدیدت اور اردو افسانہ	موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی	2001
15	اعجاز علی ارشد، ڈاکٹر	ہم عصر اردو فکشن زاویے	کتابی دنیا ترکمان گیٹ، دہلی	1998
16	انور پاشا	ترقی پسند اردو ناول	شارب پرنٹرز، راجندر پبلیشر، دہلی	1990
17	تنویر احمد علوی، ڈاکٹر	اصول تحقیق و ترتیب متن	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	2009
18	جمیل جالبی	تاریخ ادب اردو	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	1993
19	حامدی کاشمیری، پروفیسر	اردو نظم کی دریافت	جے کے آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی	2004

20	حنیف کیفی	اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	2003
21	خالد اشرف	برصغیر میں اردو افسانہ	ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی	2011
22	خالد اشرف، ڈاکٹر	برصغیر میں اردو ناول	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1994
23	رحمت یوسف زئی	اردو شاعری میں صنائع و بدائع	اردو صفحہ ساز کمپیوٹر کارپوریشن ،حیدرآباد	2003
24	رئیس انور	بہار میں اردو ناول نگاری	عفیف آفسیٹ پرنٹرز، دہلی	2011
25	سید حیدر علی، ڈاکٹر	اردو ناول، سمت و رفتار	شبستان شاہ گنج، الہ آباد	2008
26	شمس الرحمٰن فاروقی	اثبات و نفی	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی	1986
27	شمس الرحمٰن فاروقی	اردو غزل کے اہم موڑ	غالب اکیڈمی، نئی دہلی	2006
28	شمس الرحمٰن فاروقی	تحفۃ السرور	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی	1985
29	شمس الرحمٰن فاروقی	شعر شور انگیز	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	1992
30	شمیم حنفی، مظہر مہدی (مرتبین)	آزادی کے بعد اردو نظم	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	2005
31	شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر	اردو ناول کے اسالیب	تخلیق کار، پبلیکیشنز، نئی دہلی	2005
32	شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر	جہان فکشن	تخلیق کار، پبلیکیشنز، نئی دہلی	2008
33	صبا عارف، ڈاکٹر	اردو میں ناولٹ نگاری	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2002
34	صغیر افراہیم، ڈاکٹر	اردو افسانے کا تنقیدی جائزہ 1980 کے بعد	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2009
35	صغیر افراہیم، ڈاکٹر	افسانوی ادب کی نئی قرات	مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ	2011
36	عبد الصمد، ڈاکٹر	بکھرے اوراق	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2015
37	عبد الصمد، ڈاکٹر	دو گز زمین	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1993

38	عتیق اللہ	تنقید کی جمالیات	کتابی دنیا، دہلی	2014
39	عنوان چشتی، پروفیسر	عروضی اور فنی مسائل	اردو سماج جامعہ نگر، نئی دہلی	1985
40	فرمان فتحپوری	اردو شاعری کا فنی ارتقاء	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	2017
41	فرمان فتحپوری	اردو فکشن کی مختصر تاریخ	ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی	2014
42	قمر رئیس، پروفیسر	ترجمہ کا فن اور روایت	تاج پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	1976
43	قمر رئیس، پروفیسر	معاصر اردو غزل مسائل ومیلانات	اردو اکیڈمی، دہلی	2006
44	کنول کرشن بالی	آزاد نظم اردو شاعری میں	کتاب پبلشرز، لکھنو	1995
45	گوپی چند نارنگ	اردو افسانہ روایت اور مسائل	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2004
46	گوپی چند نارنگ	اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	2009
47	گوپی چند نارنگ	ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	1993
48	گوپی چند نارنگ	ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	2003
49	گیان چند جین	تحقیق کا فن	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2005
50	مجید بیدار، ڈاکٹر	ناول اور متعلقات ناول	نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدرآباد	1989
51	محمد حامد علی خاں	اردو کے اٹھارہ ناول	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	2008
52	محمد عقیل، سید	جدید ناول کا فن	نیا سفر پبلشنگ، الہ آباد	1997
53	محمد ہادی	زبان اور شاعری	مجلس ترقی ادب، لاہور، پاکستان	1984
54	مرزا حامد بیگ	اردو افسانے کی روایت	ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی	2014
55	مشتاق قادری	اردو میں ترجمہ نگاری	روشان پرنٹرز، نئی دہلی	2015
56	ممتاز الحق، ڈاکٹر	جدید غزل کا فنی وسماجی مطالعہ	عفیف آفسیٹ پرنٹرز، دہلی	2004

57	نگینہ جبیں	اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ 1947 اور اس کے بعد	کیشو پرکاش، آلہ آباد	2002
58	نورالحسن نقوی	تاریخ ادب اردو	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	2009
59	نورالحسن ہاشمی	احسن ناول کیا ہے؟	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	1976
60	وزیر آغا	اردو شاعری کا مزاج	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ	1974
61	وزیر آغا	نظم جدید کی کروٹیں	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ	2000
62	وسیم بیگم	آزادی کے بعد اردو غزل مضمرات وممکنات	ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی	2009
63	وقار عظیم	داستان سے افسانے تک	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	1987
64	وہاب اشرفی	مابعد جدید مضمرات وممکنات	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2007
65	وہاب اشرفی	مغربی ومشرقی شعریات	عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی	2012
66	ہمایوں اشرف، ڈاکٹر	عبدالصمد عکس در عکس	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	2008
67	یاسین محمد، ڈاکٹر	ناول کا فن اور نظریہ	خدا بخش لائبریری، پٹنہ	2002
68	یوسف حسین خان	اردو غزل	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ	2010
69	یوسف سرمست، ڈاکٹر	بیسویں صدی میں اردو ناول	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی	1995

رسائل وجرائد

1	آج کل (ماہنامہ)	نئی دہلی	2020
2	اردو دنیا (ماہنامہ)	نئی دہلی	جولائی2009
3	انتساب عالمی (سہ ماہی)	بھوپال	اکتوبر/دسمبر2014
4	ذہن جدید (ششماہی)	دہلی	مارچ/اگست2000
5	شاعر نامہ (ماہنامہ)	ممبئی	دسمبر1998

6	نیا دور (ماہنامہ)	لکھنؤ	مارچ2010
7	سب رس (ماہنامہ)	حیدرآباد	اکتوبر2009
8	ایوان اردو (ماہنامہ)	نئی دہلی	اپریل2010
9	فکر و تحقیق	نئی دہلی	مئی2014
10	فکر نظر	علی گڑھ	جون2016
11	اسباق	پورنیہ	جولائی2013
12	ارتقاء	بنارس	جولائی تا ستمبر2021
13	ایوانِ اردو	دہلی	مارچ2019
14	سبقِ اردو	بھدوہی	نومبر2020
15	تحریکِ ادب	بنارس	2015
16	شعر و حکمت	حیدرآباد	اپریل2013
17	قومی زبان	حیدرآباد	مارچ2019
18	فکر و تحقیق	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	2020
19	عکسِ ادب	اورنگ آباد	جنوری تا مارچ2020
20	ثالث	مونگیر	اپریل تا جون2021
21	بھاشا سنگم	پٹنہ	اپریل تا جون2017
22	خواتین دنیا	دہلی	جون2021

☆☆☆☆☆